کلیاتِ بلونت سنگھ

جلد سوم

تحقیق، تدوین، ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات بلونت سنگھ

(افسانے، ڈرامے، مضامین، انٹرویو، بچوں کی کہانیاں)

(جلد ہشتم)

ترتیب وتدوین

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/105 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1675

K.ulliyat-e-Balwant Singh Vol- VIII
Compiled by: Jameel Akhtar

ISBN :978-81-7587-869-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ، فلسفہ، سیاسیات، اقتصادیات، سماجیات اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی

اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی، بولی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

کلیات بلونت سنگھ کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ بلونت سنگھ کی تصانیف کی اشاعت کا کام ان کی نگرانی میں عمل میں آیا تھا، اس کے بعد اشاعت ثانی نہیں ہو سکی اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مرتب نے کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جا سکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست

☆ کچھ اس کلیات کے بارے میں VII

افسانے

1- دودھ بھری گلیاں 2
2- تیسرا سگریٹ 11
3- حسن والے 24
4- تیاگ 30
5- بن باس 37
6- ایلی ایلی 45
7- امانت 54
8- لنگتی شامیں 62
9- تعویذ 70

ڈرامے

1- قلوپطرہ کی موت 82
2- مرغی 109

3- پیامبر 144

4- پامال محبت 155

5- پھانس 164

6- سکہ زن 173

مضامین

1- چار سو برس پہلے 193

2- فلمی انٹرویو 201

3- حضرت چھچھوندر چھچھوروی 210

4- ایڈیٹر لوگ 218

انٹرویو

1- کرشن چندر 228

2- فراق گورکھپوری 244

3- ساحر لدھیانوی 260

بچوں کی کہانیاں

1- ایک رات 266

2- بات ایک رات کی 270

3- ٹارزن 273

4- شکار کا شکار 279

5- تین چور 284

کتابیات 287

اردو افسانے کی الف بائی ترتیب 290

ہندی افسانے کی الف بائی ترتیب 298

کچھ اس کلیات کے بارے میں

بلونت سنگھ اپنے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ جون 1921 میں چک بہلول ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔ بلونت سنگھ نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' ''ساقی'' اگست 1938 میں شائع ہوا۔ 1938 سے 1944 تک آٹھ افسانے ساقی میں شائع ہوئے۔ اگست 1938 کے بعد دوسرا افسانہ 'دیش بھکت' ساقی نومبر 1940، 'جگا' ساقی جنوری 1941، 'نیتا' ساقی جولائی 1941، پردیس، ماتاہری، حوا کی پوتی کا افسانہ محبت 1943 تک شائع ہوئے۔ پہلی بار جولائی 1944 میں ان کا ایک افسانہ ''شہباز'' ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ یہیں سے انھوں نے افسانوی دنیا میں اڑان بھرنا شروع کی۔ اس کی اپنی وجہ بھی ہے۔ 1942 میں بی۔اے کی ڈگری الہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کرنے کے بعد بلونت سنگھ کچھ دنوں کے لیے لاہور منتقل ہوگئے، جہاں انھیں مولانا صلاح الدین احمد (اڈیٹر ادبی دنیا) راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی صحبتیں ملیں۔ ان کی ملاقاتوں نے بلونت سنگھ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ بلونت سنگھ جو ابھی تک آہستہ خرام تھے برق رفتاری سے دوڑنے لگے۔ اب تقریباً ہر دوسرے تیسرے ماہ ان کا ایک افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہونے لگا اور پھر بلونت سنگھ تواتر سے لکھنے لگے اور ان کی

تحریریں مختلف ادبی رسائل میں چھپنے لگیں۔ ''ساقی'' میں ان کے کل دس افسانے اور دو ڈرامے، ''قلوپطرہ کی موت'' اور ''مرغی'' شائع ہوئے۔'ادبی دنیا' میں سات افسانے اور ایک ڈراما ''سکہ زن'' شائع ہوئے۔ ''ساقی'' اور ''ادبی دنیا'' کے بعد ان کی کہانیاں ہمایوں لاہور، آج کل دلی، نقوش لاہور اور فسانہ میں شائع ہوئیں— کچھ کہانیاں مسیحی دنیا، سہیل، نئی دنیا، تیج ویکلی میں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن ان کا ابھی تک کوئی صحیح سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ایک کہانی ''ونڈ'' تیج ویکلی میں شائع ہوئی ہے جو ہندی میں ہے۔ ہندی میں ان کی کہانیاں آج کل دلی، جاگرتی، ہنس، مایا، منوہر کہانیاں اور اردو ساہتیہ الٰہ آباد میں شائع ہوئیں۔

لیکن رسائل کی مکمل فائل کسی ایک لائبریری میں نہیں ملنے کی وجہ سے تمام کہانیوں کی دریافت یا تلاش ممکن نہیں ہوسکی۔ دوسرے، وسائل کی کمی بھی کہانیوں کی تلاش میں مانع رہی۔ سرکاری اداروں میں اشتہار پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے وسائل محدود کر دیے جاتے ہیں جس سے معیاری تحقیق کا عمل پورا نہیں ہو پاتا اور آدھا ادھورا جو بھی محدود وسائل میں دستیاب ہو پاتا ہے اسے غنیمت جان کر اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس پروجیکٹ میں بھی دشواریاں رہیں۔ شروع میں جب میں نے اس پر کام کرنے کا ارادہ کیا تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنی ہوگی لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ بلونت سنگھ کی تخلیقات کی تلاش کا سفر کانٹوں بھرا رہا۔ دہلی کے تمام اہم کتب خانے بلونت سنگھ کی کتابوں سے محروم ہیں۔ دلی یونی ورسٹی، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی پبلک لائبریری، ساہتیہ اکیڈمی، دلی اردو اکادمی اور لوگوں کے ذاتی کتب خانے، کہیں بھی بلونت سنگھ کی تمام کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ایک دو کتابیں ہی ہیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری جو تحقیق کا بڑا گڑھ سمجھی جاتی ہیں وہاں سے بھی چند کتابیں ہی دستیاب ہوسکیں۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی کی لائبریری بھی اپنے محبوب فکشن نگار کے سرمایے سے محروم ہے۔ وہاں سے تلاش کے بعد بھی کچھ دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعوں میں سے تین خدا بخش لائبریری پٹنہ سے، ایک آزاد لائبریری علی گڑھ سے، ایک ساہتیہ اکیڈمی دلی سے اور ایک بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ

(الٰہ آباد) سے دستیاب ہوا۔ اس طرح بہ ہزار دقت یہ منزل طے ہوئی۔ میں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی دشواریاں اس راہ میں پیش آئیں گی اور اس پر بھی جب تحقیق کے لیے ہندوستان کی اہم لائبریریوں کا دورہ کرنے کے لیے کوئی وسیلہ بھی نہ ہو۔ گھر بیٹھے تحقیق کے جاں کاہ مراحل کو انجام دینا ناممکن ہے۔ اس میں تکمل جہاں کبھی نہیں ملتا۔

اس پر بھی بات صرف افسانوی مجموعوں کی تلاش تک ہی محدود ہو تو کسی حد تک بات بن بھی جاتی۔ لیکن معاملہ اگر اس سے بھی آگے کا ہو تو مشکل کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ذاتی وسائل کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ میں نے کلیات کی تدوین میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ افسانوی مجموعوں کو ہی کسی بھی فکشن نگار کی کل پونجی تصور نہیں کیا جائے بلکہ رسائل کی دنیائے بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر گوہر آب دار تلاش کیا جائے اور فکشن نگار کی موجودہ پونجی میں اضافہ کر کے کلیات کے معنی و مفہوم کو مکمل کیا جائے۔ اس عمل میں نہ صرف دشواریاں ہزار ہیں بلکہ ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا''

تحقیق و تلاش کا کیڑا جب تک انگ انگ کو نہ ڈسے اور جذبۂ صادق خون کی رگوں میں موجزن نہ ہو اس دشوار گذار عمل کا تصور محال ہے اور میں جب اس طرح کے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر اس سے پورے طور پر عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک حقیر انسان کی بساط میں یہ کہاں۔ یہ تو محض سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ میں نے محدود وسائل کے باوجود اپنی بساط بھر پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ اور الٰہ آباد کا سفر بھی اس پروجیکٹ کے سلسلے میں ذاتی مصارف سے کیا۔ تقریباً ایک ہفتے الٰہ آباد میں رہا، بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ سے ملا۔ منجو سنگھ الٰہ آباد کے ایک کالج میں ہندی کی لکچرر ہیں۔ بے حد ملنسار، خلیق، متین اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ اگر چہ وہ اردو نہیں جانتیں پھر بھی انھوں نے جہاں تک ممکن ہو سکا ہے بلونت سنگھ کی تمام چیزیں بہت سنبھال کر رکھی ہیں۔ ادبی مزاج نہیں ہونے کی وجہ سے وہ بلونت سنگھ کی جمع پونجی کو اردو اور ہندی والوں سے نہ کیش کرا سکیں اور نہ ہی اپنے شوہر کی ادبی تشہیر کا کوئی سامان کر سکیں۔ بلونت سنگھ کے بیٹے اور بیٹی میں بھی باپ کی

وراثت کو سنبھالنے کا ہنر نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سبھی بے حد خلیق ہیں، شگفتہ مزاج ہیں مہمان نواز ہیں۔ منجو سنگھ بے حد معاون ثابت ہوئیں انھوں نے جو کچھ بھی ان کے پاس تھا سبھی میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس میں سے جو چیز میرے کام کی تھی میں نے الگ کر لی اس طرح ان سے بہت سی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ رسائل میں چھپے ہوئے چند افسانوں کی کٹنگ۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کتابوں کی مکمل فہرست ان سے حاصل ہوئی۔ الٰہ آباد کے کچھ احباب نے بھی بھرپور تعاون کیا اور نئی معلومات فراہم ہوئیں۔ اس طرح الٰہ آباد کا سفر بہت کامیاب رہا اور پروجیکٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں کئی ماہ تک رسائل کے ذخیرے سے تلاش و جستجو کا عمل جاری رہا جس کے نتیجے میں بہت سی نئی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سی چیزیں وسائل کی کمی کی وجہ سے معلومات ہونے کے باوجود مجھ سے دور رہیں یا دستیاب ہونے سے رہ گئیں۔ جو چیزیں معلومات ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکیں ہیں اس کی فہرست آگے آئے گی۔ اور نئے دستیاب شدہ افسانوں، ڈراموں اور مضامین کی فہرست بھی دی جائے گی تاکہ تحقیق کامیابی کی داستان بھی بیان ہو سکے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اتنی دشواریوں اور مشکلات کے بعد رسائل کے کرم خوردہ، دیمک زدہ اور گرد آلود فائلوں سے کوئی کہانی نکلتی ہے۔ آج کے سائنٹفک دور میں مواصلاتی انقلاب کے باوجود اردو میں تحقیق کے ٹولس وضع نہیں کیے جا سکے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحقیق کی راہ میں صدہا دشواریاں جو پہلے تھیں وہ آج بھی موجود ہیں۔ اس لیے اردو کا محقق، تحقیق کے تمام تقاضوں سے کما حقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اردو میں معیاری تحقیق کا فقدان ہوتا جارہا ہے اسے محقق کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ ادھر تحقیق کے سلسلے میں مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بعض اوقات بڑی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے جو سہولت فراہم ہونی چاہیے وہ نہیں مل پاتی اور تحقیق کا سفر نامکمل رہ جاتا ہے۔ مکمل جہاں تو مجھے بھی نہیں مل پایا اس کی وجہ وسائل کی کمی تھی جس کا ذکر

پہلے کر چکا ہوں۔ چلئے یہ عمل آدھا ادھورا ہی سہی پورا تو ہوا اور بلونت سنگھ کی تخلیقات کے ذخیرے میں اس تحقیقی کاوش کے نتیجے میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا بلکہ انکساری سے کہا جائے تو ایک حقیر سا اضافہ ہوا۔

بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجہوں سے پیدا ہوا جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظر انداز کیا جانا تھا۔ اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف اور بقول اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد نہ ہی اخبارات میں ان کی موت کی خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی اور جب ارتھی اٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ کیسی وردنا کی تھی۔ نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔ سوائے چند ایک کے۔ مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔ شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔ یہ ناانصافی اور وردنا کی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔ میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تاکہ اس ناانصافی کی تلافی ہو سکے۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔ ہزار ہا دشواریوں کے باوجود میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہو سکا ہوں۔ نئی نسل اب اس کلیات کا مطالعہ کرے گی اور تنقید کی نئی عینک لگا کر پڑھے گی تاکہ بلونت سنگھ کو انصاف مل سکے اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین قدر میں آسانی ہو۔ اس سے شاید بلونت سنگھ کی روح اطمینان کی سانس لے سکے گی۔

دوسرے میرے ذریعے کی گئی تحقیق کے نتیجے میں بلونت سنگھ کے موجود سرمایے میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا ہے اس سے بھی تنقید کے نئے باب وا ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے جو تنقید اب تک ہو چکی ہے شاید اس سوچ میں بھی کوئی تبدیلی واقع ہو۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید ہوئی تھی وہ آدھے افسانوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اب پونجی دوگنی ہو گئی ہے۔

اردو میں بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعے صرف چھ ہیں:

1- جگا — مکتبہ اردو لاہور، پہلی اشاعت اپریل 1944

2- تار و پود — مکتبہ جدید لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ کتاب 1945 کے اواخر یا 1946 کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانے جولائی 1945 تک کے ہیں۔

3- ہندوستان ہمارا — سنگم پبلیشنگ ہاؤس، الہ آباد سے جون 1947 میں پہلی بار شائع ہوئی۔

4- سنہرا دیس — اس میں بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945 اور 1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ یہ کتاب 1950 کے دہے میں شائع ہوئی ہوگی۔

5- پہلا پتھر — مکتبہ جدید لاہور، دسمبر 1953

6- بلونت سنگھ کے افسانے — مکتبہ اردو لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں چند افسانے نئے اور بقیہ پرانے ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ تین اور مجموعوں کا نام ملتا ہے۔ ''شیرازہ''، ''اجلے پھول'' اور ''پنجاب کی کہانیاں''، لیکن ان مجموعوں کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔

اب ذرا ان چھ مجموعوں میں شامل کہانیوں پر بھی تفصیلی نظر ڈال لیں:

1- جگا

(1) جگا (2) پردیسن (3) نینا (4) سزا (5) ماتا ہری (6) دیش بھکت
(7) حوا کی پوتی کا افسانہ محبت (8) قلوپطرہ کی موت (ڈراما)
(9) مرغی (ڈراما) (10) پیامبر (ڈراما)

2- تار و پود

(1) سمجھوتہ (2) گرہستی (3) دیمک (4) کسبی (5) مہمان (6) شہباز

(7) خوددار (8) کمپوزیشن ٹیچر (9) جنگل میں منگل (10) اس کی بیوی

(11) بیمار (12) خلا (13) پنجاب کا البیلا (14) تین باتیں۔

3- ہندوستان ہمارا

(1) ہندوستان ہمارا (2) پتھر کے دیوتا (3) بھیک منگے (4) کسک

(5) ڈاکو (6) موت (7) اجنبی (8) جھرجھری (9) آزاد فاقہ

(10) سکوت (11) روشنی (12) بھیک۔

4- سنہرا دیش

(1) چکوری (2) منی کی موت (3) بابو مانک لال جی (4) رنگ (5) سہارا

(6) سورما سنگھ (7) عذاب (8) سنہرا دیش (9) تلچھٹ (10) مداوا

(11) ہمارا مکان (12) لمس (13) کٹھن ڈگریا (14) رقیب

(15) پیپر ویٹ۔

5- پہلا پتھر

(1) بازگشت (2) نہال چند (3) کلی کی فریاد (4) تین چور (5) بابو مہنگا سنگھ

(6) آشیانہ (7) کالے کوس (8) لمحے (9) دبلے 38 (10) تعمیر

(11) ایک معمولی لڑکی (ناولٹ) (12) اعتراف (13) پہلا پتھر۔

6- بلونت سنگھ کے افسانے

(1) جگا (2) کٹھن ڈگریا (3) کرنیل سنگھ (4) خوشبودار موڑ (5) گھر کا راستہ

(6) پنجاب کا البیلا (7) شکریہ (8) گن ہل پر رم جھم۔

اس مجموعہ میں جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا کو چھوڑ کر باقی سب افسانے

نئے ہیں۔

اب ذرا ان کے ہندی افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ہندی میں ان کے افسانوی مجموعے دس ہیں:

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے) اونکار شردھر پرکاشن، الہ آباد، 1954

(1) دنڈ (2) جگا (3) چور (4) گرنتھی (5) البیلے (6) کچھ چھن (7) تین باتیں

(8) کالی تیتری (9) پہلا پتھر (10) دیلے 38

2- چلمن، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1970

(1) پرتی دھونی (2) شونیہ (3) مہمان (4) منی کی موت (5) سوابھیمان

(6) بابو مانک لال جی (7) اس کی پتنی (8) دیلے 38 (9) کسک

(10) بہو (11) چلمن

3- پہلا پتھر۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد، 1971

(1) پہلا پتھر (2) چکوری (3) میں ضرور روؤں گی (4) پیپرویٹ (5) کچھ چھن

(6) تین باتیں (7) ویشیا (8) تعویز (9) نہال چند (10) اپرچت

(11) بابا مہنگا سنگھ (12) سورما سنگھ۔

4- میری پریہ کہانیاں، راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی۔ 1971

(1) اندھیرا اجالا (2) تین باتیں (3) رنگ (4) سوابھیمان (5) دیمک
(6) کلی کی فریاد (7) تین دیویاں (8) بنواس (9) زندگی کا خوبصورت موڑ
(10) تیسرا سگریٹ (11) کالی تیتری

5- دیوتا کا جنم۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد 1977

(1) دیوتا کا جنم (2) گمراہ (3) گلیاں (4) باندھ (5) گھات (6) دوسرا ہنی مون

(7) زلف کی داستان (8) پھلکاری (9) پورا جوان (10) رکھوالا

(11) چاند اور کمند (12) پیلا پھاٹک (13) ترکون (14) جنازہ (15) شرط۔

6- پرتی ندھی کہانیاں۔ راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1977

(1) گرنتھی (2) پہلا پتھر (3) کچھ چھن (4) تین باتیں (5) سورما سنگھ
(6) شہناز (7) دیمک (8) کالی تیتری (9) شرط (10) سزا (11) جگا۔

7- بن باس تتھا انیہ کہانیاں۔ پرتیبھا پرکاشن، الہ آباد، 1978
(1) بن باس (2) ڈاکو باگڑ سنگھ (3) دو بہنیں (4) قبرستان کی حسینہ
(5) گوری چلی سسرال (6) پٹھان (7) رشتہ (8) ٹکسال والا (9) جھرنا
(10) بدائی (11) راہی (12) کیا کریں دونوں (13) لاٹری زندہ باد
(14) تتلیاں

8- ایلی ایلی۔ راج کمل پرکاشن، دہلی 1982
(1) ایک بات (2) گھر کا راستہ (3) تین پتر (4) چیتنا (5) ست رنگا کبوتر
(6) کنیادان (7) گن ہل پر رم جھم (8) حسن والے (9) شکریہ (10) تنتر
(11) پیلاں (12) گرنتھی (13) چندر لوک (14) ترپتی (15) گرینڈ ہوٹل

9- میری تینتس کہانیاں: آتما رام اینڈ سنز، دہلی 6، 1988
(1) شکریہ (2) جگا (3) ایک ہی ناؤ پر (4) دنڈ (5) دوسری بھول (6) مہمان
(7) رقیب (8) اس کی پتنی (9) شام کے دھندلکے میں (10) ہیپرویٹ
(11) شہناز (12) سنہرا دیس (13) نہال چند (14) شرط (15) چندر لوک
(16) چالیس سال بعد (17) اڑان (18) چیتا (19) گن ہل پر رم جھم
(20) پیلاں (21) تیغ (22) ارداس (23) دیدار (24) کول سنگھ کی پریمیکا
(25) دل ناداں (26) بھیگی آنکھیں (27) پر بیچے (28) مکھن سنگھ کا اپہرن
(29) تین دیویاں (30) بھسن کور (31) پھلکاری (32) آگے کے دو دانت
(33) اندھیرا اجالا۔

10- میں ضرور روؤں گی۔ راجیو پرکاشن، الہ آباد، سال اشاعت درج نہیں ہے۔
(1) شام کے دھندلکے میں (2) دوسری بھول (3) شہناز (4) چکوری
(5) ہیپرویٹ (6) ویشیا (7) رقیب (8) میں ضرور روؤں گی (9) کسک

(10) پرتی دھونی (11) ایک ہی ناؤ پر (12) بابا مہنگا سنگھ (13) کشن ڈگریا

ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ 1954 میں شائع ہوا وہ بھی صرف پنجاب کی کہانیوں کا انتخاب۔ دوسرا افسانوی مجموعہ سولہ برس بعد 1970 میں شائع ہوا۔ اتنے لمبے گیپ کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ اردو میں آخری افسانوی مجموعہ پہلا پتھر 1953 میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندی مجموعہ آیا ہے۔ بلونت سنگھ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں تواتر سے لکھ رہے تھے۔ ہندی میں ان کے ناول 1961 سے 1986 تک یعنی ان کے انتقال تک لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں اور اردو میں افسانے 1983 تک پابندی سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں ناول صرف تین شائع ہوئے اور ہندی میں 24۔ اس سے یہ تو اندازہ لگایا ہی جا سکتا ہے کہ انھوں نے اردو کے مقابلے ہندی میں چھپنے کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید اردو میں گھٹتے قاری اور مندا بازار ہو جبکہ ہندی میں قاری اور مالی منفعت دونوں ہی تھی۔

ہندی اور اردو کے تمام افسانوی مجموعے اور ناول ان کی حیات میں شائع ہوئے۔

ہندی افسانوی مجموعوں میں کہانیوں کی تکرار بہت ہے۔ تکرار کے ساتھ کل 132 کہانیاں ہوتی ہیں۔ تکرار منہا کر کے کل 100 کہانیاں ہوتی ہے۔ بارہ نئی کہانیاں ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(1) تا حیات (2) آنند کارج (3) ڈاکٹر پاڑ سنگھ (4) بادام رنگیں (5) تلچھٹ
(6) بھیگی پلکیں (7) چار استاد (8) جیجا جی (9) سمجھوتہ (10) زن گذراں
(11) اس رات کی بات (12) ننھا منا جھنجھلو

ان کو شامل کر کے ہندی میں کل 112 کہانیاں ہوتی ہیں۔

اردو مجموعوں میں شامل کہانیاں 65 ہیں اور نئی دریافت شدہ کہانیاں 70 ہیں۔ اس طرح کل 135 کہانیاں قرار پاتی ہیں۔ ہندی اور اردو کی کل ملا کر 112+135=247 کہانیاں ہوتی ہیں جو اب تک میری نظروں کے سامنے آ سکی ہیں۔ اردو کی 135 کہانیوں میں سے تقریباً آدھے سے زیادہ ہندی مجموعوں میں جوں کی توں شامل کر لی گئی ہیں۔ یعنی چند

کہانیوں کے صرف عنوانات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کہانیوں کے عنوان ہندی اور اردو میں ایک ہی ہیں۔

وہ کہانیاں جو دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں

	اردو کہانی	ہندی کہانی
1	آبشار	جھرنا
2	آنند کارج	آنند کارج
3	ایک ہی ناؤ میں	ایک ہی ناؤ پر
4	اس کی بیوی	اس کی پتنی
5	البیلا	البیلے
6	اجنبی	اپریچت
7	ارداس	ارداس
8	باندھ	باندھ
9	بابو مانک لعل جی	بابو مانک لعل
10	بابا مہنگا سنگھ	بابا مہنگا سنگھ
11	بھیگی آنکھیں	بھیگی آنکھیں
12	پہلا پتھر	پہلا پتھر
13	پورا جوان	پورا جوان
14	پھلکاری	پھلکاری
15	پھمن کور	پھمن کور
16	پیپر ویٹ	پیپر ویٹ
17	پیلا پھاٹک	پیلا پھاٹک

18	تلچھٹ	تلچھٹ
19	تین باتیں	تین باتیں
20	تیسرا سگریٹ	تیسرا سگریٹ
21	تین دیویاں	تین دیویاں
22	تعویذ	تعویذ
23	تین خط	تین پتر
24	تکون	تری کون
25	جگا	جگا
26	چکوری	چکوری
27	چلمن	چلمن
28	چاند اور کمند	چاند اور کمند
29	چار استاد	چار استاد
30	چیتا	چیتا
31	حسن والے	حسن والے
32	دیمک	دیمک
33	دوسری غلطی	دوسری بھول
34	دوسرا ہنی مون	دوسرا ہنی مون
35	ڈاکو باگڑ سنگھ	ڈاکو باگڑ سنگھ
36	دیدار	دیدار
37	رنگ	رنگ
38	رشتہ	رشتہ
39	رخصتی	بدائی
40	رقیب	رقیب

41	زلف کی داستان	زلف کی داستان
42	زن گذراں	زن گذراں
43	سزا	سزا
44	سمجھوتہ	سمجھوتہ
45	سنہرا دیش	سنہرا دیش
46	سورما سنگھ	سورما سنگھ
47	شہباز	شہباز
48	شکریہ	شکریہ
49	شرط	شرط
50	کلی کی فریاد	کلی کی فریاد
51	کالی تیتری	کالی تیتری
52	کومل سنگھ کی محبوبہ	کومل سنگھ کی پریکا
53	کسک	کسک
54	گلیاں	گلیاں
55	گھر کا راستہ	گھر کا راستہ
56	گن ہل پر رم جھم	گن ہل پر رم جھم
57	گرہستی	گرہستی
58	گمراہ	گمراہ
59	گوری چلی سسرال	گوری چلی سسرال
60	منّی کی موت	منّی کی موت
61	مہمان	مہمان
62	مکھن سنگھ کا اغوا	مکھن سنگھ کا اپہرن
63	نہال چند	نہال چند

64 ویلے 38 ویلے 38

اسی طرح ہندی کی تقریباً 50 کہانیاں ایسی ہیں جو اردو میں نہیں ہیں۔ اور وہ صرف ہندی میں ہی لکھی گئی ہیں۔

آگے کے دو دانت، ایک بات، اندھیرا اجالا، اڑان، اس رات کی بات، بہو، بنواس، بھیگی پلکیں، بادام رنگیں، پرتی دھونی، پیلاں، پٹھان، پرتیچے، ترپتی، تنتر، تتلیاں، تا حیات، تیج، ٹکسال والا، جنازہ، جیجا جی، چندرلوک، چالیس سال بعد، چور، دیوتا کا جنم، دو بہنیں، دل ناداں، دنڈ، ڈاکٹر پاپڑ سنگھ، رکھوالا، راہی، زندگی کا خوبصورت موڑ، سوابھیمان، ست رنگا کبوتر، شونیہ، شام کے دھندلکے میں، قبرستان کی حسینہ، کنیادان، کچھ چھن، کیا کریں دونوں، گھات، گرینڈ ہوٹل، لاٹری زندہ باد، میں ضرور روؤں گی، ننھا چھچھکو، ویشیا۔

اس طرح اردو میں بھی تقریباً75 کہانیاں ایسی ہیں جو صرف اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اور ہندی میں نہیں ہیں۔

آشیانہ، آزاد فاقہ، آبگینہ، ایڈیٹر لوگ، اعتراف، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ایک رات، امانت، ایلی ایلی، بھیک، بازگشت، بیمار، بھک منگے، بھول بھلیاں، بات ایک رات کی، بادلوں کی چھاؤں تلے، بن باس، پھانس، پنجاب کا البیلا، پتھر کے دیوتا، پردیسن، پامسٹ، پودے، پردیسی چاند، پاسبان، تین چور، تعمیر، تیاگ، ٹارزن، جزیرے، جنگل میں منگل، جھرجھری، چالان، چار سو برس پہلے، حوا کی پوتی کا افسانہ محبت، حد فاصل، خوددار، خلا، خوشبودار موڑ، خدا کی وصیت، دیش بھکت، دودھ بھری گلیاں، ڈاکو، دلِ بلبل، دانت ایک بات ایک، دستک، راستہ چلتی عورت، روشنی، سکوت، سہارا، سکہ زن، سنگ انداز، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیا، صبح شام آرزو، عذاب،

فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کسبی، کمپوزیشن ٹیچر، کالے کوس،
کٹھن ڈگریا، کاتے، لس، لمحے، للکتی شامیں، مداوا، ماتاہری، موت،
نینا، نانگ پھنی۔

لیکن یہ بھی ایک بڑا تحقیقی معاملہ ہے۔ اردو ہندی کی تمام کہانیوں کی چھان پھٹک کر کے ہی اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ سرسری جائزے یا ذاتی تاثر کی بنیاد پر کوئی ٹھوس رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس طرف اشارے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ کہانیوں کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ اور اردو، ہندی کے پچڑے میں پڑ کر بھی محقق اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ اردو میں دستیاب کہانیوں کو ہی اردو کی میراث سمجھے اور ہندی میں موجود کہانیاں ہی ہندی کی کہلائیں۔ ترجمہ کر کے دونوں کے سرمایے میں نقب زنی کرتے وقت بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں زبان کی اصل پونجی کیا ہے۔ اور درآمد شدہ پونجی کیا ہے۔ ناقد بھی فن کا تجزیہ کرتے وقت کہانی کے بریکٹ میں (اردو) اور (ہندی) ضرور لکھیں تاکہ قاری کا ذہن صاف رہے اور وہ کسی مخمصے میں گرفتار نہ ہو۔

اب رہی بات اشک صاحب کے قول کی بقول اشک صاحب بلونت سنگھ 300 سے زائد کہانیوں کے خالق ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حتمی بات نہ ہو بلکہ صرف اندازہ ہو۔ اگر اس اندازے کو تھوڑی دیر کے لیے سچ مان بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ 247 کہانیاں تحقیقی جانفشانی کی اس جاں کاہ مہم میں میرے سامنے سرنگوں ہوتو گئیں۔ اور وہ جن کا وجود عام اردو قاری کے لیے پردۂ خفا میں ہے (اگر ایسا ہے) اگر وہ دستیاب ہوئیں تو یہ تعداد مکمل بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اشک صاحب کی بات کو صرف اندازہ ہی تصور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں بچی ہوئی کہانیاں اردو میں اب کم ہی ہوں گی۔ ہندی میں زیادہ ہونے کا گمان اغلب ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرے کی چھان پھٹک ابھی ہونے کی نہیں ہے۔

اب پھر رجوع کرتے ہیں اردو مجموعوں کی طرف

''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ تمام مجموعوں کے اشاعت

دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو بددل ہو گئے یا انھوں نے اس جانب خود توجہ نہیں دی۔ اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔ اس لیے اردو مجموعوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں اردو سے تین گنی کتابیں ہیں۔

چونکہ ان کی کتابوں کے ایک سے زیادہ اڈیشن شائع نہیں ہوئے اور تمام اڈیشن بلونت سنگھ کی حیات میں ان کی نگرانی میں شائع ہوئے اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی بھی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا گیا ہے جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی اصل کی ہے۔ بنیادی متن کے طور پر حاصل افسانے کو ہی اصل مان لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔

کلیات کی تدوین میں تقویم کا خیال رکھا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب میں افسانوی مجموعوں کی مکمل ترتیب باقی نہیں رہی۔ بیچ بیچ میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی۔ پہلی جلد میں 'جگا' اور 'تار و پود' کے افسانوں کے علاوہ ساقی اور ادبی دنیا میں 1945 تک شائع افسانے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ایک افسانہ ''رنگ''، ادبی دنیا نومبر 1945 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجموعہ سنہرا دیش میں شامل ہے۔ لیکن تاریخی ترتیب میں یہ افسانہ پہلی جلد میں جگہ بنا پایا۔ اس جلد میں ایک افسانہ 'خدا کی وصیت' نیا ہے۔ یہ ادبی دنیا جون 1945 میں شائع ہوا تھا۔

سنہ اشاعت کے لحاظ سے ترتیب اس لیے کہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہی طریق کار زیادہ سائنٹفک ہے۔ کسی بھی فن کار یا تخلیق کار کے فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے میں یہ تاریخی سیڑھی بے حد معاون ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے ایک دشواری اور تھی۔ تمام افسانوں کا سنہ اشاعت یا سنہ تخلیق مجھے دستیاب نہیں ہو سکا۔ ایسی صورت میں جو تاریخی ترتیب میں نے تیار کی اس میں جن افسانوں کا سنہ اشاعت ماہ وار معلوم نہیں ہو سکا اس کے لیے میں نے یہ

طریقہ کار اپنایا ہے کہ جس مجموعہ میں یہ افسانہ شامل ہے اس کے سنہ اشاعت کو ہی اس کی درمیانی تاریخ مان لی۔ اگر چہ اس میں مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اور کوئی دوسری صورت سمجھ سے باہر تھی۔ مثلاً 'جگا' 1944 میں شائع ہوا۔ جگا میں شامل افسانے 1938 تا 1944 تک کے ہیں۔ لیکن 'تار و پود' کا سال اشاعت ہی معلوم نہیں۔ اس میں 1944 تا 1945 سنہ کے افسانے شامل ہیں۔ لہٰذا اس کی سنہ اشاعت بھی میں نے 1945 متعین کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں 1945-1946 کے بعد کے افسانے نہیں ہیں۔ سنہرا دیش میں بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945-1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں۔ 1947 میں 'ہندوستان ہمارا' شائع ہوا۔ اس میں شامل کہانیاں بھی ظاہر سی بات ہے کہ 1947 تک کی ہی ہوں گی اور یہ مجموعہ 'سنہرا دیش' یقیناً 'ہندوستان ہمارا' کے بعد آیا ہوگا۔ حالات کا تجزیہ اور موجود شواہد تو یہی کہتے ہیں۔ اس لیے 1945 کے اواخر میں 'تار و پود' کے شائع ہونے کا امکان اغلب ہے۔ ایسی صورت میں 'سنہرا دیش' 1947 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔ چاہے وہ تاریخ 1950 ہو یا 1951 ہو۔ جب تک کوئی اور تحقیقی شواہد نہیں ملتے۔ انھیں تاریخوں پر یقین کرنا ہماری تحقیقی لاچاری ہے۔ لہٰذا انھیں سنہ اشاعت کے لحاظ سے کلیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور نئے افسانے اپنی تاریخی ترتیب میں ان کے درمیان ہی جگہ پا سکے ہیں۔

نئے حاصل شدہ افسانے جون 1945 سے لے کر 1980 تک کے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'جگا' (1944) کے بعد ان کا افسانوی مجموعہ سنہرا دیش ہے جو 1950 کے لگ بھگ آیا ہے۔ اس زمانے کے بھی کئی افسانے اور ڈرامے ان مجموعوں میں شامل نہیں ہو سکے۔ بعد میں ایک انتخاب ''بلونت سنگھ کے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں تین پرانے افسانے 'جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا' کو چھوڑ کر باقی سبھی افسانے نئے ہیں اور امید قوی ہے کہ یہ مجموعہ 1980 کی دہائی میں آیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانے اگست 1969 سے مارچ 1979 تک کے ہیں۔ بلونت سنگھ کا انتقال 1986 میں ہوا۔ لہٰذا یہ مجموعہ ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ اسے بھی کسی ہندستانی پبلشر نے نہیں شائع کیا بلکہ اسے بھی مکتبہ اردو ادب لاہور جو بلونت سنگھ کی کتابوں کا پبلشر رہا ہے اس نے شائع

کیا ہے۔ بلونت سنگھ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جگا'' کو چھوڑ کر کسی بھی مجموعے میں کوئی دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ، حرف گفتار نہیں ہے جس سے کہ اس کے عالم وجود میں آنے کا پتہ چل سکے۔ مجموعوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناشر نے اپنی صواب دید سے جو کچھ اسے میسر آیا لے کر شائع کر دیا ہے۔ ممکن ہے بلونت سنگھ سے اجازت بھی لی ہو۔

بلونت سنگھ پر اب تک میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہندوستان میں تین تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک دلی یونی ورسٹی میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور تیسرا کلکتہ یونی ورسٹی میں۔ ممتاز آرا اور شاہدہ مفتی دونوں خاتون کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ ممتاز آرا کا مقالہ 'بلونت سنگھ — فن اور شخصیت' کتابی صورت میں شائع بھی ہوگیا اور شاہدہ مفتی کے مقالے کا بیشتر حصہ سہ ماہی جامعہ کے بلونت سنگھ نمبر اور کتاب نما کے گوشۂ بلونت سنگھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ ان دونوں طالبات کی بھی مناسب رہنمائی نہیں کی گئی جس سے بلونت سنگھ کے ساتھ انصاف نہیں ہوا اور نہ ہی تحقیق کے تقاضے پورے ہوئے۔ آدھی ادھوری معلومات کی بنیاد پر مقالے تیار کرائے گئے اور ڈگری تفویض کر دی گئی۔ کسی نے بھی نئے افسانوں کی تلاش کا جوکھم نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ کتابوں کی سنہ اشاعت کے متعلق بھی مستند معلومات حاصل نہیں کی۔ شاہدہ مفتی نے بھی جامعہ کے خاص نمبر اکتوبر تا دسمبر 2001 میں کتابوں کی فہرست تو دی ہے لیکن وہ بھی نامکمل ہے۔ کسی بھی کتاب کی تاریخ اشاعت اور پبلشر کا نام درج نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ واضح کیا ہے کہ کون سا افسانوی مجموعہ ہے اور کون سا ناول، ہندی فہرست میں یہ خلط ملط خاص طور پر ہے۔ یعنی یہ فہرست بھی تحقیقی تقاضوں سے عاری ہے۔ شاہدہ مفتی نے بلونت سنگھ کے گیارہ نمائندہ افسانوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس میں 'چاند اور کمند' اور 'پورا جوان' نئی کہانی ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی سنجیدہ کوشش بلونت کے بارے میں ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نارنگ چونکہ تحقیق کے مرد میداں ہیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو وقار و اعتبار حاصل ہے۔ وہ جب بھی کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو تحقیقی تقاضوں سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

'بلونت سنگھ کے بہترین افسانے' کے نام سے اکیس افسانوں کا ایک بہت ہی جامع انتخاب انھوں نے کیا جس کا پہلا اڈیشن 1995 میں ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب اردو، ہندی اور انگریزی تین زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے ستر صفحے کا بسیط عالمانہ مقدمہ لکھا اور بلونت سنگھ کو نئے سرے سے ڈسکور کیا۔ ان کی کہانیوں پر باتفصیل گفتگو کی۔ ان کی دریافت نے بلونت سنگھ کی تفہیم کے نئے دروازے کھول دیے۔ یہ کتاب ایک ایسے وقت میں آئی جب اردو والے بلونت سنگھ کو بھول چکے تھے۔ نارنگ کی سعی خاص سے (توجہ دلانے پر) آج کل، کتاب نما اور سوغات نے بلونت سنگھ پر خاص نمبر اور گوشے نکالے۔ جیسا کہ انھوں نے تحریر کیا ہے۔

نارنگ نے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیاں منتخب کیں۔ اس عمل میں تین نئی کہانیاں بھی دریافت کیں۔ 'راستہ چلتی عورت'، 'کالی تیتری' اور 'گمراہ'— گویا اٹھارہ کہانیاں مجموعوں سے اور تین رسائل سے لیں۔ یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور تحقیقی میدان سر کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا قابل ستائش ہے۔

نارنگ نے بلونت سنگھ کی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ناشر اور سنہ اشاعت کے ساتھ جو تحقیق کا طریقہ کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے اس میں کہیں کہیں تسامح ہوا۔ جیسے ایک ''معمولی لڑکی'' اور ''عورت اور آبشار'' ناولٹ ہے لیکن فہرست میں ناول لکھا گیا ہے۔ اس طرح 'چک پیرا کا جستا' ناول ہے اسے افسانوی مجموعہ لکھا گیا ہے۔ تیسرے 'تارو پود' کی سنہ اشاعت 1944 درج کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پچھلے صفحات پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس میں شامل تمام افسانے 1944 اور 1945 کے ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعہ 1945 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔

ناول ''رات چور اور چاند'' 1961 میں ادارہ فروغ اردو لاہور، نقوش پریس سے شائع ہوا۔ اس سے قبل یہ ناول نقوش میں قسط وار مارچ 1956 سے اکتوبر 1961 تک متواتر شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس ناول کا سنہ اشاعت نارنگ نے 1948 درج کیا ہے۔
ہندی کتابوں کی فہرست بھی مقام اشاعت، سنہ اشاعت اور پبلشر کے ساتھ دی گئی

ہے۔ لیکن اس میں ناول اور افسانوی مجموعہ کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ اگر یہ بھی کر دیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہندی کتابوں کی کل تعداد فہرست کے مطابق 29 ہے۔ بلونت سنگھ پر کیے گئے اب تک کے کاموں میں نارنگ کا کام سب سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے۔

نارنگ نے 'بلونت سنگھ کا فن- سائیکی، ثقافت اور شکست رومان' کے عنوان سے جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس کا اختتام یوں کیا ہے:

> ''ایسی پرلطف کہانیوں کا فن کار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہوسکتا............................ اگرچہ منٹو، بیدی، کرشن اور قاسمی کے فوراً بعد کے معاصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہیں اس قدر نہیں ٹھہریں، اور پھر قبل از وقت موت سے وہ نگاہوں سے جلد اوجھل بھی ہوگئے۔ تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی باز آفرینی کے اعتبار سے، نیز جگا، گرنتھی، سورما سنگھ، ویٹلے 38، پہلا پتھر، دیش بھگت، کالی تیتری یا کٹھن ڈگریا کے خالق کی حیثیت سے اردو افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کی خاص خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گی کم نہیں ہوگی۔ ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا ہے، وقت اسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔''

نارنگ کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ میرے اس حقیر کام کو بلونت سنگھ کی از سرِ نو دریافت کی ایک کوشش ہی سمجھنا چاہیے۔ وقت بلونت سنگھ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکا۔ نارنگ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

چھ افسانوی مجموعوں کے افسانوں کے علاوہ اس کلیات میں نئے تلاش کیے گئے افسانے تقریباً 70 ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

نئے افسانے : آبشار، آبگینہ، آنندکارج، ایک ہی ناؤ میں، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ارداس، ایک رات، امانت، ایلی ایلی، باندھ، بادلوں کی چھاؤں تلے، بن باس، بھیگی آنکھیں، بات ایک رات کی، بھول بھلیاں، پھانس، پاسٹ، پودے،

پھلکاری، پھمن کور، پردیسی چاند، پیلا پھاٹک، پاسبان، پورا جوان، تیسرا سگریٹ، تین خط، تین دیویاں، تعویز، تیاگ، تکون، جزیرے، چاند اور کمند، چلمن، چالان، چار سو برس پہلے، چار استاد، چیتا، حد فاصل، حسن والے 1998 میں، خدا کی وصیت، دودھ بھری گلیاں، دیدار، دوسرا ہنی مون، دل بلبل، دستک، دانت ایک بات ایک، ڈاکو باگڑ سنگھ، راستہ چلتی عورت، زلف کی داستان، رخصتی، زن گذراں، سکہ زن، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیہ، صبح و شام آرزو، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کالی تیتری، کول سنگھ کی محبوبہ، گلیاں، گوری چلی سسرال، لٹکتی شامیں، لکھن سنگھ کا اغوا، ناگ پھنی، ھوالشافی۔

اب وہ افسانے جن کا نام تو معلوم ہے لیکن جن تک رسائی نہیں ہو سکی ہے وہ یہ ہیں: البیلا، اس حمام میں، بیڈمنٹن کی چڑیا، دوسری غلطی، سنگ انداز، کاتے، واپسی، یہ لمحے، پودے۔

نئی کھوج میں ڈرامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔

ڈرامے : پامال محبت، پھانس اور سکہ زن ہیں اور **ناولٹ**: عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے، **مضامین**: چار سو برس پہلے، فلمی انٹرویو، حضرت چھچھوندر چھچھوندری، ایڈیٹر لوگ، **بچوں کی کہانیاں** اور کرشن چندر، ساحر لدھیانوی اور فراق گورکھپوری سے لیے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اتنی ساری نئی سوغات اس کلیات میں شامل ہیں۔

عنوان کی سطح پر ایک تکرار اور ایک تبدیلی ہے۔ مثلاً 'کالے کوس' یہ ان کے ایک ناول کا نام ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان سے ایک افسانہ بھی اس کلیات میں شامل ہے۔ اسی طرح 'رشتہ' کے نام سے ایک افسانہ 'سوغات' کے شمارہ آٹھ گوشۂ بلونت سنگھ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ یہ دراصل 'کرنیل سنگھ' نام کی کہانی کا بدلا ہوا عنوان ہے۔ یہ کہانی ہندی میں 'رشتہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اور ہندی مجموعے میں اسی نام سے شامل ہے۔ اردو میں کرنیل سنگھ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ''آبشار'' ان کے ایک افسانے کا نام ہے جو آجکل میں مارچ 1955 میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے ان کا ایک ناولٹ بھی شائع ہوا۔ کچھ لوگ اس کو ایک ہی مانتے ہیں۔ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ دراصل یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ آبشار افسانے کو ہی پھیلا کر ناولٹ

کا روپ دیا گیا ہے۔ لیکن افسانہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ دونوں کے متن میں بھی کافی فرق ہے۔ وہی فرق جو افسانے اور ناولٹ میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ افسانہ آبشار ہی بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے کتابی شکل میں آیا مناسب نہیں ہے۔ عنوان میں اضافہ کے ساتھ ساتھ متن میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ گرچہ کہانی کا محور عورت اور آبشار ہی دونوں میں ہے۔

کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شائع شدہ افسانوں کے سنہ اشاعت کے مطابق رکھا گیا ہے اور جن افسانوں کے سنہ اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کی اشاعت مجموعہ کی سنہ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھی گئی ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو صحیح و درست مانا گیا ہے۔

یہ کلیات کی آٹھویں جلد ہے۔ جو متفرقات پر مشتمل ہے۔ اس میں آٹھ افسانے، چھ ڈرامے، چار مضامین، تین انٹرویو اور پانچ عدد بچوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ اس جلد کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں شامل تمام افسانے تحقیقی کاوش کا ثمرہ ہیں اور جملہ قارئین کے لیے نئے ہیں۔ ڈرامے میں پامال محبت، پھانس اور سکہ زن نئے ہیں۔ مضامین، انٹریو اور بچوں کی کہانیاں بھی تحقیقی سفر کی جستجو ہیں۔ یہ سبھی کلیات کے قارئین کی نئی سوغات ہیں۔

بلونت سنگھ کے اردو سرمایے کی یہ آخری جلد ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلونت سنگھ نے اس کے علاوہ اردو میں اور کچھ نہیں لکھا ہے۔ لکھا ضرور ہے لیکن بھرپور کوششوں کے باوجود وہاں تک میری رسائی نہیں ہو سکی۔ اب اگلا سفر ہندی سرمایے کی ترتیب کا ہوگا یعنی نویں جلد سے ہندی میں لکھے گئے افسانے، ناول اور ناولٹ کا ترجمہ ترتیب دیا جائے گا۔ اس طرح یہ کلیات تقریباً بیس جلدوں میں یا اس سے زائد میں مکمل ہوگی۔

اس کلیات کی تدوین و تحقیق میں جن لوگوں نے میری مدد کی میں ان تمام حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔ خاص طور پر پروفیسر مرزا حامد بیگ (پاکستان) کا جنھوں نے نقوش کی فائل سے میری نشاندہی پر افسانہ 'دودھ بھری گلیاں' اسکین کر کے مجھے ای میل سے بھیجا۔ نقوش کا یہ شمارہ جس میں افسانہ شامل تھا مجھے ہندوستان میں کہیں دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسی طرح 'تیسرا سگریٹ' الٰہ آباد سے چودھری ابن النصیر نے نقوش کی ہی فائل سے جو ان کی لائبریری میں موجود تھی زیروکس کاپی بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھجوائی۔ الٰہ آباد سے ہی بلونت سنگھ کی اہلیہ

منجو سنگھ نے پروفیسر علی احمد فاطمی کے ذریعہ بچوں کی کہانیاں، انٹرویو اور افسانہ 'تعویذ' دستیاب کرایا۔ بیسویں صدی کی ایڈیٹر شمع افروز زیدی نے بیسویں صدی اور روبی کی فائل میری گزارش پر مجھے دستیاب کرائی جس کی جستجو میں، میں بہت دنوں سے تھا۔ جس میں مجھے کئی نئے افسانے ملے، جس سے کلیات کی معنویت میں بے حد اضافہ ہوا اور میری تحقیقی راہ کی دشواریاں بھی ان لوگوں کے تعاون کی وجہ سے ذرا آسان ہوگئیں۔ ورنہ شاید یہ سب کچھ ممکن نہیں ہوسکتا تھا میں فرداً فرداً ان تمام احباب کا بے حد شکر گزار ہوں۔

بلونت سنگھ کی بہت سی کہانیاں ماہنامہ 'شمع' دہلی میں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن باوجود کوشش کے شمع کی فائل تک رسائی نہیں ہوسکی۔ 'شمع' والوں نے اسے سنبھال کر نہیں رکھا۔ آپسی بٹوارے میں ادارے کے ساتھ ساتھ اس کا تہذیبی سرمایہ بھی تلف ہوگیا، جس سے زبان و ادب کو بے حد نقصان پہنچا۔ ایسے بہت سے افسانے جن کا نام مجھے معلوم ہے یا جس کا تذکرہ تنقیدی مضامین میں آیا ہے اور جو مجھے باوجود کوششوں کے دستیاب نہیں ہوسکے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ افسانے 'شمع' میں شائع ہوئے ہیں۔ محدود وسائل کی وجہ سے تلاش کا یہ سفر اپنی منزل کو نہ پاسکا۔ معیاری تحقیق پر دلچسپی ہونے والے ادارے اس پر غور فرمائیں۔ معیاری تحقیق کے لیے وافر وسائل کا ہونا ضروری ہے۔

اب اخیر میں، میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر اور پی پی او نسیم احمد اور دوسرے تمام اسٹاف، خاص طور پر محترمہ مسرت جہاں، ڈاکٹر توقیر راہی، شہنواز خرم، عبد السلام صدیقی اور محمد اقبال کا شکر گذار ہوں کہ ان لوگوں کی وجہ سے یہ پروجیکٹ تکمیل کے مرحلے تک پہنچے اور زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آسکا۔ خدا سب کو جزائے خیر دے۔

جمیل اختر

مئی 2011

18 جی، سی پی ڈبلیو ڈی کالونی
وسنت وہار، نئی دہلی۔ 57

افسانے

دودھ بھری گلیاں

شام کی سرمئی زلفیں آسمان کی بے کراں وسعتوں میں لہرا گئیں۔

وہ......اپنے مکان سے باہر نکلا۔ اس نے تنگ و تاریک اور غلیظ گلی کی نانک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی اونچی دیواروں کے بیچ میں سے دم بدم چمک کھوتے ہوئے عمیق آسمان کی جانب دیکھا۔ آڑی ترچھی سرخ لکیروں کے باعث آسمان کا چوڑا سینہ تلواروں اور چھریوں کے گھاؤ سے معمور دکھائی دیتا تھا۔

بچھو کے ڈنک کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوئی یہ گھناؤنی گلی نہ جانے کہاں سے کہاں کو چلی گئی تھی۔ یوں جان پڑتا تھا جیسے دیواروں کی اینٹیں کبھی خوب بڑی بڑی اور سونے کی بنی ہوں گی۔ لیکن اب سونا غائب تھا مٹی باقی بچ گئی تھی۔ اینٹیں جیسے صدیوں کے بوجھ تلے دب، گھٹ اور پچک کر رہ گئی تھیں۔ دیواروں پر کائی پھوٹ آئی تھی جو کبھی خوشنما سبز رنگ کی تھی۔ لیکن اب اس کی تہہ کھجلی کے مارے ہوئے کتے کی کھال کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اینٹیں نمناک اور ناہموار تھیں—— اور ان کے بیچ میں تھپے ہوئے بوسیدہ پلستر میں صدہا سپید سپید کیڑے اوپر تلے کلبلاتے رہتے تھے۔ گلی کا فرش بھی نانک شاہی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ان کی دراڑوں میں سے مٹیالا اور بدبودار پانی رستا رہتا تھا جس میں آفتاب عالمتاب کی کرنیں

منعکس ہونے کی ناکام کوشش کیا کرتی تھیں۔ اس دھندلی فضا میں نالیوں کا سرسراتا ہوا پانی یوں دکھائی دیتا تھا جیسے گوبر اور مٹی ملا پارہ، بیسیوں قسم کے حشرات الارض دم بھر کو سطحِ آب سے اوپر اٹھتے اور ڈبکی لگا جاتے۔ بعض منچلے نالی سے باہر رینگ آتے۔ ایک لمحہ کے لیے اردگرد کا جائزہ لیتے اور پھر عجب شان بے اعتنائی اور روکھے پن سے منہ کو موڑ کر پانی اندر سرک جاتے۔

سنسان گلی کے مکانوں کے دروازے زیادہ تر بند اور بعض نیم وا تھے۔ یہ مقام طلسم ہوشربا کے کسی شہر کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا جس پر کسی جادوگر نے سحر کر دیا ہو یا جہاں آدم خور دیو کی آمد کا خدشہ ہو یا جس کی گلیوں میں گھڑی بھر پہلے جادو کا بدمست بیل نتھنوں سے شعلے اڑاتا گزر گیا ہو۔

تاریک ڈیوڑھی سے باہر نکل کر اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائیں۔ اس کا قد میانہ تھا۔ بدن اکہرا، جسم کا رنگ ہلکا سرمئی، جلد مینڈک کی کھال کے مانند چکنی، آنکھیں بے حس و جامد لیکن ان میں عجیب قسم کا تجسس اور تیزی بھی تھی۔ وہ بے داغ سفید لباس زیبِ تن کیے تھا۔ اس نے ہاتھوں کو تیزی کے ساتھ ملا۔ ہونٹوں کو سکیڑ سکیڑ کر مسوڑھوں کو صاف کیا۔ اس کے سرخ مسوڑھوں میں سفید دانت آبدار خنجروں کی طرح چمک اٹھے۔

ڈیوڑھی کے دروازے کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے دو چبوترے بنے تھے۔ اس نے سرسری انداز سے ان کی طرف دیکھا پھر اس نے بے چینی سے کھڑے کھڑے پاؤں کو تیزی سے حرکت دی۔ پیشتر اس کے کہ وہ نیچے اتر کر روانہ ہو اس کی نگاہ ایک آدمی پر پڑی جو پرچھائیں کی طرح گلی کی دیوار کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

اسے نو وارد کی صورت سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ رک کر اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

گلی کی بدبودار خنک فضا میں اجنبی نمدار، غلیظ اور بوسیدہ دیوار کے ساتھ کندھا بھڑاتا چلا آ رہا تھا۔ وہ قد آور انسان تھا فاقہ زدہ ہونے کے باوجود اس کے پھیلے پھیلے ڈیل ڈول اور بڑے بڑے ہاتھ پاؤں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر اسے پیٹ بھر کھانے کو ملے تو وہ مردانہ وجاہت کا بہت اچھا نمونہ بن جائے۔ اس کی داڑھی بڑھ آئی تھی، آنکھیں بے رونق، لب خشک

اور بال بکھرے ہوئے تھے جو کپڑے اس نے پہن رکھے تھے انھیں لباس کہنا بھی لفظ لباس کی توہین کرنا تھا۔ اس کے جسم کا بیشتر حصہ ننگا تھا۔ میلے کچیلے بدبودار چیتھڑے لٹکائے۔ نظر زمین پر گاڑے ماحول سے غافل وہ لپکتا چلا جارہا تھا۔ دفعتاً فضا میں 'ابے کون ہے تو؟' کی آواز گونجی اور نو وارد چوہے کی مانند ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا...... جب اس نے سفید پوش کی سانپ کی سی آنکھیں دیکھیں تو اس کی مسکینی اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے ڈرے ہوئے کتے کی طرح دانت دکھائے۔

دونوں پاس پاس کھڑے تھے۔ سفید جی نے اینٹھ کر دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کولھوں پر جما رکھی تھیں۔ نو وارد بے طرح سہما ہوا تھا، اس کا سر نیچا ہوگیا تھا۔ وہ کن انکھیوں سے ڈر ڈر کر سفید جی کی طرف دیکھتا تو اس کے دیدوں کی پھیکی نمائش سے اس کی بیچارگی کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔ اس کے جسم کی رگ رگ کپکپا رہی تھی۔ اس کی گرد آلود پیشانی اور گردن پر پسینے کی ہلکی سی تہہ نے اُسے اور بھی مکروہ اور قابلِ نفرت بنا دیا تھا۔

'بولتا کیوں نہیں سونور کے بچے؟'

'م میں...... میں......'

'میں میں کے بچے...... ممنجھو' سفید جی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ کتے کے پلے...... حرامی کے بچے...... تیری لتاں کی......'

سفید جی نے ہاتھ بڑھایا اور اس کی لجلجی انگلیاں جو درحقیقت بے حد سخت اور طاقتور تھیں۔ نو وارد کی گردن پر کس گئیں۔ ان کی گرفت میں اس کی گردن اور چہرے کی رگیں پھٹ جانے کی حد تک پھول کر دکھنے لگیں۔ آنکھیں اُبل پڑیں اور زبان پانی میں بھیگی ہوئی ڈبل روٹی کی طرح محسوس ہونے لگی۔ اس نے ابروؤں اور آنکھوں کے اشاروں سے سمجھایا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی حرکات مظلومانہ کے ساتھ ساتھ بڑی مضحکہ خیز بھی معلوم ہوتی تھیں۔ دم بھر کو موقع ملا تو اس نے کہا 'ہجور! آپ مائی باپ ہیں۔ میں بوہت گریب اور مسکین ہوں۔ آپ کے پاؤں پر سر رکھ کر پرارتھنا کرتا ہوں کہ مجھے اپنی نجر سے دور ہٹ جانے کا موکا دیجیے......'

سفید جی نے زناٹے کا تھپڑ اس کے دائیں گال پر رسید کیا۔ پھر بائیں پر...... پھر

دائیں پر...... پھر...... غرض پے در پے تھپڑوں کی بوچھار سے اس کا بے خون کا چہرہ پہلے سرخ ہوا اور پھر نیلا پڑ گیا۔

'سالے! ہمارے منہ لگتا ہے؟ تیری لونڈیا کو — بد کے تخم...... تجھ ایسے انسانوں کو میں خوب جانتا ہوں۔ اڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔ بیل کی صورت! چمار! کہاں کام کرتا ہے؟ کسی کھیت میں یا کارخانے میں......؟'

'بیل کی صورت' نے ہکلا کر کچھ کہنا چاہا تو اس نے اس کے دونوں کانوں کو چٹکیوں میں لے کر انھیں پوری قوت سے کھینچا اور مسلا اور پھر ان میں اپنے ناخن گڑو کر انھیں چھیل ڈالا۔ اور دانت پیستے ہوئے چلایا۔ 'حرام خور! مفت کی کھا کھا کر سرکاری سانڈ ہوگیا ہے۔ سالو! تم زمین کا بوجھ ہو۔ تم سب کو قطار میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دینا چاہیے...... تیرے ایسے گریبوں اور مسکینوں کی رگوں سے خوب اچھی طرح واقف ہوں میں۔'

یہ کہہ کر اس نے اس کے بڑھے ہوئے بالوں کو مٹھی میں دبوچ کر اس زور سے کھینچا کہ ان میں سے بیشتر جڑ سے اکھڑ گئے...... اس سے اسے نئی بات سوجھی۔ اس نے اس کی پلکوں کے بال نوچنے شروع کر دیے۔ 'ارے یہ کیا چھپا رہے ہو...... ہٹاؤ ہاتھ'

یہ کہہ کر اس نے اس کے چیتھڑوں میں ہاتھ ڈالا۔ دو تین گندی پوٹلیاں دکھائی دیں جنھیں زور سے کھینچا تو وہ کھل گئیں۔ اور مٹھی بھر چاول، تھوڑا سا آٹا اور دال کے چند دانے گلی میں بکھر گئے۔ نو وارد دھڑام سے ان پر گر پڑا اور وحشیانہ انداز سے دانہ دانہ چننا شروع کر دیا...... یہ دیکھ سفید جی غصے کے مارے کانپنے لگا۔ 'ارے بھوتنی پلستر! تو کہتا تھا گریب ہوں مسکین ہوں آخر یہ اناج کہاں سے لایا۔ اتنا کھاتے ہو، جبھی تو اتنی بڑی لاش ہوگئی ہے تمہاری۔ لیکن نیت نہیں بھرتی۔ یہ چاول، دال اور آٹا کیا اپنی ماں کے لیے لے جا رہا تھا...... ہاں بھوتنی کے تو تو یہی کہے گا کہ اماں کے لیے ہی لے جا رہا ہوں...... سالے کھاتے ہیں اور ڈکار بھی نہیں لیتے......'

وہ سالا بد ذات اناج کے دانے چننے کے لیے زمین پر جھکا ہوا تھا۔ سفید جی نے اس کے چہرے پر زور سے لات رسید کی جس سے اس کے اگلے چار دانت ہل گئے۔ پھر اس

نے گھونسوں کی بوچھاڑ کردی۔ یہاں تک کہ بدذات کا چہرہ ٹماٹر کی طرح پلپلا ہوگیا۔ جھین پود! چادر مود! گو کے کیڑے...... بدذات کے پلّے!!' سفید جی کے منہ سے کف اڑ رہی تھی وہ بری طرح سے ہانپ رہا تھا۔

زور کی ٹھوکر کھا کر الّو کا پٹھا سر کے بل نالی میں گر پڑا۔ سفید جی ناک اور منہ دونوں سے سانس لے رہا تھا۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے فضا ہوا سے یکسر خالی ہوگئی ہو۔

گلی کی دھندلی اور اداس فضا میں اس کا دم گھٹ سا رہا تھا۔ پھر اس نے قہر آلود نگاہوں سے جھین پود کی جانب دیکھا...... یہ سب اسی کا قصور تھا۔ سالا، کتّا! سور کی اولاد'

قریب تھا کہ وہ اس پر پھر پل پڑے......

دیواروں اور فرش کی اینٹیں یکے بعد دیگرے گلی کے موڑ تک پہنچ کر افق میں گم ہوئی ریل گاڑی کے ڈبوں کے مانند دکھائی دیتی تھیں ـــــ وہ ڈبے جو آندھی کی رفتار سے اڑے جا رہے ہوں۔ موڑ پر پہنچ کر ان کے نقوش بے حد مبہم ہو گئے تھے۔ ان پر اڑتی ہوئی سیاہی انجن میں نکلنے والے دھوئیں کے مرغولوں کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ گلی کے موڑ سے معاً ایک چھوٹی سی لڑکی نمودار ہوئی...... بڑی عجیب بات تھی۔ آندھی کے رخ کے برعکس روئی کا ایک گالا بڑی سبک رفتاری سے چلا آ رہا تھا...... بچی نے ان دونوں کو دیکھا تو کھٹ سے رک گئی۔ وہ روکھے سوکھے بالوں اور کچوری سے گالوں والی بھولی بھالی معصوم بچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کا کٹورا تھا۔

سفید جی نے اسے دیکھا تو دفعتاً صورت بگڑ گئی ناک کے قریب سے سر تک تین گہری گہری لکیریں نمودار ہوئیں آنکھوں کی پتلیاں کھٹ سے ناک کی جڑ کے قریب پہنچ گئیں۔ باچھیں چر گئیں۔ اس کے 'کتا دانت، نمایاں ہوگئے اور اس کی سانپ کی سی جامد، مقناطیسی آنکھیں بچی کے چہرے پر جم گئیں۔ اُدھر بچی کے پاؤں زمین میں گڑ گئے اور اس کی آنکھوں میں انتہائی خوف و ہراس کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

سفید جی نے زخم خوردہ درندے کی طرح بڑی تیزی سے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو بچی کا دل لرز اٹھا۔

بالآخر سفید جی کو ایک سالم اینٹ مل گئی۔ جسے اٹھا کر اس نے جلدی سے نشانہ باندھا...... بلّی نے حلق کی پوری قوت سے ایک مہیب چیخ بلند کی اور کٹورے کو بے اختیار پرے پھینک بگولے کی سی تیزی کے ساتھ بھاگ نکلی۔ سالم اینٹ نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ بال بال بچ گئی البتہ مچھیرے کے جال کے مانند دور دور تک پھیلی ہوئی گلیوں میں سے ذبح ہوتے ہوئے بھیڑ کے بچے کی سی دلدوز چیخوں کی بازگشت رہ رہ کر سنائی دیتی رہی...... چیخوں کا درد و کرب کانسی کی لڑکھتے ہوئے کٹورے کی غیر انسانی کھنکناہٹ کے ساتھ گھل مل کر عجب دل کو دہلا دینے والا شور بلند کر رہا تھا......اس کے بعد یک لخت موت کا سناٹا طاری ہوگیا۔

بہت دیر تک سفید جی کی صورت مسخ رہی......لیکن رفتہ رفتہ اس کی بے حس اور بے کیف آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی رنگین دھاری نظر آنے لگی......

دائیں ہاتھ کو گلی کا موڑ تھا۔ موڑ سے اس طرف کو گلی کی دیواریں یوں کھلتی تھیں جیسے کسی پر اسرار اور سحر انگیز مقام میں داخلے کے لیے طلسمی اژدہا منہ کھولے ہر دیکھنے والے کو اندر داخل ہونے کی دعوت دے رہا ہو۔ گلی کے عین سامنے ایک بہت بڑی تاریک ڈیوڑھی کا بلند و عریض دروازہ حیرت سے کھلا تھا۔ اندر مکمل سیاہ بادل کی سی تاریکی کے بعد ہلکے رنگین خطوط حسین و دلکش زاویے بناتے ہوئے ایک روشن دالان کے نور میں مدغم ہو رہے تھے۔ دالان بے حد صاف اور ستھرا تھا۔ وہاں پھولوں کے پودے اس قدر ساکت کھڑے تھے جیسے ان کے پھول اور پتیاں لعل و زمرد میں سے تراش کر بنائے گئے ہوں۔ بڑ کا ایک عظیم الشان پیڑ صحن کے بیچوں بیچ ایستادہ تھا۔ اس کی سیدھی لٹکتی ہوئی ڈاڑھی ان جٹادھاری برہمچاری سنیاسیوں کی یاد دلاتی تھی جن کی آنکھیں انگارہ اور ان میں سلفے کا خمار و غبار نظر آتا ہے۔

پیڑ تلے ایک عورت پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے گہرے بھورے بال سورج کی روشنی میں دہکتے ہوئے خشک بھوسے کی طرح انگارہ ہو رہے تھے۔ لیکن جو گھنی زلفیں سورج کی کرنوں کی براہ راست زد سے باہر تھیں۔ وہ اپنے گہرے پن کے باعث زعفران کے سائے کے مانند دکھائی دیتی تھیں۔ اس نے کمر کے گرد گہرے سرخ رنگ کا سالو لپیٹ رکھا تھا۔ بدن پر ایک ڈھیلی ڈھالی چولی تھی جس پر رو پہلے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔

چولی اس قدر ڈھیلی تھی کہ نہ صرف اس کی اُجلی بغلوں میں سے بھنے کے سے بالوں کے گچھے دکھائی دے رہے تھے بلکہ بغلوں کے آگے چولی کے ہلالی زاویے میں سے رانوں اور گھٹنوں کے دباؤ سے دودھیا پستان کے پچھلے حصے میں پیدا ہونے والے زیر و بم سے عجب مسحور کن سماں بندھ گیا تھا۔۔۔ کپڑوں سے فارغ ہو کر اس نے نہانے کے لیے پانی کی بالٹی قریب سرکائی۔ جب وہ بالٹی پر جھکی ہوئی تھی تو پانی میں پیدا ہونے والے روشنی کے دائرے اس کے بدن پر منعکس ہو رہے تھے۔ نور کے یہ دائرے گورے بدن کے نشیب و فراز سے گستاخیاں کرتے ہوئے ایک جانب لبوں اور دوسری طرف پاؤں کو چوم رہے تھے۔ اور پھر جب اس 'کافرہ' پر شباب 'سرکشوں' کو چولی کی قید سے آزاد کیا اور سالو بھی اتار پھینکا تو وہ سر تا پا بجلی کی قاش کی مانند بل کھا کر تڑپی اور یوں معلوم ہونے لگا کہ دالان اس کے غیر مرئی وجود سے منور دتاباں تھا اور جیسے وہ شعلے بھڑک کر اٹھے گا اور چشم زدن میں آسمانوں کی وسعتوں میں گم ہو جائے گا......

سفید جی کی پتلیاں آہستہ آہستہ گھومیں اور غلیظ کے چہرے پر جا کر رک گئیں۔۔۔ دفعتاً اس کی صورت پہلے سے بھی زیادہ مسخ ہو گئی۔ 'ابے تیری میا کی...... سالے تو بھی دیکھتا ہے۔ کیا تیری آنکھیں اس کام کے لیے بنی ہیں...... مدر چو...... بھوتنی چتنگ......تو......ابے تو؟'

یہ کہہ کر سفید جی نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور فرمایا۔ ''سیدھا کھڑا رہ۔''

غلیظ سیدھا کھڑا ہو گیا، سفید جی بہت دور سے لڑاکا مینڈھے کی طرح سر جھکا کر بگولے کی سی تیزی کے ساتھ آیا اور سر جھکا کر اچھلا اور سر پوری قوت سے مدر چو کے پیٹ میں دھانس دیا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا اور بھوتنی چتنگ درد سے دوہرا ہو گیا۔ سفید جی نے سیدھا کھڑا رہنے کا حکم صادر فرما کر پھر وہی عمل کیا۔ بار بار ٹکریں مارتا رہا۔ صورت اور زیادہ مسخ ہو گئی۔ بھوؤں کے بال بڑھ گئے اور موٹے ہو گئے۔ نتھنوں کے اوپر سے منہ کے دہانے تک پہنچنے والی لکیریں بہت گہری ہو گئیں۔

سورج غروب ہو گیا تاریکی بڑھنے لگی۔

سفید جی نے غلیظ جی کی باچھوں میں انگوٹھے ڈال کر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش

کی۔ پھر اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ کبھی اسے گراتے کبھی پٹختے، کبھی چیختے...... سفید جی کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی۔ کپڑے غلاظت میں لت پت ہو گئے تھے۔ اور وہ کیچڑ میں نہائے ہوئے کچھوے کے مانند دکھائی دینے لگا۔ کان گدھے کے کانوں کے برابر ہو گئے۔ موسوڑھے اوپر کو اٹھ گئے، دانت لمبے ہو گئے، ناخن بڑھ آئے۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے غلیظ جی کو مارا اور دانت پیس پیس کر کہا 'میں تجھے مار ڈالوں گا...... میں تجھے مار ڈالوں گا۔'

بالآخر اس نے غلیظ جی کو گلی کے فرش پر لٹا دیا اور کہا 'اب میں چھت پر سے تجھ پر چھلانگ لگاؤں گا' اسے لٹا کر وہ ڈیوڑھی میں غائب ہو گیا، پھر چھت پر دکھائی دیا اور پھر اس قدر بلندی سے غلیظ جی کے پیٹ پر چھلانگ لگائی، پھر چھاتی پر، پھر گردن پر، پھر سر پر......

ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔ متعدد چھلانگیں لگانے کے بعد سفید جی نے غلیظ کو اٹھایا۔ وہ سمجھا تھا کہ غلیظ کا بھرتہ نکل گیا ہو گا لیکن غلیظ بدستور سانس لے رہا تھا، آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ اس پر سفید جی چلایا 'ابے مدر چو...... ابھی تو زندہ ہے؟'

اب سخت تاریکی میں جھکڑ سا چلنے لگا۔ غلیظ اٹل پہاڑ تھا اور سفید جی جواب غلیظ جی سے بھی زیادہ غلیظ دکھائی دیتا تھا اس پہاڑ سے ٹکریں مارنے والا شیطان! چیت، گھونسے، لاتیں، گالیاں سب کچھ فضا میں گونج رہا تھا۔ اب کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون کس کو مار رہا ہے۔

آخر سفید جی ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ بازو لٹکنے لگے۔ آنکھیں پھٹ گئیں۔ ٹانگیں جھولنے لگیں۔ وہ غلیظ سے آنکھیں ملائے بغیر دونوں مٹھیاں بڑی نقاہت سے اس کے سینہ پر مارتے ہوئے بڑبڑایا۔

'نہیں۔ تم نہیں مرو گے، تم نہیں مر سکتے، تم کبھی نہیں مر سکتے۔'

اس کے گھٹنے آگے کو دھنس گئے۔ اور وہ زمین پر اوندھے منہ گر پڑا—

مار کھا کھا کر علیظ کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر تاریکی میں بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ 'سفید جی آپ کہاں ہیں...... آپ کہاں ہیں؟'

اس کا پاؤں کسی گول چیز پر پڑا۔ اور وہ شے اس کے بوجھ سے چکنا چور ہو گئی۔

اس نے جھک کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ سفید جی کا سر ہے اور ٹوٹی ہوئی

کھوپڑی میں سے آنکھوں کی پتلیاں کانچ کی گولیوں کی طرح ادھر اُدھر لڑھک گئیں۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ چشم زدن میں اتنا بڑا انقلاب آ جائے گا۔

فضا میں کچھ مترنم صدائیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے سر اٹھایا اور دیکھا کہ تارے معصوم بچوں کی دھلی دھلائی آنکھوں کی طرح دمک رہے ہیں۔

معاً رو پہلا چاند کالے بادل کے چنگل سے باہر نکل آیا اور مچھیرے کے جال کی مانند دور دور تک پھیلی ہوئی آڑی ترچھی گلیاں یوں دکھائی دینے لگیں جیسے وہ دودھ سے چھلکتی ہوئی نہریں ہوں۔

☆☆☆

یہ افسانہ نقوش لاہور، دسمبر 1950 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

تیسرا سگریٹ

جب دیوراج نے دیکھا کہ سب ہمہ تن گوش بنے بیٹھے ہیں تو اس نے منہ قدرے اوپر کو اٹھا کر سگریٹ کا دھواں ایک فرّاٹے کے ساتھ چھوڑنا شروع کیا...... اور ہم اس کے گول منہ میں سے دھواں تیزی سے نکلتے اور فضا میں تحلیل ہوتے دیکھتے رہے......

یہ اس کی مخصوص عادت تھی کہ بات شروع کی اور جب دوست متوجہ ہوتے تو وہ اپنی داستان میں بڑے طویل وقفے پیدا کرنے لگتا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شاید سامعین کے شوق کو تیز سے تیز تر کرنا مقصود ہو یا شاید وہ پرانی فضا میں کھو جانا چاہتا تھا یا ان وقفوں میں تفصیلات فراہم کرتا تھا، مقصد خواہ کچھ بھی ہو لیکن ہمیں یہ وقفے برے نہیں لگتے تھے۔ اس سے ملاقات اکثر کافی ہاؤس میں ہوتی تھی۔ کافی ہاؤس میں بیٹھنے کا ایک ہی مقصد ہوتا تھا یعنی فرصت کے لمحات کو گزارنا۔

اس وقت کافی ہاؤس میں خاصا شور مچا ہوا تھا، دیوراج کے خوب صورت گول چہرے پر ذہنی اذیت کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے ہم سب کی جانب متوجہ ہو کر کہا ''یار! بہت شور ہو رہا ہے۔''

ہم سب نے ہامی بھری لیکن ہماری صورتوں سے اس پر واضح ہو گیا کہ باوجود شور

کے ہماری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اس کے دل کو تسکین سی حاصل ہوئی اور اس نے سلسلہ کلام جاری کیا۔ یہ دسمبر 1945 کا قصہ ہے۔ میں بے کار تھا۔ تم لوگ جانتے ہی ہو کہ پہلے میں خوب مزے میں تھا۔ لیکن اب کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بھائی کبھی کبھی توفیق (FATE) قسمت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ حالانکہ کئی بارسوخ حضرات سے مراسم تھے۔ لیکن حرف مدعا زبان تک لاتے ہوئے ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک آدھ دوست جن سے کوئی پردہ نہیں تھا کوشش میں مصروف تھے۔ ابھی روزگار کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک دن کناٹ پلیس میں ایک پرانے ہم جماعت سے ملاقات ہوگئی...... یہ بجائے خود ایک دلچسپ واقعہ ہے۔''

یہاں تک پہنچ کر اس نے پھر تامل کیا پھر ایک طویل کش لے کر سیٹی بجانے کے انداز سے اس نے ہونٹوں کو گول کیا اور ان میں سے دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔

دھواں نکلتا رہا۔ وہ اپنے دھیان میں اور ہم اپنی کرسیوں میں مگن۔

بات شروع ہوئی...... ''میں ریستوران میں بیٹھا تھا...... ریستوران کا نام جان کر کیا کریں گے آپ...... اور نہ میں اپنے دوست کا نام بتاؤں گا...... وہ سی آئی ڈی کے اینٹی کرپشن محکمے میں ملازم تھا۔ خیر! اب وہ واقعہ سنئے!...... ریستوران کے گوشے میں میں نے ایک نہایت حسین خاتون کو دیکھا۔ حسین صورت کو دیکھنا کوئی جرم تو نہیں لیکن مسلسل دیکھتے رہنا یقیناً معیوب ہے...... ہوا یہ کہ میں مالی الجھنوں میں گرفتار تھا...... میرے ذہن نے اس حسینہ کے وجود کا احساس تو ضرور کیا لیکن میں اس وقت دوسرے ہی موڈ میں تھا۔ مجھے خوب صورت لڑکیوں سے اس وقت قطعاً کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوسکتی تھی۔ البتہ میری نگاہ بظاہر اسی طرف جمی رہی اور ذہن نظارگی کے لطف سے خالی تھا...... عورت کو یوں محسوس ہوا کہ میں بیہودہ پن سے مسلسل اس کی جانب گھور رہا ہوں۔ اس نے اس امر کی اطلاع پاس بیٹھے ہوئے اپنے خاوند کو دی۔ اس نے مجھے گھور کر کے دیکھا لیکن میں چونکہ خالی الذہن تھا اس لیے میری ٹکٹکی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس پر وہ اٹھا اور قریب آ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو اپنے سامنے ایک خشمگیں چہرہ پایا۔ ناک کے سِتے کی وجہ سے وہ

اور بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہ پایا۔ بے اختیار کہا "تشریف رکھیے، میں نے اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی اسے پہچان لیا۔ ہم کئی برس کے وقفے بعد ملے تھے۔ چنانچہ بڑا پرتپاک مصافحہ ہوا اور وہ مجھے اپنی بغل میں لیے بیوی کے پاس پہنچا اور قہقہہ لگا کر بولا "بھئی یہ اپنا دیوراج ہے۔ لو بیٹھو یار! یہ تمھاری بھاوج ہے، دیکھنا ہے تو قریب سے دیکھو۔ میں اس پر شرمایا۔ اس کی بیوی نہ صرف حسین اور پڑھی لکھی تھی بلکہ سچ مچ باذوق خاتون تھی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا "اس میں تو شبہ نہیں کہ آپ قابلِ دید ہیں لیکن یقین کیجیے، میں اپنی الجھنوں میں گرفتار تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا چہرہ آپ کی جانب تھا—" "بھئی میں یقین کرتا ہوں۔" میرے دوست نے حامی بھری۔ ارے ہم نے کالج میں بھی کئی رومانس لڑائے لیکن دیوراج بچارا تو خود ہی نصف لڑکی تھا۔ حسینوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی شرمانے میں پہل انھیں کی طرف سے ہوتی تھی— اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے—"

اب پھر وقفہ— لیکن اس وقفے میں ہم اس دلچسپ حادثے پر قہقہے لگاتے رہے اور دیوراج کو دھواں اڑانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا۔

"کچھ دنوں کے بعد پھر میری اپنے اسی دوست سے ملاقات ہوئی۔ اب ہم دونوں تنہا تھے۔ ارادہ یہ ہوا کہ دوپہر کا ٹائم بیئر پینے میں گزارا جائے۔" دیوراج نے پھر اپنا قصہ جاری کیا "بیئر کے دو دو مگ ختم ہوگئے تو میرے دوست نے میری بے کاری کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کی۔ میں ہچکچا رہا تھا لیکن اسے اصرار تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ سارے حالات سن کر اس نے ذرا تامل کیا اور پھر کہا یار! تمھیں ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خواہ مخواہ شرافت سے کام نہ لینا۔ میں نے یہ شرط منظور کر لی۔ اس نے کہا "دیکھو جہاں تم رہتے ہو، وہیں پر سیٹھ دھنی رام کی کوٹھی ہے۔ تم نے ان کی کالی بھجنگ صورت اکثر دیکھی ہوگی۔ بلکہ شاید تمھاری کبھی ان سے علیک سلیک بھی ہو جاتی ہو۔ ہمارے محکمے کو قابلِ اعتبار ذرائع سے علم ہوا ہے کہ وہ ربر گڈز میں بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے اور اس دھندے میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا ہے اس نے۔ اب اگر تم ذرا اپنی روایتی شرافت کو چھوڑ کر کمرِ ہمت باندھو تو آم کے آم گٹھلیوں کے دام حاصل کر سکتے ہو— مجھے بڑا تعجب ہوا پوچھا کہ آخر میں کیا کر سکتا ہوں—؟"

''دوست تم بھی ایک بار بلیک مارکیٹنگ کر ڈالو۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ میں بتاتا ہوں...... سیٹھ جی اتنا تو جانتے ہی ہیں کہ تم انھیں کے محلے کے نہایت شریف بال بچے دار انسان ہو۔ تم ایک روز ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ تم ان کی مدد سے روزگار شروع کرنا چاہتے ہو۔ کہہ دینا کہ پندرہ بیس ہزار روپیہ تمھارے پاس ہے۔ اگر یقینی فائدے کی صورت نظر آئے تو اتنا ہی روپیہ تم اور اکٹھا کر سکتے ہو۔۔۔ اس کو تم پر شبہ بھی نہیں ہو سکتا اور وہ راضی ہو جائے گا...... بس پھر چاندی ہی چاندی سمجھو......''

میرے ہونٹوں پر خشک ہنسی پیدا ہوئی۔ کہا ''تم بھی گھن چکروں کی سی باتیں کرتے ہو۔ واہ پندرہ بیس ہزار کی بھی خوب رہی...... یہاں میرے پاس پندرہ بیس کوڑیاں بھی نہیں ہیں......''

میرے دوست نے بے صبری سے مجھے ٹوکا ''ارے تم کچھ نہیں سمجھے۔ مگر تم تو مجھے بات ختم ہی نہیں کرنے دیتے...... رُپے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بس زبانی بات چیت ہو جائے...... لیکن اب اصل بات سنو۔ ایک الگ تھلگ مکان کا انتظام کیا جائے۔ کچھ شراب ہو نوجوان لڑکی ہو۔ کھانے پینے کا سامان ہو۔ وہاں سیٹھ صاحب کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ میرے ایک دوست کا مکان ہے جو بال بچوں سمیت کسی کی شادی پر چند روز کے لیے باہر چلے گئے ہیں۔''

''یار! نہ جانے میں پاگل ہوں یا تم۔ آخر یہ شراب۔ کھانے کا سامان اور پھر ایک نوجوان لڑکی...... میں یہ چیزیں کہاں سے لاؤں گا......''

''اس کا انتظام ہم کریں گے۔''

''اچھا اب سمجھا...... پھر کیا ہوگا؟''

''ہوگا یہ کہ تھوڑی سی شراب پی کر وہ تم سے کھل جائے گا۔ کاروباری بات چیت صاف صاف ہو جائے گی اور یہ ساری بات چیت ہم ساتھ والے کمرے میں ریکارڈ کر لیں گے۔ مجرم خود جال میں پھنس جائے گا......''

''بھئی تم سچ مچ بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ مانا اس الف لیلہ کی کہانی کی سب

چولیں ٹھیک بیٹھ جائیں تو پھر مجھے کیا حاصل ہوگا؟''

وہ بھی سنو۔ سیٹھ جی پھنس جائیں تو تم ان سے کہنا کہ اگر دس ہزار روپیہ دلوایئے تو معاملہ رفع دفع کروا دوں گا۔''

''اچھا تو رُپیہ لے کر اسے چھوڑ دیا جائے۔''

''ارے نہیں چھوڑیں گے نہیں...... سی آئی ڈی ایسے بدمعاشوں کو چھوڑ نہیں سکتی۔ نہ میں اس رُپے میں کچھ لوں گا وہ تو محض تمھاری جیب میں جائے گا۔''

میں نے جھینپ کر جواب دیا ''معاف کرو دوست مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔''

اس پر میرے دوست کو غصہ آیا بولا ''دیکھو اس قسم کے لوگ پبلک کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ملک کو جو نقصان پہنچایا ہے تم اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتے۔ ان کو سزا دلوانا تو ایسا ہی ہے جیسے طاعون کے چوہوں کو ہلاک کرنا۔ میں نے کہا ''یہ سب ٹھیک ہے میں تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں لیکن میں کسی سے ٹھگی کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

بھئی یہ ٹھگی نہیں۔ یہ تمھارا حق ہے۔ محنت کا حق۔ ہم کو دیکھو ہم پبلک کے دشمنوں کو چکمہ دے کر گرفتار کرتے ہیں اور حکومت ہم کو تنخواہیں دیتی ہے۔ بھئی اگر تمھارا حق محنت مجرم ہی کی جیب سے نکل آئے تو اس میں برائی ہی کیا ہے، غرض میرے دوست نے عملی دنیا کے نشیب و فراز اس انداز سے سمجھائے کہ مجھے آخر کہنا پڑا۔ ''لیکن دوست یہ تو سوچو کہ میں اس قسم کی تکڑم بازی میں بالکل ہی کورا ہوں بھلا مجھ میں اتنی چالاکی کہاں کہ اتنی لمبی چوڑی اسکیم کو کامیاب بنا سکوں۔''

''تم لمبی چوڑی اسکیم کی بات کو چھوڑ دو۔ پہلے تو تمھیں سیٹھ کے پاس جا کر اسے دعوت دینی ہے۔ سمجھے؟''

میں اس کے دلائل کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اس کے کہنے سے میں سیٹھ کے پاس چلا جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ سیٹھ میرے جال میں نہیں پھنسے گا...... کیوں کہ میں اس معاملے میں بالکل الو تھا۔ بس یہیں پر بات ختم ہو جائے گی۔''

پھر دیوراج نے تامل کیا۔ ہمیں اس کی داستان میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ مگر ہم ان

وقفوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ہم نے ایک ایک سگریٹ جلا لیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔ آخر اس نے پھر کہنا شروع کیا— ''میں دوسری شام سیٹھ جی کے وہاں پہنچا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا، آواز تک کانپ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ سیٹھ جی نے بڑی آسانی سے میری دعوت قبول کر لی۔ ان کے دعوت قبول کرنے سے مجھے خوشی ہونے کی بجائے اور پریشانی ہوئی۔''

''جب میرے دوست نے میری کامیابی کے بارے میں سنا تو اچھل پڑا بولا ''بس اب پو بارہ سمجھو۔''

''میں نے مری ہوئی آواز میں کہا ''یار یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''ارے بھئی! اب کون کام باقی رہ گیا ہے۔ میں تمھیں چند سوال اور چند نکتے سمجھا دوں گا بس سیٹھ سے گفتگو کرنے میں انھیں باتوں کو دھیان میں رکھنا۔ بس مرغا خود ہی پھنس جائے گا۔''

میں نے اس کے راستے میں روڑا اٹکانے کے خیال سے کہا ''تو بھئی یہ لڑکی وڑکی کا انتظام کیسے کروں گا۔''

''وہ بھی سنو۔ آج ہی شام کناٹ پلیس جاؤ۔ جہاں ایک چھوٹا سا لال لیٹر بکس ہے وہاں چراغ جلے کھڑے ہو جانا۔ ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے سگریٹ پھونکتے رہنا۔ جب زیادہ سے زیادہ تیسرے سگریٹ پر پہنچو گے تو کوئی نہ کوئی خضر راہ دکھائی دے گا۔ بس معاملہ طے کر لینا۔''

مجھے اس بات کا یقین نہ آیا لیکن چونکہ میرے لیے کوئی خاص جھنجھٹ نہیں تھا۔ اس لیے اندھیرا ہوتے ہی میں اس جگہ پر جا کھڑا ہوا اور پہلا سگریٹ جلایا۔ کش پر کش لگاتا رہا۔ سینکڑوں لوگ ادھر سے اُدھر گزر گئے۔ کسی نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا۔ پہلا سگریٹ ختم ہونے کو آیا تو اسی سے دوسرا جلا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دوست کا خیال غلط نکلے گا اور میں خوش تھا کہ اس طرح میں اس قضیہ کو ختم کر دوں گا۔ ابھی دوسرا سگریٹ پی رہا تھا کہ ایک صاحب اور میرے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں ان کی موجودگی سے گھبرایا کہ ان کے رو برو اگر کوئی

معاملہ طے کرنے والا آ گیا تو بہت مشکل پیش آئے گی۔"

میں نے چپکے سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اکہرے بدن کا کمزور شخص تھا۔ عمر لگ بھگ اٹھائیس برس۔ بال خشک، گال اندر کو دھنسے ہوئے۔ ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوئی۔ گھٹیا سی میلی ٹائی، پرانا کوٹ، پرانی پتلون۔ عجیب حلیہ تھا وہ یا تو پرانا شرابی کبابی اور عیاش تھا یا مصائب دنیا کا ستایا ہوا۔ لیکن میں جلد ہی اس کے کردار کا تجزیہ کرنے سے اکتا گیا۔ دوسرا سگریٹ ختم ہو رہا تھا۔ تیسرا نکالا اور سوچا کہ بس چند کش اور اس کے بعد چل دوں گا گھر کو۔ دفعتاً آواز آئی 'کچھ چاہیے بابو جی؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ نو وارد چپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے شبہ ہوا شاید میرے ہی کان بج رہے تھے۔

"میں آپ ہی سے کہہ رہا ہوں۔"

نو وارد ہی بول رہا تھا۔

"آپ......!" میں گھبرا گیا" کچھ......کیا......اوہ ہاں...... جی ہاں۔"

میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نظریں دوسری جانب تھیں۔ وہ جنگلے پر جھکا سڑک کی جانب پیٹھ کیے چپ چاپ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے سوچا آخر میں اس کی جانب کیوں دیکھوں۔ چنانچہ میں نے سڑک کی جانب منہ پھیر لیا۔

قدرے تامل کے بعد آواز آئی کب؟

"کل رات— کیسی ہے؟"

اس پر نو وارد چپ رہا۔ پھر بولا "بالکل جوان ہے۔"

بات یہ ہے کہ میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ میں ان باتوں کا شوقین نہیں ہوں۔ سرکاری معاملہ ہے اس لیے ذرا ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے......

یہ کہہ کر مجھے خیال آیا کہ آخر مجھے اس شخص کو یہ یقین دلانے کی کیا ضرورت تھی کہ لڑکی مجھے اپنے لیے درکار نہیں تھی......اسے میرا اناڑی پن کہنا چاہیے۔

پھر آواز آئی "کل کس ٹائم؟"

''دس بجے رات سے صبح تک...... پانچ بجے تک۔''

''پچیس رُپے......''

''ٹھیک— کہاں پر؟''

''انڈیا گیٹ......''

''او کے انڈیا گیٹ دس بجے شارپ۔''

میرے دوست نے جب یہ بات سنی تو میری پیٹھ پر دھول جما کر بولا ''یار! تم تو چھپے رستم نکلے۔ واہ وا۔ اچھا اب کل شام کو پانچ بجے ملوتا کہ تمھیں مکان دکان دکھا دوں۔ اور تمھیں باقی باتیں بھی سمجھا دوں۔

دوسرے روز شام کو وقت مقرر پر میں اپنے دوست سے ملا۔ اس نے ایک عمدہ بڑی سی ٹیکسی میں مجھے بٹھایا اور ہم منزل مقصود کی جانب روانہ ہوگئے۔ ایڈورڈ ز روڈ کے آخر میں ایک سنسان سی کوٹھی تھی۔ لیکن جگہ پر فضا تھی۔ مجھے وہ مخصوص کمرہ دکھایا گیا جو ڈرائنگ روم کی صورت میں سجا ہوا تھا۔ دو کمرے اور بھی تھے جو نسبتاً چھوٹے تھے۔ کوٹھی کے باقی کمروں کے بارے میں مجھے ہدایت دی گئی کہ سیٹھ جی سے کہہ دوں کہ وہ میرے دوست بند کر کے چلے گئے ہیں۔ صرف یہ کمرے میں نے تفریحِ طبع کے لیے رکھے ہیں— ڈرائنگ روم کی دری اور غالیچوں کے نیچے ہی نیچے تاریں کوٹھی کے ایک دور افتادہ کمرے تک چلی گئی تھیں وہاں ساری گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

جب میرے دوست سب ہدایات دے چکے تو کہا کہ آؤ اب مجھے کناٹ پلیس میں چھوڑ دو۔ اور پھر یہ ٹیکسی تمھارے سپرد کر دی جائے گی۔ پہلے لڑکی کو لے آنا اور پھر ڈرائیور کو سیٹھ صاحب کو لانے کے لیے بھیج دینا۔ خاطر جمع رکھو۔ باقی کھانے پینے کا انتظام بالکل مکمل ہوگا۔ یہ ڈرائیور اور نوکر چاکر سب اپنے آدمی ہیں۔ اس لیے جو کچھ بھی کہنا سننا ہو انھیں سے کہنا۔

رات کے دس بجے تک میں نے وقت اِدھر اُدھر گھوم کر گزار دیا۔ عین دس بجے میں ٹیکسی سمیت انڈیا گیٹ پہنچا۔ لیکن وہاں کچھ لانے والے صاحب کو نہ پایا۔ انتظار ضروری تھا۔ ٹیکسی سے نکل کر میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا یہ بھی فکر تھی کہیں وہ

حضرت نہ آئے تو بڑی بھد ہوگی۔

کوئی آٹھ منٹ بعد وہ صاحب سائیکل پر سوار آتے دکھائی دیے۔ تاریکی میں پہلے تو انھیں تنہا دیکھ کر پریشانی ہوئی لیکن ان کے پیچھے کیریئر پر بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر جان میں جان آئی۔

لڑکی کے خدوخال دیکھ کر مایوسی ہوئی وہ بہت عام صورت کی لڑکی تھی۔ البتہ جسم گٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھوں کی بناوٹ اچھی تھی رنگت بھی بری نہیں تھی۔ ادھر ہمارے سیٹھ کون پری زاد تھے یہ کہہ کر میں نے اپنے دل کو تسکین دی۔

وہ آدمی تاخیر کے لیے معذرت کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی کوئی بات نہیں سنی جلدی سے پچیس رُپے اس کے ہاتھ میں تھمائے اور بولا۔ ''اب اور دیر نہیں ہونی چاہئے— چلیے بیٹھیے کار میں۔''

آدمی نے لڑکی کو آگے کو دھکیلا تو لڑکی ایسے بڑھی جیسے گھر سے مار پیٹ کر زبردستی لائی گئی ہو۔

ٹیکسی چلی تو وہ آدمی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''صبح پانچ بجے شارپ۔''

پانچ بجے شارپ، میں نے جواب دیا اور پھر ڈرائیور سے کہا'' بھئی تیزی سے چلو۔ آگے ہی کافی دیر ہوگئی ہے۔''

راستے میں لڑکی سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر گہری اُداسی چھائی ہوئی ہے۔ اس کا میک اپ بے پرواہی سے کیا گیا تھا اگرچہ زیادہ لیپ پوت نہیں کی گئی تھی۔ مجھے وہ بے حد الھڑ، شریف، ناتجربے کار اور گھریلو ٹائپ کی دکھائی دی اس نے ایک آدھ بار ماتھے پر گہرا بل ڈال کر مجھے اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ جیسے میں بھیڑیا ہوں، جو بھیڑ کو اٹھائے لیے جا رہا ہوں۔ میں دل ہی دل میں بے حد شرمندہ ہو رہا تھا۔ بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ اس سے کہوں بھین جی! میں آپ کو اپنے لیے نہیں لے جا رہا ہوں۔

لیکن میرے دل کی دل میں ہی رہی۔ یہاں تک کہ ہم کوٹھی جا اترے۔

ڈرائیور وہیں سے سیٹھ کو لینے چلا گیا۔

میں لڑکی کو لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو دیکھا ایک ملازم کھڑا ہے کچھ ڈھکے

ہوئے ڈونگے پرے میز پر رکھے ہیں۔ وہسکی کی دو بوتلیں بھی موجود ہیں۔ ریڈیو بج رہا ہے۔ غرض فضا خاصی ۔پسپ ہو رہی تھی۔

لڑکی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے پانی وانی کے بارے میں پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

نوکر کے اشارے پر میں باہر گیا تو اپنے دوست کو پولیس کے چند اور لوگوں کے ہمراہ گپیں ہانکتے پایا۔ اس نے کہا کہ لڑکی کا انتخاب اچھا نہیں ہے۔ میں نے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ شراب کا دور خوب چلنا چاہئے پھر سب کچھ حسین نظر آنے لگے گا۔ سیٹھ سے کرید کرید کر باتیں پوچھنا تا کہ پکا ثبوت فراہم ہو سکے۔

اس کے بعد مجھے فوراً کمرے میں واپس بھیج دیا گیا اور وہ خود بھی اپنی کمین گاہ میں گھس گئے۔

سیٹھ صاحب کے پہنچنے کا وقت قریب آ رہا تھا میں نے ایک نظر کمرے میں دوڑائی اور محسوس کیا کہ سوا اس لڑکی کے باقی سب چیزیں درست تھیں۔ لڑکی بالکل ٹھس تھی۔ شکل کی بات تو رہی الگ تیور ہی بے ڈھب ہو رہے تھے اور پھر منہ کیا۔ نہ بات چیت، نہ مسکراہٹیں نہ قہقہے۔

اسی اثنا میں لان پر کار کے رکنے کی آواز آئی۔ میں بازو پھیلائے باہر نکلا۔ اور سیٹھ صاحب کا بڑا پرجوش خیر مقدم کیا۔ سیٹھ صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا ''صاحب بڑی سنسان جگہ ہے لیکن ہے پر فضا۔''

جی جی، میں نے جواب دیا۔

سیٹھ صاحب سیاہ فام ہونے کے علاوہ یوں بھی بڑے بے ڈول اور بد صورت انسان واقع ہوئے تھے۔ قد چھوٹا، گول مول، کالے کلوٹے، بھدے نقوش، کلے میں پان۔

میں نے سیٹھ صاحب کو بھی اسی لمبے صوفے پر بٹھا دیا جس پر کہ لڑکی بیٹھی تھی۔ سیٹھ صاحب نے اِدھر اُدھر کے چند سوالات کیے جن کے معقول جوابات پہلے ہی سے گھڑے گھڑائے موجود تھے۔

وہسکی کا دور شروع ہوا۔ چار چار پیگ حلق سے نیچے اتر گئے۔ لیکن سیٹھ بالکل سنجیدہ

اور اٹل بیٹھے تھے۔ نہ آنکھیں چڑھیں نہ بہکے۔ نہ ہنسے، صوفے کے ایک سرے پر لڑکی چپ چاپ بیٹھی تھی اور دوسرے سرے پر سیٹھ صاحب۔ دونوں ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے درمیان میری جان ضیق میں تھی۔ عجب لوگ تھے یہ۔

یوں سیٹھ صاحب نے وہسکی پینے سے انکار نہیں کیا لیکن کیا مجال جو لمحہ بھر کو بھی بہکیں۔

میں کچھ دیر انہیں لڑکی کے ساتھ تنہا چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اور تاریکی میں سے کھڑکی کی دراڑ میں سے اندر جھانکتا رہا مگر دونوں چپ چاپ تھے۔ سیٹھ صاحب پیگ لنڈھائے جا رہے تھے اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے۔ یوں کبھی کبھار ایک نگاہ لڑکی پر بھی ڈال لیتے۔

تنگ آ کر میں پھر اندر پہنچا۔ لڑکی نے شراب پینے سے انکار کر دیا تھا لیکن اصرار کرنے پر کھانے میں شامل ہوگئی۔ اب میں نے بزنس کی بات کی۔ لیکن سیٹھ صاحب کچھ نہ بولے۔ میں نے نہایت بے ضرر اور معصوم سوالوں سے گفتگو کا آغاز کیا۔ لیکن سیٹھ صاحب کو کھلنا تھا نہ وہ کھلے۔ بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ وہ ہر سوال کا جواب ہوں ہاں دے کے ٹال دیتے۔ میں کہتا۔

سیٹھ صاحب! میں معمولی آدمی ہوں کسی نہ کسی طرح سے پندرہ بیس ہزار روپیہ اکٹھا کیا ہے۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو بڑی مشکل کا سامنا ہوگا۔"

سیٹھ صاحب بھولپن سے کہتے جی ہاں بزنس میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔

میں لمبی چوڑی گفتگو کے بعد پوچھتا۔ "تو سیٹھ صاحب آپ سے کیا امید رکھوں؟"

جواب ملتا "امید تو بھگوان سے رکھنی چاہیے۔"

غرض یہ کہ انہوں نے کسی طرح پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیا۔ نہ شراب نے کچھ کام کیا اور نہ لڑکی نے۔

ہر داؤ اور ہر گھات سے کام لے کر بھی جب کامیابی حاصل نہ ہوئی تو سیٹھ صاحب کو ٹیکسی پر واپس بھیج دیا گیا۔ ٹیکسی میں بیٹھتے وقت صرف اتنا کہا "بہت بہت شکریہ۔ جو کچھ میری قوت میں ہے سو وہ میں آپ کے لیے ضرور کروں گا۔"

سیٹھ صاحب کے چلے جانے کے بعد لڑکی تو ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی اور میں اپنے دوست اور اس کے ساتھیوں میں جا ملا۔ ہم سیٹھ جی کے گھاگ پن کا ماتم کرتے رہے۔ لڑکی صوفے پر اونگھتی رہی۔

پانچ بجنے سے کچھ پہلے میں نے لڑکی کو جگایا اور اسے ٹیکسی میں بٹھا کر انڈیا گیٹ کی طرف چل دیے۔

لڑکی نے راستے میں بات تو کجا میری جانب دیکھا بھی نہیں مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور رحم بھی۔ اور سب سے بڑھ کر میں اپنے پر لعنت بھیجتا رہا۔

انڈیا گیٹ کے قریب اس کا ساتھی کھڑا تھا۔ انجن رو کے بغیر ٹیکسی ٹھہر گئی میں نے دروازہ کھولا تو لڑکی شعلے کی طرح باہر نکلی اور ساتھی سے کہنے لگی ''اب آئندہ تم نے ایسا کیا تو زہر کھا لوں گی۔''

ٹیکسی چل دی۔

دیو راج چپ ہو گیا۔ حسب عادت ہمیں کہانی دلچسپ تو ضرور لگی لیکن بے تکی سی — ہماری طرف مطلقاً دھیان دیے بغیر دیو راج نے نیا سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور مسکرا کر بولا یہ میرا تیسرا سگریٹ ہے — کہانی ختم نہیں ہوئی اس کا اختتامیہ باقی ہے۔

''اچھا؟'' ہم نے بیک زبان حیرت کا اظہار کیا۔

دیو راج نے گہرے گہرے کش لیے اور کہنا شروع کیا ''چند ماہ بعد مجھے نوکری مل گئی اچھی ملازمت تھی۔ گیز یٹیڈ۔ مجھے اپنے لیے ایک معاون رکھنے کی اجازت تھی۔ اس اسامی کے لیے اشتہار دیا گیا۔ ٹیکنیکل کام تھا زیادہ عرضیاں نہیں آئیں۔ جو آئیں ان میں صرف ایک ہی شخص کام کا معلوم ہوا تاہم میں نے نصف درجن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلا لیا۔ انٹرویو مجھے خود ہی لینا تھا۔

انٹرویو والے دن میں وقت سے ذرا پہلے دفتر پہنچ گیا تا کہ کاغذات پر ایک نگاہ دوڑا لوں۔

دو سگریٹ پی کر میں نے چپڑاسی کو پہلا نام بتایا۔ تیسرا سگریٹ میرے ہونٹوں ہی

میں تھا کہ سامنے وہی حضرت — یعنی لڑکی والے دکھائی دیے۔

نظریں ملتے ہی ہم دم بخود رہ گئے۔

بالآخر میں نے کہا۔ ''تم قابل شخص معلوم ہوتے ہو بلکہ سب امیدواروں سے بھی قابل...... لیکن وہ لڑکی......''

اس نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری بہن تھی — یقین کیجئے وہ اس کا پہلا موقع تھا اور آخری — میں اسے آپ کے سامنے لا سکتا ہوں...... وہ خود اس امر کی گواہی دے گی — یہ نہ پوچھئے کہ اس رات کن حالات سے مجبور ہو کر وہ حرکت کی......''

''میں نہیں پوچھوں گا — '' میرے دل سے بوجھ سا اتر گیا پھر میں نے کہا'' دیکھو! اس رات بھی کسی نے اسے چھوا تک نہیں۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کہا، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمھیں کو منتخب کروں گا۔ اب جاؤ'' وہ سسکیاں بھرتا ہوا چلا گیا۔''

پھر دیوراج نے مسکرا کر ہم سب کی طرف دیکھ کر کہا:

''اس روز تیسرا سگریٹ پینے کا جو لطف آیا وہ پھر کبھی نہیں آیا۔''

☆☆☆

یہ افسانہ نقوش لاہور، جولائی 1955 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

حسن والے

(1998 میں)

بمبئی

4/نومبر 1998

میری پیاری سہیلی نِکی!

آسمان کی وسعتوں میں لہراتی ہوئی لیلائے شب کی زلفوں میں ستاروں کے دمکتے ہوئے موتی آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ کیسا رومینٹک سماں ہے! ایسے کیف آگیں لمحوں کا اس سے بہتر مصرف کیا ہوسکتا تھا کہ میں قلم ہاتھ میں لے کر تمھیں چٹھی لکھنے بیٹھ جاؤں...... اور موضوعِ سخن اک گلفام ہو!

ہماری تمھاری کوئی بات ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر تم نے میرا 'حساب' رکھا ہوگا تو فوراً سمجھ جاؤ گی کہ یہ میرا دسواں گلفام ہے۔ یہ لکھتے لکھتے ایک بات سوجھ گئی۔ سنو گی تو پھڑک اٹھو گی— میرا ارادہ ہے کہ گلفاموں کی مقررہ تعداد تک پہنچ کر سلور جوبلی منائی جائے۔ اس موقع پر اپنی سب سکھیوں کو مدعو کروں گی اور مسلسل تین دن تک جشنِ بہاراں منایا جائے گا۔

توبہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہر لڑکی کو مجبوراً دلہن بن کر کسی ان جانے، ان دیکھے مرد کے گھر میں عمر بھر کے لیے اس کی داسی بن کر رہنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال کا تصور کرتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اب بھی ملک کے پس ماندہ اور غیر مہذب افراد یہی کرتے ہیں۔

ہائے! ان بھول بھلیّوں میں قبائے گلفام کا دامن بھی چھوٹا جا رہا ہے...... آج سے لگ بھگ ایک ماہ پہلے جب گلفام نمبر 9 نے دستِ تعاون کھینچ لیا تو میری حالت غیر ہوگئی۔ اپنے مخصوص Psychiatrist کے ساتھ مسلسل Sittings کرنی پڑیں۔ عجب نہیں کہ اب تک میری حالت ویسی ہی رہتی، لیکن اتفاق سے مقدر کا ڈوبا ہوا ستارہ برسرِ بام آگیا۔ یعنی ایک گلفام کے جام نگاہ سے تیر نگاہ ٹکرا گیا اور لحہ بہ لحہ طبیعت سنبھلنے لگی۔ حلقۂ سہیلیاں نے اس کا سارا Credit اس Psychiatrist کو دیا۔ میں نے بھی تردید نہیں کی۔ آخر مہذب و متمدن سماج کے افراد ہیں۔ شرافت اور شرم و حیا کا تقاضا بھی تو یہی ہے۔

......لو! معاً سر پھٹنے لگا۔ ڈاکٹر کا فرمان ہے کہ یہ سر کا درد بعض نفسیاتی وجوہ سے ہوتا ہے۔ ہم اشرف المخلوقات ہیں۔ اس لیے ہماری نفسیات بھی انتہائی پیچ در پیچ ہے۔ میں نے نفسیاتی گتھیوں کو سمجھنے یا سلجھانے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ کون اس کھسیلن میں پڑے۔

آج کل 'پی پی' کی جو ٹکیاں ایجاد ہوئی ہیں انھیں دنیائے طب میں معجزے کا مقام حاصل ہے۔ در حقیقت یہ ٹکیاں بھی Trainquillisers کی فیملی میں سے ہیں، لیکن بے حد لطیف صورت میں صرف دو ٹکیاں کھا لینے سے درد کا احساس ختم ہوجاتا ہے اور نیند آنے لگتی ہے۔

اس وقت فوراً 'پی پی' کی ٹکیاں استعمال کرنی پڑیں گی، ورنہ میرے سر کے ٹکڑے اڑ جائیں گے۔ سوچا تھا کہ طویل چٹھی لکھوں گی لیکن اب تو یار زندہ صحبت باقی؟ کہہ کر چٹھی کا اختتام کرنا پڑے گا...... کہاں ہیں 'پی پی' کی ٹکیاں؟ اوہ! یہ رہی شیشی!

سردست الوداع......

تمھاری اپنی......پنی

پونا، 6 نومبر 1998

میری پیاری وتّی

کل میری بمبئی کی ایک سہیلی بنّی کی چٹھی آئی تھی۔ سازِ زندگی کے بعض تاروں کو اس نے اس ادائے لطیف سے چھوا کہ اب تک میں لذت انگیز کسک کا احساس کر رہی ہوں۔ اب تو کسی تعلیم یافتہ اور مہذب خاتون کو شادی کی غلامی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مرد تو خیر پہلے ہی سے آزاد تھے۔ عورتوں کی قسمت پر بہار تو اب آئی ہے۔ وائے نصیب! صرف بچے حاصل کرنے کے لیے رشتۂ ازدواج کے مصائب قبول کرنے پڑتے تھے۔ اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ ہر ایک صفِ اوّل کے بچہ ساز، ادارے سے اپنی پسند کے رنگ روپ اور خط و خال کا بچہ یا بچی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بے کار زحمت میں مبتلا ہونے کی کسی عورت کو حاجت نہیں رہی۔ کون جانتا تھا...... میرا مطلب ہے کہ آج سے بیس پچیس سال پہلے تک کون جانتا تھا کہ انسانی بچے لیباریٹری میں تیار کیے جا سکیں گے......

اونہہ! میں بھی کن خیالات میں بہہ نکلی۔ حالانکہ سرِ دست بچے کا خیال میرے ذہن سے کوسوں دور ہے۔ البتہ گلفام کا تصور دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ واہ! کیا ہی موزوں لفظ کا استعمال کیا ہے میری سہیلی بنّی نے! میرے دل کے ویرانے میں خیمہ زن ہو کر ایک گلفام نے اس ویرانے کو باغِ ارم میں بدل دیا ہے۔ کیا بتاؤں اس سے پہلے والے گلفام کو بھلا ہی نہیں پا رہی تھی۔ بڑا ہرجائی نکلا وہ......

تمھیں یہ جان کر تعجب ہوگا کہ پورے دو مہینوں تک میرے نازک دل کے نہاں خانوں میں اُسی ہرجائی کی شمعِ محبت روشن رہی۔ دو مہینے...... ذرا غور تو کرو کتنی طویل مدت ہے۔ بس یہی فرق ہے عورت اور مرد کی محبت میں۔ مرد تو دو مہینے کیا، دو دنوں میں اُوب جاتا ہے۔ دشتِ وفا میں عورت کا دم بس غنیمت ہے لیکن اس خلوص و وفا کی جو قیمت عورت کو ادا کرنی پڑتی ہے وہ بس ہم عورتیں ہی جانتی ہیں......

دورہ!

پچھلے دو اڑھائی برس سے مجھے عجیب دورے پڑنے لگے ہیں۔ آج تک ان کا سبب

معلوم نہ ہوسکا۔ ہمارے خاندانی ڈاکٹر صاحب کی رائے میں یہ دورے بالکل قدرتی اور نارمل ہیں۔ انھیں مرض سمجھنا غلط ہے......

میرے ہاتھ سے قلم چھوٹا جارہا ہے۔ بجلی کی گھنٹی دبارہی ہوں۔ کوئی آئے...... اور مجھے انجکشن لگائے...... اُف!...... الوداع......

ہمیشہ تمھاری — نِگّی

کلکتہ: 9 نومبر 1998

جان سے پیاری جِمّی!

ابھی ابھی نِگّی کی چٹھی ملی۔ اس کے دورے والے مرض کے بارے میں پڑھ کر دل بیٹھا جارہا ہے۔ دھیان بٹانے کے لیے تمھیں یہ خط لکھ رہی ہوں۔

مجھے بھی شک ہونے لگتا ہے نِگّی کے ڈاکٹر کی رائے پر۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میں نے پچھلے دنوں مشہور ماہرِ نفسیات ڈاکٹر دھون کی ایک کتاب اسی موضوع پر پڑھی ہے — شاید تمھیں معلوم نہیں کہ نِگّی کو دورے پڑنے لگے ہیں۔ اس کا فیملی ڈاکٹر سمجھتا ہے کہ یہ کیفیت بالکل نارمل ہے۔ اسے مرض نہ سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر دھون نے لکھا ہے کہ عورت کا بچے کو جنم دینا جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے بہت ہی اہم عمل ہے۔ آج کل عورتوں کے دماغی امراض کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس قدرتی عمل سے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔ غیر مہذب، عورتیں بچے جننے سے نہیں گھبراتیں، وہ دماغی امراض میں مبتلا نہیں ہوتیں۔

خدا جانے حقیقت کیا ہے!

ڈاکٹر دھون کے دلائل نے مجھے ڈانواڈول سا کردیا ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی مردِ میداں، ڈاکٹر دلائل سے ڈاکٹر دھون کو غلط ثابت کردے گا۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ خود میری دماغی الجھنوں اور اختلاجِ قلب کا سبب خدانخواستہ وہی ہے جو ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے۔

چھوڑو جی ان باتوں کو! ابھی تو اپنی مزے میں کٹتی ہے، آگے کی خدا جانے۔ آج کل بڑے قاتل سے واسطہ پڑا ہے۔ ملتا بھی ہے جی بھر کر اور پھر تڑپاتا بھی ہے جی بھر کر کبھی ستارۂ صبح کی طرح طلوع ہوجاتا ہے اور کبھی ہفتوں صورت نہیں دکھاتا۔

میں مزے میں ہوں۔ بس کبھی کبھی اَن جانی کیفیت کے تحت دل ناامید و پریشاں ہوجاتا ہے۔ تم اپنی لکھو۔ میں اور کچھ نہیں لکھ پا رہی۔ بالکل نڈھال ہو رہی ہوں۔ اختلاجِ قلب بھی ہونے لگا......

تمھاری اپنی......دنّی

دارجلنگ: 16/نومبر 1998

جانِ جنّی، میری پنّی!

مرتے مرتے بچی، لیکن تمھارا ایک بھی محبت نامہ نہ آیا! مجھے بھلا ڈالنے کے درپے ہو گیا؟ لیکن یاد رکھو، ایک دن تمھاری جنّی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ پھر تم کفِ افسوس ملو گی۔ میری حالت بعض اوقات بہت تشویشناک ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کی سمجھ میں کچھ بھی تو نہیں آ رہا ہے...... ہماری سہیلی دنّی نے کسی ڈاکٹر دھون کی کتاب کا حوالہ دے کر عجیب باتیں لکھی ہیں، بلکہ احمقانہ باتیں لکھی ہیں۔ کیا تم نے اس ڈاکٹر کی یہ کتاب پڑھی ہے؟...... مجھے مل بھی جائے تو میں ایسی کتاب ہرگز نہ پڑھوں۔

جو تکلیف ہے سو ہے ہی— لیکن ڈیر! کچھ نہ پوچھو۔ گلفام جاتا ہے، گلفام آتا ہے۔ دل مسرور ہے۔ البتہ مسرت کے ان لمحوں کی حیثیت جزیروں کی سی ہے۔ دماغ دھواں دھواں رہتا ہے۔ اب تو دور افق پر...... زوالِ حسن و شباب کے واضح آثار بھی نظر آنے لگے ہیں۔ احساسِ تنہائی سے جی ڈوبنے لگتا ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت دل سے ایک آواز اٹھتی ہے کہ کیا یہ گلفام رفتہ رفتہ کنارہ کش ہو جائیں گے؟

کہو، پیاری سکھی! کیا یہی حشر ہوگا؟

میں نے احساسِ تنہائی سے گھبرا کر ایک مشہور بچہ ساز ادارے سے ایک عدد بچہ آرڈر دے کر تیار کروایا تھا۔ کچھ دنوں تک تو یہ بچہ بہت پیارا لگا۔ دل بہلا رہا، لیکن پھر بے گانہ پن محسوس ہونے لگا۔ دل بار بار پوچھتا کہ یہ تمھارا کیا لگتا ہے؟

پریشان ہو کر اور تنگ آ کر سوچ رہی ہوں کہ اس بچے کو سرکاری یتیم خانے میں داخل کرادوں۔

لو! میں نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب تم جواب میں تاخیر مت کرنا۔

تمھاری گرویدہ — جنّی

نئی دلی، 7/دسمبر 1998

مائی ڈیر یونگا!

تمھیں چارج دیتے وقت میں نے سوچا بھی نہ تھا بعد کے کچھ دنوں میں ہماری اتنی بے تکلفی ہو جائے گی۔ لکھنؤ سے رخصت ہوتے وقت تم سے مل بھی نہ پایا۔ معافی چاہتا ہوں۔ بہت جلدی میں تھا۔ یہی نہیں، بلکہ 'تم' کہہ کر مخاطب ہو رہا ہوں۔ برا تو نہ مانو گے؟

دفتر کا کام تو میں نے سمجھا دیا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمھیں بڑے بڑے شہروں کے دورے بھی کرنے پڑیں گے — تمھیں رنگین مزاج پاکر کچھ پتے کی باتیں بھی بتا دوں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ ہر بڑے شہر میں بتانِ حسن سے بھی واسطہ رکھ سکتے ہو۔ آخر سفر کی بوریت دور کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ شغل تو ہونا چاہیے۔ چار عدد بتوں کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ وہ حسین ہیں، طرح دار ہیں، دل پھینک ہیں۔ عشق و محبت کے دل دادہ۔ غرض انتہائی چیٹ پٹی عورتیں۔ یہ حسینائیں اکثر بیمار رہتی ہیں۔ لیکن ان کے امراض جسمانی نہیں، نفسیاتی ہیں۔

بمبئی میں چنّی، پونا میں پکی، کلکتہ میں دنّی اور دارجلنگ میں جنّی رہتی ہے۔ ان سب کا اتا پتا الگ کاغذ پر لکھ رہا ہوں تاکہ سند رہے، نیز بوقت ضرورت کام آئے۔

ان سب کی عادت یہ ہے کہ عاشقانِ رفتہ کا ذکر انتہائی رنج و محن سے کرتی ہیں۔ شاید مجھے بھی موضوعِ سخن بنائیں۔ تم پوری ہمدردی سے ان کی باتیں سننا، لیکن یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ ہم تم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

دوست! ان تتلیوں کی ملاقاتوں اور پیار کی گھاتوں سے مجھے مطلع کرتے رہنا۔

تم خود ان بتوں کے زیرِسایہ چاہے زندگی گزار دو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تمھارے بچوں اور بچیوں نیز بیوی پر ان کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے پائے۔

تمھارا اپنا — ڈونگا

☆☆☆

یہ افسانہ بیسویں صدی، دہلی جنوری 1969 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

تیاگ

جبل پور

4 اپریل 1998

پیارے رتن لعل جی!

کیا آپ کو اب بھی اس گل رخ اور شعلہ خو کی یاد آتی ہے جس کا نام سنیہہ ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے وہ سولہ برس کی تھی اور حضور باون سال کے ہو چکے تھے۔ یعنی اگر اب آپ کے پاؤں قبر میں لٹک رہے ہیں اس وقت چشم بد دور، آپ قبر کی جانب قدم بڑھا چکے تھے۔ پھر بھی آپ عاشق باون گزے تھے۔ زندگی کے اس خزاں رسیدہ موسم میں آپ کی حسن شناس نگاہ مس سنیہہ پر پڑی اور پھر لوٹ کر نہ آئی۔ جیسے اس لالہ رخ پر قربان ہو گئی ہو!

پہلا زمانہ ہوتا تو وہ تند خو کافر ادا کسی بالا خانے کی رونق بڑھاتی لیکن زمانہ بدل چکا تھا۔ سنیہہ بائی جی کے بجائے سوسائٹی گرل کہلاتی تھی۔ اس نے رقص و موسیقی میں دسترس حاصل کی، مجرا کرنے کے لیے نہیں، کلا، یعنی فنِ لطیف کی خدمت کرنے کے لیے۔ کلچرل پروگراموں کی جنم داتا کانگریسی سرکار کبھی کی دم توڑ چکی تھی۔ تاہم اس قسم کے پروگرام اب بھی زندہ تھے۔ ایسے ہی ایک کلچرل پروگرام میں آپ نے اس کم سن فتنے کو دیکھا اور سو جان سے

فریفتہ ہو گئے۔

سنیہہ بھی تربیت یافتہ لڑکی تھی اور آپ ایسے فنونِ لطیفہ کے قدر دانوں کی قدر کرنا خوب جانتی تھی۔ چنانچہ آپ کے لرزتے بازوؤں میں خوب خوب بجلیاں لہرائیں۔ جو کچھ ہوا سو دنیا جانتی ہے...... یا جانتی تھی۔ اب یہ سب کچھ قصہ پارینہ ہو چکا۔

ہاں تو پہلے کا زمانہ ہوتا تو آپ اب بھی کسی بالا خانے پر چلمیں بھرتے نظر آتے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ آپ کی صحت، بگڑ گئی اور اس برق رفتار حسینہ کی تکمیل مضبوط تر ہاتھوں میں چلی گئی۔ بھلا ہوا جو چند برس آبرو اور دولت لٹانے کے بعد تھوڑی سی اراضی دبا گئے جس کے بوتے پر اب آپ کی دال روٹی چل رہی ہے اور آپ دہلی سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر رانی کھیت میں بیٹھے اپنے پھلوں کے باغوں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ادھر سنیہہ کے بارے میں بھی سنا گیا ہے کہ مخصوص محفلوں میں آپ کا ذکرِ خیر چل نکلے تو وہ غنچہ دہن آپ کی تعریف و توصیف کے گیت گاتے نہیں تھکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب بھی جہہِ دل سے آپ کی شکر گزار ہے۔ اس لیے کہ دوسرے ناکام عاشقوں کی طرح آپ نے بات کا بتنگڑ نہیں بنایا اور آپ کی وہ بندی بہ حسن و خوبی ادھر سے اُدھر منتقل ہو گئی۔

یہاں تک میرا خط پڑھ لینے کے بعد آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے۔

کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے

درست! سو (نئے) پیسے درست!

اب اصل موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اطلاعاً گزارش ہے کہ اب بھی سنیہہ کا شمار سوسائٹی کی حسین ترین خواتین میں ہوتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے اس کے حسنِ عالم تاب کو دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ جو کچھ سنا وہ پہلے آپ کی زبانی اور اب دوسروں کی زبانی کہنے والے کہتے ہیں جس طرح شمع بجھنے سے پہلے لو دینے لگتی ہے اسی طرح وہ شمعِ حسن بھی اپنی چرم سیما یعنی نقطۂ عروج پر جگمگا رہی ہے۔

میرے ایک دوست ہیں، سیٹھ جسونت رائے۔ آج کل وہ دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ آپ نے تو دہلی نہ جانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ورنہ آپ دیکھتے کہ سیٹھ موصوف نے وہاں محل نما

کوٹھی کھڑی کر لی ہے۔قسمت کے ایسے دھنی ہیں کہ مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں تو سونا بن جاتی ہے۔ سچ مچ بھگوان ان پر بے حد وحساب مہربان ہے۔لیکن سنا ہے کہ اُن کے دل کو ایک المیہ گھُن کی طرح کھائے جارہا ہے۔

پچھلے دنوں دہلی سے میرے ایک دوست جبل پور آئے۔ان کی زبانی پتہ چلا کہ آج کل آپ کی چہیتی رائے صاحب کے اکلوتے نوجوان بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔اسی لیے رائے صاحب کی راتوں کی نیند حرام اور دن کا چین غائب ہے۔

حضور والا یہی پس منظر ہے۔اس خط کا! رائے صاحب نے خود مجھے اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ میں اس سلسلہ میں ان کی کچھ نہ کچھ مدد کرسکتا ہوں۔لیکن میری یہ دلی خواہش ہے کہ وہ اس مصیبت سے چھٹکارا پاجائیں۔خودسر سلیمہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔البتہ اس کے دل میں آپ کا احترام باقی ہے۔مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اسے دو سطریں لکھ دیں گے تو وہ آپ کی بات کو ٹال نہ سکے گی۔

رائے صاحب محض میرے دوست ہی نہیں ہیں، دیرینہ مہربان بھی ہیں۔ان کے ذریعہ مجھے کاروباری منافع حاصل ہوتا رہتا ہے۔ ویسے بھی انھوں نے بڑی ہی بے لوث طبیعت پائی ہے۔عجب مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ان کی مدد کرنا عین ثواب کا کام ہے۔

آپ کا

رام راج

رانی کھیت

20/اپریل 1998

میری دیرینہ دلربا، پیاری سلیمہ

پہلے اس خط کے آخر میں میرا نام پڑھ لو۔ضرور سوچوگی کہ باسی کڑھی میں یہ ابال کیسا! میری طرز تخاطب سے تمھارے اس بھرے گداز ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ کا نمودار ہونا بھی ناگزیر ہے۔اپنی اس حرکت کی وضاحت بلاشبہ مجھ پر واجب ہے۔

مانا کہ مدتِ دراز سے میدان عشق سے کنارہ کش ہو چکا ہوں لیکن خود ہی کہو کہ تم ایسے حسین کو غیر حسین انداز سے کیسے مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ سامانِ عیش و عشرت کیے ہمیں ایک یگ بیت گیا۔ ہم دیدہ دانستہ الگ ہوگئے۔ لیکن یہ جدائی بھی قابلِ تحسین شان سے خالی نہیں تھی۔ میرا حال بالکل ویسا ہی تھا جیسے کہ کوئی خلیفہ (پہلوان) لنگر کھول کر اپنے چیلے چانٹوں کے حق میں اکھاڑے سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ کیسے تم پر تن من دھن نچھاور کرنے کے بعد بندہ گوشہ گیر ہوگیا۔ تم ایسی زیرک حسینہ یہ بات بھی بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ الگ رہ کر بھی تمھیں اپنے دل سے بن باس نہ دے سکا حسن کے حضور میں عشق ایسی جرأت کرے بھی تو کیسے؟ یقین کرو کہ دل کا کلیسا ایک ہی صنم کے دم سے آباد ہے اور منور ہے۔ دور سے تمھارے معرکوں کی خبریں سن سن کر مسرور ہوتا رہا۔ رمز شناس حضرات کا قول ہے کہ مرد اپنی آخری اور عورت اپنی اوّلین محبت کو بھلانے سے قاصر ہے۔ بندے کو تمھارے حضور اوّلین اور صادق ترین عاشق ہونے کا فخر حاصل ہے......لو اب اصل مدعا از خود سامنے ہے۔

مجھے خبر ملی ہے کہ آج کل تمھارے حسن و ادا کا سیل ایک ایسے کم سن اور نا پختہ نوجوان کی طرف رواں دواں ہے جو ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی کا اکلوتا چشم و چراغ ہے۔ میری مراد سیٹھ جسونت رائے کے صاحب زادے سے ہے۔ میں نے رائے صاحب اور ان کے فرزندِ ارجمند کو کبھی نہیں دیکھا۔ براہِ راست ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ میں اُن کے ایما سے تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ یہ خبر مجھے اپنے ایک دوست کی وساطت سے ملی جو جبل پور میں رہتے ہیں۔ وہ حضرت میرے جگری دوست ہیں۔ انھیں کے اصرار سے میں یہ جرأت کر رہا ہوں۔ اگر تم اس نوجوان کو نظر انداز کردو تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ میں اپنے جبل پور والے دوست کا یہ کام نہ کر پایا تو مجھے سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک بار پھر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اس میں رائے صاحب کا ہاتھ بالکل نہیں ہے۔

اے ملکۂ حسن! تجھے کمی بھی کس بات کی ہے۔ ہمارے اس سوشلسٹ سماج میں، چشم بد دور، لکھ پتیوں کی کمی نہیں ہے۔ تم اک نگاہِ غلط انداز جس پر ڈالو وہی مطیع ہوجائے۔

پرانی محبت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اپنے قلندر کی پھیلی ہوئی جھولی سے رخ پھیر لینے کی کوشش مت کرنا۔

تمہارا غلام ابنِ غلام

رتن (بے آب)

دہلی

24/اپریل 1998

اے شہنشاہِ عشق!

بندی تسلیم عرض کرتی ہے محبت نامے کے لیے شکریہ! آپ کا فرمان اور بندی سرتابی کرے؟ توبہ!

کیا عرض کروں، آپ کا نوازش نامہ پا کر دل کی کیا کیفیت ہوئی۔ رومانی زندگی کا بابِ اوّل اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ عود کر آیا اور میں دم بخود کھڑی رہ گئی۔ مکرر شکریہ!—

البتہ موضوع آبگینے کی طرح نازک تھا۔

ہاتھ لگائے نہ بنے

جب میں آپ کا خط پڑھ رہی تھی اس وقت صرف ایک بزرگ خضر صورت میرے نزدیک تشریف فرما تھے۔ انھوں نے میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہو کر بے اختیار سوال کیا۔ کیوں، خیریت تو ہے نا؟''

دیرینہ ملاقات نہ ہوتے ہوئے بھی میں ان سے کافی مانوس ہو چکی تھی۔ چنانچہ بلا تامل سارا قصہ از اوّل تا آخر کہہ سنایا۔ وہ بولے۔ ''مسئلہ تو ٹیڑھا ہے۔ اس کا حل ایسا ہونا چاہیے کہ سانپ مر جائے پر لاٹھی نہ ٹوٹے''

میں نے جواب دیا۔ ''جی ہاں۔ ذرا غور فرمایئے کہ اس قدر مال دار چوزے کو ہاتھ سے کیسے جانے دوں۔ اس کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ اگر میں چوک گئی تو یہ سنہرا موقع ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتا رہے گا— لیکن جس محسن نے یہ فرمائش کی ہے اس کا دل

بھی نہیں توڑنا چاہتی......"

ان بزرگ نے کافی غور وخوض کے بعد سوال کیا۔ "یہ تو بتایئے کہ اس نوجوان سے نوبت کہاں تک پہنچ چکی ہے؟"

"حضور ابھی تو اسے تار نگاہ پر نچا رہی ہوں۔ ابتدائے عشق میں ایسے اناڑیوں کو ڈھیل دینے کے حق میں نہیں ہوں۔ ابھی تو وہی حال ہے۔

آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوگئے
تم ہمارے ہم تمھارے ہو گئے

"شعر کچھ غلط معلوم ہوتا ہے۔ خیر!— میں پوچھتا ہوں کہ آپ برخوردار کو چھوڑ کر ان کے والدِ بزرگوار کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتیں؟"

یہ سن کر ایک بار تو میں سناٹے میں آگئی۔ وہ پھر کہنے لگے۔ "اگر وہ نوجوان ہونق آپ کے پیار میں بغاوت کر بیٹھا تو بوڑھا اسے ساری دولت سے محروم کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کے ہاتھ کیا لگے گا؟"

بات تو ٹھیک تھی۔ میں نے متفکر ہوکر پوچھا۔ "وہ بوڑھا گھاگ میرے چنگل میں پھنسے گا بھی؟"

"اجی بوڑھا طوطا اور جلدی ہی پھنسے گا! جو وہ پھنس گیا تو سارا مال اپنا ہوجائے گا۔ ایسے بدکردار چھوکرے کا باپ بھی متقی و پرہیزگار نہیں ہوسکتا۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے کچھ کچھ قائل ہوتے ہوئے کہا۔

"اس بوڑھے کو یہ بھی تو سمجھایا جاسکتا ہے کہ جوان لڑکے کو تباہی سے بچانے کے لیے بڑھاپے کو تیاگ کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

میں خوش ہوکر بولی۔ "خیال تو معقول ہے۔"

"بالکل معقول ہے! اس طرح آپ کے رانی کھیت والے مہربان کی فرمائش بھی پوری ہوجائے گی اور مال بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے گا۔"

میں نے گرم جوشی سے کہا۔ "لیکن رائے صاحب کو اس تیاگ پر آمادہ کرنے کے

لیے مفصل پلان بنانا پڑے گا۔"

انھوں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب یوں ہو جائے گا۔"

میں شاخِ گل کی طرح لپک کر پہلی بار ان کے سینے سے لگ گئی اور بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سرکار! وہ کیسے؟"

انھوں نے پیار سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کیونکہ اس نالائق ہونق کا باپ میں ہی ہوں!!

آپ کے قدموں کی داسی

سلیمہ

☆☆☆

یہ افسانہ بیسویں صدی دہلی، افسانہ نمبر، جولائی 1969 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

بن باس

127، سبھاش روڈ، رشی نگر

22/دسمبر 1966

پیاری رتنا، میری پیاری سکھی،

آج بہت ہی پیاری صبح ہے، بالکل تمھاری مسکراہٹ کی طرح یہ میری بہن کا مکان ہے۔ میں باہر والے کمرے میں بیٹھی تمھیں یہ چٹھی لکھ رہی ہوں...... بلکہ تم سے باتیں کر رہی ہوں۔

یہ چھوٹا سا قصبہ ہے، صاف ستھرا خاموش سا۔ مکان کے چاروں طرف پھلواری بھی ہے۔ ہر جانب ہریالی، تراوٹ اور خوشبو ہی خوشبو ہے۔ بچے اسکول جا چکے ہیں۔ میرے کانوں میں اب بھی ان کی مسرت بھری چیخ چلاہٹ کا رس گھل رہا ہے۔

میں یہاں آ کر بہت خوش ہوں۔ تین روز پہلے کی ہی تو بات ہے جب میں تمھارے ساتھ اپنے کوارٹر میں بیٹھی تھی۔ اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سامنے والے مکان کی ایک گز اونچی چار دیواری کے اوپر بارش میں نہاتا ہوا وہ ہرا بھرا پیڑ دکھائی دے رہا تھا، جس کی دہکتی ہوئی تازہ پتیوں میں سے گہرے لال رنگ کے پھول سر اچھال اچھال کر رقص کر

رہے تھے ہم دونوں بارش شروع ہو جانے پر ہی باہر سے آئی تھیں .... بارش زبردست تھی کہ ہم اچھی طرح بھیگ گئی تھیں۔ ہمارے پانی میں تر کپڑے جسم کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے انگ انگ کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے۔ ہر مکان، ہر سڑک، ہر پیڑ، ہر آنے جانے والا بارش میں بھیگا ہوا اسٹیج کا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے تم سے کہا تھا۔ ''جانتی ہو کہ میں نے مہینہ بھر کی چھٹیاں کیوں کی ہیں۔''

تم پہلے سے ہی تعجب میں تھیں کہ یہ راز کیا تھا۔ تم کچھ جواب بھی نہ دے پائیں کہ میں نے پھر کہا۔

''میں اپنی بڑی بہن کے یہاں جا رہی ہوں، مہینہ بھر اسی کے پاس رہوں گی۔''

تمھاری حیرت میں اضافہ ہو گیا، تم نے کہا ''لیکن پشپا! تم تو کہتی تھیں ...... میرا مطلب ہے کہ تم کہا کرتی تھیں کہ دنیا میں تمھارا کوئی نہیں ہے۔''

اس وقت میں تمھاری اس بات کو ٹال گئی۔ دراصل میری سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں لیکن اب اس راز پر سے پردہ اٹھائے دیتی ہوں۔ جب میں دس برس کی تھی تو میری ماتا جی چل بسیں، وہ میرے پتا جی کی دوسری بیوی تھیں۔ میں انھیں کے بطن سے پیدا ہوئی۔ میرے پتا جی کی پہلی مرحوم بیوی کی ایک بیٹی تھی جو مجھ سے سات سال بڑی تھی۔ اس کا نام آشا تھا۔ میری ماتا جی کا اپنی سوتیلی بیٹی سے بڑا اچھا سلوک رہا، لیکن میں نے کبھی اسے اپنی بہن تسلیم نہیں کیا۔ آشا مجھے بہت چاہتی تھی، لیکن میں اسے سوتیلی بہن سمجھ کر ہمیشہ ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

میری ماتا جی کی موت کے ڈیڑھ سال بعد پتا جی بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ ہم دونوں بہنوں کو یتیم بنا گئے۔ ہم دونوں کا نباہ ناممکن تھا۔ اس لیے میں تو اپنی موسی کے پاس جا کر رہنے لگی اور آشا بھی اپنے کسی رشتے دار کے وہاں چلی گئی، وہیں پر اس کی شادی ہوئی۔ میں نے اس کی شادی میں شریک ہونا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ کبھی ہماری خط و کتابت تک نہیں ہوئی بعد میں میں نے تمھارے کالج میں نوکری کر لی۔

لو! آج تمھیں اپنی جیون کتھا سنا ڈالی۔ رفتہ رفتہ جب میرے خیالات میں پختگی آئی تو دل میں احساس پیدا ہوا کہ آشا ایسی بری تو نہیں تھی۔ اسی دوران آشا کو بھی کہیں سے میرا پتہ معلوم ہوگیا۔ اس نے فوراً مجھے بڑی پیاری سی چٹھی لکھی۔ اس طرح خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میرے دل میں بہن کی محبت جاگ اٹھی۔ یہ خیال کتنا دل خوش کن تھا کہ اس سنسار میں کوئی ایسا بھی تھا جسے میں اپنا کہہ سکتی تھی۔

بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ بہن کے اصرار کے پیش نظر مجھے اس کے پاس رہ کر اپنے ٹوٹے ہوئے رشتے کو استوار کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے مہینہ بھر کی چھٹیاں لے لیں۔

اب سمجھ گئیں تم؟

یہاں پر میری مسرت کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ اگرچہ دیدی مجھ سے بہت زیادہ بڑی نہیں ہے، لیکن اس کے دل میں میرے لیے مادرانہ شفقت موجود ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے مجھے پھر سے ماں کی محبت حاصل ہوگئی ہے۔ افسوس اپنی حماقت کے صدقے کے طویل عرصے تک اس انوکھی محبت سے محروم رہی گویا میں نے دیدہ دانستہ بن باس لے رکھا تھا۔

چٹھی کافی طویل ہوگئی ہے، اب اسے ختم کرتی ہوں۔ ہاں، سفر بہت اچھا کٹ گیا۔ ایک معمولی سا حادثہ بھی ہوا تھا۔ اگر ایک بھلا آدمی نہ مل جاتا تو بڑی پریشانی اٹھانا پڑتی۔

تمھاری اپنی

پشپا

رشی نگر،

27/دسمبر 1966

ڈیر رتنا!

شریر کہیں کی! یہ ٹھیک ہے کہ جس شخص نے میری مدد کی، اسے میں نے بھلا آدمی کہہ دیا۔ اتنی سی بات کا تم نے بتنگڑ بنا دیا۔ اب تم پورا واقعہ سنے بغیر نہیں مانو گی، تو لو سنو!

جھانسی کے اسٹیشن پر گاڑی بدلنے کے لیے مجھے اترنا پڑا۔ دوسری گاڑی کے آنے میں

ابھی دو گھنٹے کا وقفہ باقی تھا۔ میں نے قلی سے کہا کہ وہ میرا سامان ویٹنگ روم میں رکھ دے۔

فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں مسافروں کی تعداد اکثر کم ہی ہوتی ہے۔ اس وقت وہاں صرف ایک آدمی موجود تھا۔ شاید اس پر میری نظر بھی نہ پڑتی، لیکن اندر قدم رکھتے ہی میرا پاؤں کچھ ایسا ٹیڑھا پڑا کہ میں سنبھل ہی نہ پائی۔ موچ تو نہیں آتی، البتہ ٹخنے کی نسیں بری طرح مجروح ہو گئیں اور میں جہاں کی تہاں بیٹھ گئی۔

قلی سے میں نے کہا کہ وہ سامان رکھ دے۔ جب اس اجنبی مسافر نے مجھے ہاتھ بڑھا کر سہارا دینا چاہا، تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ دیکھنے میں وہ تیس بتیس برس کا لگتا تھا۔ لیکن صورت سنجیدہ تھی۔ اس کے ہاتھ بڑھانے میں بھی ایک وقار تھا۔ میں نے چاہا کہ خود بخود چل کر میں کرسی تک پہنچ جاؤں، لیکن مجبوراً اس کے بازو کا سہارا لینا پڑا۔ جب میں آرام کرسی پر بیٹھ گئی تو اس نے پوچھا: ''موچ تو نہیں آئی؟''

میں نے دھیرے سے جواب دیا۔ سوجن تو خاص نہیں ہے لیکن درد کافی ہو رہا ہے۔ نسیں کھنچ گئی ہیں غالبًا۔

یہی بات ہوگی۔

وہ اپنے بیگ میں سے آئیوڈیکس کی شیشی نکال لایا۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہہ پاتی، وہ اکڑوں بیٹھ کر دوا میرے ٹخنے پر ملنے لگا۔

اس کی سنجیدگی کے پیشِ نظر مجھے کچھ بھی کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

چند لمحوں کی مالش کے بعد وہ بولا۔ دوا کی یہ شیشی آپ ہی رکھ لیجئے دو چار بار اور مالش کرنی پڑے گی۔''

یہ سب کچھ اس قدر عجلت میں ہو گیا کہ مجھے زیادہ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔

وہ مجھ سے دور ہٹ کر کرسی پر جا بیٹھا اور ایک فائل کھول کر اس کے ورق الٹنے پلٹنے لگا۔

بس یہی وہ واقعہ تھا جسے تم نے اپنے خط میں اس قدر اچھالنے کی کوشش کی تھی۔

غالبًا تم اس کی شکل و صورت کے بارے میں بھی کچھ، کچھ جاننا چاہو گی۔

کافی حسین تھا وہ! اگر وہ اتنا سنجیدہ نہ ہوتا تو چھبیس ستائیس سال سے زیادہ عمر کا نہ لگتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ دزدیدہ نظروں سے موقع پا کر مجھے دیکھ بھی لیتا تھا۔ مجھے اس کی یہ حرکت زیادہ بری نہیں لگی۔ میں نے سوچا بے چارہ میری طرح کنوارا ہوگا، حسین لڑکی پر نظر ڈالے بنا رہ نہیں سکتا۔

بارہ پندرہ منٹ کے بعد اس کی گاڑی آگئی، اس کا سامان غالباً قلی کی نگرانی میں پلیٹ فارم پر رکھا تھا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر کی جانب چل دیا — دروازے پر پہنچ کر وہ رکا، مڑ کر مجھ پر اچٹتی ہوئی ایک نظر ڈالی اور پھر قدرے ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''معاف کیجئے میں نے آپ کو شاید...... میرا مطلب ہے آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔

اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہم عورتیں مردوں کے مقابلے میں بھولی تو ضرور ہوتی ہیں لیکن اتنی احمق نہیں ہوتیں جتنا کہ یہ مرد ہمیں سمجھتے ہیں۔ کتنا گھسا پٹا اور فضول کا بہانہ بنایا تھا اس نے...... تاہم میں اسے معاف کرتی ہوں۔

تمھاری

پشپا

رشی نگر

جنوری 1967

پیاری رتنا!

اُف! سچ بولنا بھی پاپ ہے کیا؟...... تم نے اپنی چٹھی میں کیسی کیسی چٹکیاں لی ہیں یہ تمھاری سراسر زیادتی ہے، لیکن جاؤ، میں نے تمھیں معاف کر دیا۔

سکھی ایک مرتبہ پھر اسی بھیگی ہوئی دوپہر کا تصور کرو، جس کا ذکر میں نے اپنی چٹھی میں کیا تھا اس وقت نہ صرف ہمارے کپڑے اور جسم گیلے تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ نمی ہڈیوں تک سرایت کر گئی تھی۔ گیلے کپڑے تبدیل کئے بغیر ہم نے کافی تیار کی اور کھڑکی کے پاس بیٹھ

کر اس کی چسکیاں لینی شروع کر دی تھیں۔ کتنا لطف آ رہا تھا۔ تر بتر کپڑوں میں لپٹے ہوئے جسم کے اندر گرما گرم کافی کا احساس بیان سے باہر ہے۔

تم نے کہا۔ پشپا تمھارے رخساروں پر ہمیشہ گلال سا اڑتا رہتا ہے لیکن اس وقت یوں لگ رہا ہے جیسے بارش کی بوندوں نے اس گلال کو تمھارے رخساروں پر پختہ کر دیا ہو......

میں بری طرح جھینپ رہی تھی، اور تم تعریف و توصیف کے پھول برسائے جا رہی تھیں۔ آخر تم نے رائے دی، بلکہ اصرار کیا کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔

اس وقت تمھاری اس بات پر، سردی کے باوجود میرے جسم میں ایک شعلہ سا لپک اٹھا۔ اب دیدی کی بھی یہی رائے ہے۔

کل ہی کی بات ہے کہ ہم دونوں بہنیں قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھیں۔ دیدی نے کہا ہم دونوں کی شکل کس قدر ملتی جلتی ہے۔ ہماری آنکھیں ہونٹ، دانت بالکل پتا جی سے ملتے جلتے ہیں۔ ہم دونوں بہنیں ہی تو لگتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ تم ابھی کھلتی ہوئی سی کلی لگتی ہو۔"

انھوں نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر میرا منہ چوم لیا۔

میں شرما گئی وہ پھر بولیں۔ "اب تمھاری شادی جلد از جلد ہو جانی چاہیے بڑی بہن کے ناتے میرا یہ فرض ہے کہ میں تمھاری شادی کی فکر کروں۔ شرماؤ نہیں اگر تمھارے دل میں کسی کے لیے جگہ بن چکی ہے تو بھی مجھے بتا دو۔"

یہ بات سن کر میرے دل میں پھول ہی پھول کھل گئے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تم تو یہی کہو گی دیدی کو من کی بات بتا دو — ہٹ، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔

اگر دل کی بات دیدی کو بتا بھی دوں تو دیدی میرا مذاق اڑائیں گی۔ نہ میں اس کا نام جانتی ہوں، نہ اس کا پتہ معلوم ہے۔

تمھاری اپنی

پشپا

رشی نگر، 7 جنوری 1967

ڈیر رتنا!

ناشتہ کرنے کے بعد تمھیں چٹھی لکھ رہی ہوں۔ دیدی کے بچے پھلواری میں چلا چلا کر کھیل رہے ہیں۔

تمھاری یہ شکایت بجا ہے کہ میں نے جیجا جی کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں لکھا۔ بات یہ ہے کہ......

لو، پھلواری سے بچوں کا شور اور بھی زیادہ ہو گیا ہے، وہ پتا جی، پتا جی کہہ کر چلائے جا رہے ہیں۔ یہی "پتا جی ہیں، سردست چٹھی ادھوری چھوڑ رہی ہوں۔ بعد میں اسے مکمل کروں گی۔

چٹھی لکھنا بند کر کے میں ایک دم سنگھار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی، جلدی سے بالوں کو درست کیا، ساڑھی کا آنچل سنبھالا، کیوں کہ دیدی جیجا جی کو لے کر اسی طرف آ رہی تھیں۔

پلٹ کر دیکھا......تو دم بخود رہ گئی!

ہاں رتنا! وہ باہر دورے پر گئے ہوئے تھے، آج ہی لوٹ کر گھر پہنچے۔ اتفاق کی بات کہ گھر میں ان کا کوئی فوٹو بھی نہیں تھا۔ میں نے اب تک ان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ تمھیں ان کے بارے میں لکھتی بھی تو کیا؟

آنکھیں چار ہوتے ہی وہ بھی لحہ بھر کو متعجب ہوئے، مگر فوراً مسکرا کر بولے۔ تو رہیں ہماری پشپا رانی!"

رات ہو چکی ہے، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ جیجا جی بہت نیک انسان ہیں۔ مجھ سے ان کا برتاؤ بالکل دیدی جیسا ہے۔

لیکن سکھی! حالات کے اس اتفاق نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔ میں بے حد شرمسار

ہوں۔

دل پر بھی سناٹا چھا گیا ہے۔

اب میں یہاں ضرورت سے ایک پل زیادہ نہیں رک سکتی۔تم مجھے تار دے کر کسی حیلے سے بلوا بھیجو۔میں فوراً لوٹ آؤں گی۔

تاخیر مت کرنا، یہاں پر ایک ایک لمحہ گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے ایک بار پھر بن باس کا حکم مل گیا ہے۔

تمھاری اُداس

پشپا

☆☆☆

یہ افسانہ ماہنامہ 'روبی' دہلی مئی 1972 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔کلیات میں پہلی بار شامل کیا جارہا ہے۔

ایلی! ایلی!!

لگ بھگ پینتیس برس پہلے کا پنجاب—

یہ اسی دور کے پنجاب کی ایک سچی کہانی ہے۔

ان دنوں پنجاب کے دیہات میں بہت سی عام کہاوتوں میں سے ایک کہاوت یہ بھی تھی کہ مرد ہمیشہ شراب یا عورت کے باعث ہی پولیس کے چنگل میں پھنستا ہے۔

کم از کم ورسا سنگھ کے معاملے میں یہ کہاوت واقعی درست ثابت ہوئی۔

ایک پورن ماشی کی رات کو وہ اپنے گاؤں سے دس کوس دور موضع ٹنڈے گورو میں اپنی محبوبہ روپی سے ملنے کے لیے گیا۔

یہ ملاقات گاؤں سے باہر رہٹ کے قریب والے طویلے میں ہوئی۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے کھیت، رہٹ اور طویلہ روپی کے باپ کی ملکیت تھے۔ پریمی سے ملاقات کا یہ سنہرا موقع تھا۔ اس کا باپ اور بھائی ریڑھی (یعنی صندوق نما گھوڑا گاڑی) میں شہر گئے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے پہلے ان کے لوٹ آنے کا امکان نہیں تھا۔ پارو، روپی کی سہیلی ہی نہیں منہ بولی بہن بھی تھی۔ اس قسم کی ملاقاتیں کرانے میں اسی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ اب بھی جب کہ دو محبت کے مارے دل طویلے کے اندر دکھ سکھ کی باتیں کر رہے تھے، باہر پارو رہٹ کی گادھی

(گدی) پہ بیٹھی بیلوں کو ہانک رہی تھی۔ رہٹ کے اوپر پھیلے ہوئے برگد کے پیڑ کی چھتر چھایا تھی۔ ذرا فاصلے پر صرف رہٹ کی روں روں کا شور سنائی دیتا تھا۔ پارو نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ اس کی بڑی بڑی اور تیز آنکھیں پھیلی ہوئی چاندنی میں دور دور تک دیکھ سکتی تھی۔ درحقیقت وہ اسی لیے رہٹ کی گادھی پر بیٹھی ہوئی بھی تھی۔

دو ڈھائی فرلانگ دور گاؤں گوبر کے بڑے سے ڈھیر کی طرح دکھائی دے رہا تھا، دیواروں کے سائے تلے نظر نہ آنے والے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

پریمیوں کا جوڑا تو مگن تھا ہی، لیکن پارو بھی کسی نامعلوم جذبے کے تحت گنگنا رہی تھی— یکایک اس نے گنگنانا بند کر دیا اور وہ ٹکٹکی باندھ کر مغرب کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک گھوڑ سوار تھا اور اس کے ہمراہ دو آدمی اور بھی تھے۔ چند لمحوں کے بعد صورتِ حال واضح ہوگئی، وہ تینوں پولیس کے آدمی تھے۔

باتوں باتوں میں ایک روز ورسا سنگھ کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ پولیس اس کی تاک میں ہے چنری سنبھالتے ہوئے پارو رنگین چڑیا کی طرح لپک کر طویلے کے اندر گھس گئی۔ اسے دیکھتے ہی۔ ورسے نے پیار سے دبوچے ہوئے۔ روپی کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور ابرو چڑھا کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے، پارو؟''

''پلس!''

پولیس کا نام سنتے ہی روپی کی روشن پیشانی ملگجی سی ہوگئی۔ مگر اس کے پریمی نے فخر سے نتھنے پھلا لئے۔ اگر کسی قابلِ فخر جوان کی پولیس سے چھیڑ چھاڑ نہ ہو تو یہ اس کے لیے ہتک کی بات تھی۔

''کیا وہ تمھیں پکڑنے کے لیے آ رہے ہیں؟ روپی نے سرگیں آنکھیں ورسے کے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا۔

''تو کیا ہوا؟ تم کیوں گھبرا گئیں؟ میں نے ڈاکہ نہیں ڈالا، کسی کا قتل نہیں کیا۔''

''تو پھر؟''

''پچھلے بیساکھی کے میلے میں تھوڑی فوجداری ہوگئی تھی۔ اسی وکت سے یہ میرے

پیچھے پڑے ہیں۔"

"اب وہ تمھیں پکڑ کر لے جائیں گے، حوالات میں بند کردیں گے۔"

"تم بھی بڑی بھولی ہو۔ میں ان کے ہاتھ آنے والا نہیں ہوں۔"

پارو بولی۔ "ایک گھڑسوار بھی تو ہے میرے کھیال میں وہ تھانے دار ہے اس الا کے کا۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔ روپی! اب میں آج سے چوتھے دن ملوں گا تم سے۔"

"وروا ہے سے نکلو گے تو پولیس والے دیکھ لیں گے......"

ورسے کی نظر پچھواڑے والی کھڑکی کی جانب اٹھ گئی۔ جہاں لوہے کی سلاخوں کی بجائے لکڑی کی خاصی موٹی بلّیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اور پھر بولا۔ "چنتا مت کرو...... ایک بار میں اپنے گاؤں پہنچ گیا تو پھر تھانے دار مجھے نہیں پا سکے گا۔"

"تمہارا گاؤں بھی تو یہاں سے دس کوس کی دوری پر ہے۔" روپی دھڑکتے ہوئے دل سے بولی۔

"ہے تو!" یہ کہہ کر ورسے نے کھڑکی کی چوبی بلیوں کو ایک لات رسید کی۔

گھوڑے کی لگام کھینچ کر تھانے دار سرداری لال طویلے سے ایک فرلانگ ادھر ہی رک گیا۔ وہ جھنگ مگھیانے کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ اسی لیے گورا چٹا ہونے کے علاوہ وہ عظیم الجثہ بھی تھا۔ علاقے بھر میں اس کے دبدبہ بلکہ دہشت کا دور دورہ تھا۔ مگر حقیقت میں سخت گیر ہونے کے باوجود وہ اُجڈ نہیں تھا۔ عام تھانے داروں کی طرح وہ اس چیز سے کورا نہیں تھا جسے 'شے لطیف' کہا جاتا ہے۔

رکاب کے قریب کھڑا ہوا ایک سپاہی بولا۔ "سرکار! ورسا 'ورشی جوان' ہے۔ اونچا لمبا، اور غضب کا پھرتیلا۔ دوڑنے میں ان کے جوڑ کا جوان علاقے بھر میں نہیں مل سکتا۔ اگر ایک بار وہ طویلے سے نکل بھاگا تو پھر ہم اس کی دھول کو بھی نہیں پا سکیں گے۔"

تھانے دار سرداری لال نے گھوڑے کو ہلکی سے تھپکی دی اور بس مسکرا دیا۔ اُدھر اس کا چاق و چوبند گھوڑا کنوتیاں پھڑکا رہا تھا۔ ادھر اس کی کلاہ دار پگڑی کا اوپر کو اٹھا ہوا شملہ ہوا کے

سبک جھونکوں میں لہرا رہا تھا۔

پارو کی غیر موجودگی میں بیلوں کو ہانکنے والا کوئی نہ رہا تو وہ رک گئے۔ روں روں کی آواز کی جگہ خاموشی نے لے لی۔ پھیلے ہوئے برگد کے سائے تلے رہٹ اور قریب والے طویلے پر پُر اسرار خاموشی طاری تھی۔

چند لمحوں کے تامل کے بعد سرداری لال گھوڑے کو ایڑ لگانے ہی کو تھا کہ ایک سپاہی نے اس کی پنڈلی کو دبا کر انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا۔

چاروں طرف چاند کی چاندنی چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ طویلے کے پچھواڑے سے ایک لمبا لہراتا ہوا سایہ دکھائی دیا، جس نے کھلی جگہ پر پہنچ کر ایک سجیلے جوان کا روپ دھارن کر لیا۔

''یہی ہے ورسا سنگھ!'' ایک سپاہی نے سرگوشی میں کہا۔

گھوڑے، اور اس پر سوار تھانے دار کے حساس نتھنے پھڑ پھڑائے۔ ظاہر تھا کہ دونوں میں سے ایک بھی سپاہی دوڑ کر ورسے کو پکڑ لینے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔

سرداری لال نے بلند آواز میں کہا۔ ''ورسیا! میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں...... میں یہاں تمھیں پکڑنے کے لیے آیا ہوں۔''

ورسا گویا ایک جگہ پر بالکل بت بنا کھڑا تھا۔ وہ جوں کا توں کھڑا رہا...... اس نے مسکرا کر تمسخر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ''پکڑنے کے لیے آئے ہو تو پکڑ لو۔ اس میں کہنے سننے کی بھلا کیا بات ہے؟''

طیش میں آنے کی بجائے سرداری لال کو ہنسی آ گئی۔ اس نے سپاہیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''اصل اجڈ جاٹ نظر آتا ہے۔''

ایک سپاہی بولا۔ ''حضور، اس طرح طنطنے سے بولنا ان لوگوں کی عادت ہے...... ویسے نہتا ہے۔ لاٹھی تک نہیں ہے اس کے پاس۔''

ورسا جیسے ان کی موجودگی سے قطعاً بے پروا ہو کر وہاں سے چل دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے جا پکڑنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ محض اپنا فرض پورا کرنے کے خیال

سے سپاہیوں نے قدم آگے بڑھائے۔

حدِ نگاہ تک ہرے بھرے کھیت لگے ہوئے تھے۔ان میں بہت سے کھیت ایسے بھی تھے جن میں اُگے ہوئے نرم و نازک پودے بالشت، ڈیڑھ بالشت سے زیادہ بلند نہیں تھے۔ ان کھیتوں کے درمیان کسی طویل اژدہے کی طرح چوڑا سا کچا راستہ بل کھایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے راستے کو مقامی زبان میں پیہا کہا جاتا تھا۔

ایک جست لگا کر گھوڑا آگے بڑھ گیا تو سپاہیوں کے قدم رک گئے۔مگر تھانے دار نے گھوڑے کو دوڑایا نہیں۔آگے آگے ورسا اپنی لمبی لمبی مضبوط ٹانگوں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے تھانے دار گھوڑے کو عام رفتار سے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔اسے اطمینان تھا کہ جب چاہے گا ورسے کو جا ملے گا۔

اِدھر شہ سوار شکاری کتے کی طرح چاق و چوبند اور ارادے کا پکا نظر آتا تھا، اُدھر ورسا پلے ہوئے جنگلی بلے کی طرح نڈر اور بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

جیسے جیسے گھوڑے کی رفتار بڑھتی گئی ورسے کے قدم بھی تیز ہوتے گئے۔ سرداری لال کے ہونٹوں پر ابھی تک طنز آمیز مسکراہٹ تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بے وقوف کب تک ایک شہ سوار کی زد اور گرفت کے باہر ہو سکے گا......

کچھ دور جانے کے بعد تھانے دار نے سوچا کہ یہ تماشا کافی ہو چکا۔اس نے ایڑ لگا کر گھوڑے کو دلکی چال پر ڈال دیا۔

ورسا کن انکھیوں سے پیچھا کرنے والے کا جائزہ لے رہا تھا، اس نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس طرح وہ پیہے ، میں سرپٹ دوڑنے لگا۔آس پاس کے پیڑوں پر غنودگی میں ڈوبے ہوئے پرندے چونک پڑے اور چونچیں بڑھا بڑھا کر یہ انوکھا منظر دیکھنے لگے۔

تھانے دار نے گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑا دیا۔ پیہا چوڑا تو تھا لیکن اس کی زمین برابر نہیں تھی، اس میں کبھی ایک پگڈنڈی دکھائی دی اور کبھی زمین کی ساخت کے مطابق وہ پگڈنڈی کئی پگڈنڈیوں میں تقسیم ہو جاتی اور اس کے بعد قینچیوں کی طرح، ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی پگڈنڈیاں سمٹ کر پھر ایک ہو جاتیں۔ ورسا پگڈنڈیوں کی اس انوکھی ساخت کا پورا

پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔ لیکن گرانڈیل گھوڑے کو چاند کی روشنی میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ تاہم گھوڑا بہر حال گھوڑا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان فاصلہ دم بہ دم کم ہونے لگا تو یکا یک درسا دائیں کو مڑ کر کھیتوں میں ہولیا۔

کھیتوں کی زمین اور بھی زیادہ اوبڑ کھابڑ تھی۔ گھوڑے کیا، گھڑسوار کی چولیں بھی ہلنے لگیں۔

یہ دوڑ بھی کافی دور تک جاری رہی۔ ان کے درمیان فاصلہ پھر کم ہونے لگا۔ ٹھیک اسی وقت گھڑسوار کو اونچے مقام سے لگ بھگ دو فرلانگ کے فاصلے پر ابھری ہوئی زمین کے دو خطوط دکھائی دینے لگے۔ وہ خطوط کئی فٹ چوڑی نہر کی پٹری کے تھے۔ امید کی کرن سرداری لال کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی۔ اب درسے کا رک جانا ناگزیر تھا۔ مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ درسے کی رفتار میں کمی آنے کی بجائے اور بھی تیزی آ گئی۔ نہر کے اس طرف کی پٹری پر پہنچ کر وہ عظیم الجثہ پرند کی طرح ہوا میں اٹھا اور نہر کے پاٹ کو صاف پار کر گیا۔

سرداری لال نے جھنجھلا کر ایک جھٹکے کے ساتھ لگام کھینچی۔ گھوڑی سٹپٹا کر ٹاپیں زمین پر پٹخنے لگا۔

درسا ذرا دیر تک اس پار والی پٹری پر کھڑا زور زور سے سانس لیتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے پکار کر کہا: ''تھانے دار جی! پل ادس پاس (اس طرف) ہے۔ آپ ادھر سے آ ئیے۔ اینے (اتنے میں) میں بھی دم لے لوں۔''

دل ہی دل میں سرداری لال زچ تو ہوا، مگر اس نے سوچا کہ منزل ابھی دور ہے، بھلا یہ تھکا ہارا بھگوڑا کب تک میرے ہاتھ نہیں آئے گا۔ چنانچہ وہ لگ بھگ تین فرلانگ کی دوری پر واقع پل کی جانب بڑھ گیا۔

پل پار کر کے وہ درسے کی طرف لوٹا۔ نگاہ اٹھائی تو درسا وہیں جما کھڑا تھا۔ ایک فرلانگ کا فاصلہ باقی رہ گیا تو درسا بارہ سنگھے کے سے تیور دکھاتا ہوا پھر کھیتوں میں جا گھسا۔

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ اب تو دور دور تک کوئی پیڑ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سرداری لال نے دانت پیس کر ایک بار پھر گھوڑا مفرور کے پیچھے ڈال دیا۔

دوڑتے دوڑتے ایک دم ورسے نے اصیل مرغ کی طرح سینہ پھلا کر سر پیچھے کو پھینکا، پگڑی کا اٹھا ہوا شملہ لہرا اٹھا اور اس نے زور سے نعرہ لگایا: ''ایلی! ایلی!!

درحقیقت یہ 'علی! علی!' کا نعرہ تھا۔ ان دنوں غیر مسلم پہلوان اور دھاکڑ، جوان وجہ تسمیہ جانے بغیر 'ایلی! ایلی!' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

ورسے کا یہ طنطنہ دیکھ کر سرداری لال کو بڑے زور کا تاؤ آیا، اس نے گھوڑے کو اندھا دھند دوڑا دیا۔

ورسے کی غیر معمولی لمبی قینچی جیسی ٹانگوں تلے دھرتی گویا کٹتی چلی جا رہی تھی۔ گھوڑے کے تڑاتڑ بجتے ہوئے سموں کے نیچے سے یا تو ڈھول کے پٹاخے چھوٹ رہے تھے یا ان کی جھپٹ میں آئے ہوئے نرم نازک پودے جڑ سے اکھڑ کر ادھر اُدھر جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ورسے کو اپنی گدی پر گھوڑے کے دھونکنی جیسے نتھنوں سے نکلنے والے گرم گرم ہوا کے چابک سے برستے محسوس ہونے لگے۔

سرداری لال نے پنجہ بڑھا کر گھوڑے کو اور بھی زور کی ایڑ دی۔

پلک جھپکتے میں ورسا نیچے کو جھکا۔ اس نے بھربھری مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھایا اور پلٹ کر پوری قوت سے گھوڑے کی تھوتھنی پر دے مارا۔

ڈھیلا گولے کی طرح پھٹا، کچھ دھول گھوڑے کے نتھنوں میں نسوار کی طرح چڑھ گئی اور کچھ اس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا، پھر چھ سات قدم پیچھے کو سرکتا چلا گیا اور اس کے بعد پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اگلی دونا پیں اٹھا کر ہوا سے لڑنے لگا۔

ورسے نے رفتار کچھ دھیمی کر دی، لیکن وہ رکا نہیں۔ اس کی اس جوابی کارروائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں کا درمیانی فاصلہ پھر بڑھ گیا گھوڑے کو سنبھلنے میں کچھ وقت لگ گیا۔

ایک بار پھر ورسے نے اپنے طویل بازو پھیلا کر آسمان کی طرف اٹھا دیے اور اسی رفتار سے بھاگتے ہوئے بھرپور آواز میں نعرہ لگایا:

''ایلی! ایلی!!''

تعاقب اسی انداز سے جاری رہا۔ جب سرداری لال کا گھوڑا بہت قریب آ جاتا تو ورسا بھر بھری مٹی کا ڈھیلہ اس کی تھوتھنی پر دے مارتا۔ تھانے دار خود دوڑ کر ورسے کو پکڑ نہیں سکتا تھا، اور گھوڑا اب بدکنے لگا تھا۔ بے چارے جانور کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اچانک اس کی تھوتھنی سے کیا چیز ٹکرا کر پھٹتی ہے اور پھر اس کی آنکھوں اور نتھنوں کا برا حال ہو جاتا ہے۔

ستاروں بھرے آسمان کے تلے اور ہری بھری زمین کے اوپر خدا کے یہ دو بندے یہ انوکھی دوڑ لگا رہے تھے۔ پھر تو نوبت یہاں تک آئی کہ جب گھوڑا ورسا کے بہت قریب پہنچ جاتا تو اس کی رفتار خود بخود کم ہو جاتی اور وہ کنی کترانے لگتا۔ اس طرح ہوتے ہوئے فاصلے کچھ زیادہ ہی بڑھ گئے۔ ورسے کا گاؤں بھی نزدیک آ گیا۔ اب اسے دوڑنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ساری دھرتی کے حکمراں کی سی شان کے ساتھ اطمینان سے چلنے لگا۔ گھوڑا بھی تھک ہار کر دوڑنے سے معذور ہو چلا تھا۔

اپنے گاؤں کے کچھ ادھر ورسا رک گیا اور ببول کے ایک اونچے پیڑ کے نیچے تنے سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جب گھڑسوار اس کے برابر میں پہنچا تو وہ مسکرا کر بھاری آواز میں بولا۔ ''تھانے دار! آ کر تم نے مجھے پکڑ ہی لیا۔''

سرداری لال رکا اور ورسے کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ خود اس کے چہرے سے بھی اب مایوسی، غصہ یا جھلاہٹ کے آثار دور ہو چکے تھے۔ ان جذبات کی جگہ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور پھر یکا یک جانے کیا ہوا کہ اسے ہنسی آ گئی۔ اس ہنسی نے قہقہوں کا روپ دھار لیا، خنک اور سہانی فضا کی خاموشی میں ان دونوں کے قہقہے۔ بلند مردانہ قہقہے کی طرح گونجنے لگے۔ آخر سرداری لال نے ہاتھ بڑھایا اور ورسے کے ہاتھ کو دباتے ہوئے بولا۔ ''ورسیا! تمھیں گرفتار کرنے کے لیے اب میں پھر کبھی آؤں گا۔''

ورسا ایک بار پھر ببول کے تنے سے ٹیک لگا کر چاند کی روشنی میں گھڑ سوار کو واپس جاتے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر سوار نے ایک نظر پیچھے کی طرف ڈالی، سینہ پھلایا، سر پیچھے کی طرف پھینکا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔ ''ایلی! ایلی!!''

☆☆☆

یہ افسانہ ماہنامہ 'شمع' دلی، اپریل 1974 میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

امانت

3-ایل بی، شاستری مارگ دہلی 7

پیارے رنجن ملہوترا جی

بمبئی میں آپ سے بہت کم ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ملاقاتوں سے میری زندگی میں رونق آ گئی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ میں وہاں ایک مہینے سے زیادہ نہیں رہ سکا۔ ورنہ آپ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے اور زیادہ مواقع ملتے۔

دلّی واپس آ کر کام کاج میں ایسا پھنسا کہ آپ کو خط بھی نہیں لکھ سکا۔ اسی دوران مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو خط لکھنا میرے لیے کتنا ضروری ہے۔ یہ محسوس کرنے کے باوجود میرے دل میں ہچکچاہٹ بنی رہی جس معاملے کے بارے میں آپ کو لکھنا چاہتا تھا وہ بہت نازک ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ کو اس کے بارے میں لکھوں یا نہ لکھوں۔ آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ آپ کو لکھے بغیر اور کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اس معاملے میں آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔

آپ کو یہ جاننے کی بے چینی ہو رہی ہوگی کہ اور وہ معاملہ ہے کیا؟ دراصل میری ملاقات بمبئی میں ایک لڑکی سے ہوگئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پہلی اتفاقیہ ملاقات کے بعد کئی

ملاقاتیں ہوئیں۔ اس لڑکی سے کئی قسم کے وعدے ہوئے۔ باتوں ہی باتوں میں ہم ایک دوسرے کے بن گئے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ دلّی پہنچ کر میں نے اسے تین خط لکھے لیکن اس نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں حیران و پریشان ہوں کہ وہ خطوں کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہے۔

لڑکی کا نام جیوتی ہے۔ اس کے نام و پتہ کا چھپا ہوا کارڈ میں اسی لفافے میں آپ کو بھیج رہا ہوں، وہ بڑے امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ میں نے اسے یہ بات صاف طور پر بتادی تھی کہ میں معمولی کاروباری آدمی ہوں۔ اس وقت تو جیوتی نے اپنے سر آنکھوں پر بیٹھایا اور کہا کہ امیری یا غریبی سے محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر شاید اب اسے کسی نے ورغلایا ہے کہ میرے جیسے شخص سے محبت کرنا بے وقوفی ہے۔ شاید اسی لیے وہ میرے خطوں کا جواب نہ دے کر مجھ سے ناتا توڑ لینا چاہتی ہے۔ اس خیال سے ہی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے میرے دل میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ شاید خط نہ لکھنے کی یہ وجہ ہو کہ اس کے پاس میرے ایڈریس کا کارڈ گم ہو گیا ہو۔ میں نے اپنے خطوں میں اپنا پتہ نہیں لکھا تا کہ اگر وہ کسی اور کے ہاتھ لگ جائیں تو اسے میرا پتہ نہ معلوم ہو سکے۔

رنجن صاحب، بمبئی میں آپ کے سوا کوئی ایسا انسان نہیں ہے جو اس معاملہ کی چھان بین کے بعد مجھے پورا حال لکھ سکے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں بری طرح بوکھلا گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ جیوتی سے مل کر میرا یہ خط اسے دکھادیں اور اس کے خیالات سے مجھے آگاہ کردیں۔ میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا یہ راز کسی اور پر ظاہر نہیں کریں گے۔

آپ کا
وجے اگروال

11/اگست 1981

یہ خط بھیج کر وجے کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ اب اسے محض اس بات کا انتظار تھا کہ دیکھیں رنجن اس کے اس کام میں دلچسپی لیتا بھی ہے یا نہیں؟ اگر دلچسپی لیتا ہے اور جیوتی

سے ملتا ہے تو دیکھیں کہ اس کے دل کی رانی اس کی قسمت کا کیا فیصلہ کرتی ہے۔

دن گذرتے گئے لیکن جب ایک ہفتے تک کوئی جواب نہیں آیا تو وجے کو بے چینی ہونے لگی۔ اس کے بعد انتظار کی ایک ایک گھڑی اس کے من پر بھاری ہونے لگی۔ ایک بار تو اسے یہ خیال بھی آیا کہ رنجن نے اسے بے وقوف یا پاگل سمجھ کر اس کا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا۔ مگر ایک روز جب اسے رنجن کا لفافہ ملا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ لفافے کے باہر بھی رنجن کا نام لکھا تھا۔ وجے کی انگلیاں کانپنے لگیں کچھ دیر تک وہ لفافہ کھول ہی نہیں پایا۔ آخر لفافہ میں سے خط نکالا اور وہ یہ تھا۔

بمبئی

27-8-80

ڈیر وجے صاحب

جواب دینے میں بے شک کچھ دیر ہوگئی۔ سبب یہ کہ معاملہ ہی بڑا نازک تھا۔ اتنا ضرور بتا دوں کہ میں نے جیوتی سے ملنے کی کوشش فوراً ہی شروع کر دی۔ ملاقات ہوئی بھی تو بڑی مشکل سے۔ ان کے وسیع بنگلے کے خوب صورت ڈرائنگ روم میں ہی بات چیت ہوئی۔ واقعی جیوتی بڑی حسین لڑکی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت وہ کہیں جانے کو تیار بیٹھی تھی۔ گویا مجھے جلد سے جلد اپنا مدعا بیان کرنا تھا۔ اس کی بکھری ہوئی زلفوں سے بڑی ہی خوشگوار مہک ہوا کی لہروں پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے نازک ہونٹ ہلے اور اس نے بھرپور آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''فرمایئے۔ میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

میں نے فضا کو خوشگوار بنانے کے خیال سے جواب دیا۔

''میرے لیے تو نہیں البتہ میرے ایک دوست کے لیے آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں۔''

جیوتی کے چاند سے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں اور بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکلا۔ ''آپ کا دوست؟ کون دوست؟''

''وجے...... وجے اگروال۔''

اب جیوتی کے چہرے پر کچھ ایسے اتار چڑھاؤ دکھائی دیے جن سے لگا کہ وہ اپنے

دماغ پر زور ڈال کر یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ آخر وجے کون ہے؟ اسے زیادہ پریشانی سے بچانے کے لیے میں نے آپ کا بھیجا ہوا خط اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بہت جلدی سے خط پر نظر دوڑائی، اور پھر بولی۔ ''مرد بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں اور وجے صاحب تو پیدائشی مجنوں معلوم ہوتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ چار دنوں کی ملاقات کو اتنی اہمیت دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اجی رات گئی۔ بات گئی۔ اب یہ کیا کہ وہ دلّی میں بیٹھے اپنی چھاتی پیٹ رہے ہیں۔ انھوں نے مجھے تین خط بھی لکھے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ ایسے مجنوں کا کیا علاج ہوسکتا ہے؟ یہ سب میرے بس کی بات تو ہے نہیں۔ زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہے لیکن وجے جیسے عاشق مزاج اب بھی قیس کی طرح ریگستانوں میں دھول اڑاتے پھر رہے ہیں۔ نا بابا۔ یہ سب میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ اس ملاقات کا سارا حال اس کو لکھ دیجئے تا کہ یہیں پر معاملہ ٹھپ ہو جائے۔''

یہ سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ معاف کیجئے ایک بار تو آپ مجھے اوّل درجے کے گدھے نظر آنے لگے۔ واہ کیا عشق لڑایا ہے آپ نے لیکن پھر جلد ہی آپ پر مجھے رحم آ گیا۔ میں نے ایک بار اور کوشش کرنے کی ٹھانی اور بولا۔ ''پھر بھی، جیوتی جی کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ انھیں چھوٹا سا رقعہ لکھ کر سارا معاملہ ہی صاف کر دیں؟''

اس پر جیوتی بھڑک کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی، کچھ تیز آواز میں بولی۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے ایک قسم کا استعفیٰ دینا ہوگا، کیا میں نے ان کی کوئی نوکری کی تھی یا ہم دونوں میں کوئی تحریری سمجھوتہ ہوا تھا۔ نان سینس۔ اچھا رنجن صاحب، مجھے معاف کیجئے۔ اگر میری کوئی بات بے جا لگی ہو تو برا نہ مانیے گا۔ اب میں رک نہیں سکتی۔ مجھے ایک جگہ پہنچنا ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ زلفیں لہراتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ اس کا یہ رویہ دیکھ کر کچھ دنوں تک آپ کو خط لکھنے کی میری ہمت نہیں ہوئی۔

معافی چاہتا ہوں کہ میں آپ کے کسی کام نہیں آ سکا۔

آپ کا

رنجن

یہ خط پڑھ کر وجے کے دل کو گہرا دھکا لگا۔ بات یہ نہیں تھی کہ عشق و محبت کے معاملہ میں وہ واقعی مجنوں تھا۔ دراصل اسے جیوتی سے اس قسم کی امید نہیں تھی۔ وہ خود کوئی بچہ یا انیس بیس سال کا جوشیلا نوجوان نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں کہ جیوتی سے پہلے اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی آئی ہی نہ ہو۔ وہ خود تجربہ کار آدمی تھا۔ زندگی کی اونچ نیچ دیکھ چکا تھا۔ عورتوں کی نفسیات کو بھی خوب سمجھتا تھا۔ اسی لیے وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکا کہ جیوتی اس گھٹیا انداز سے اس کو ٹھکرا دے گی اور اسے ایک بازاری مجنوں سے زیادہ اہمیت نہیں دے گی۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ رنجن کا خط اس کے سامنے تھا۔ رنجن نے بغیر لاگ لپیٹ کے ہر بات کھول کر لکھ دی تھی۔ ایک سمجھدار انسان ہونے کے ناتے وجے کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ اب صبر سے کام لے۔ وہ جانتا تھا کہ اب جیوتی کے پیچھے بھاگنا گویا خواہ مخواہ اپنی مٹی پلید کرنا تھی۔

وجے نے ایک بار پھر خود کو اپنے کاروبار میں بھلا دینے کی کوشش کی۔ بے شک جیوتی کو بھلا دینا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اب اسے یہی کچھ کرنا ہوگا۔

ڈیڑھ مہینے سے اوپر گذر گیا۔ وجے اپنے کاروباری دفتر میں بیٹھا کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں چپراسی نے آکر اطلاع دی کہ کوئی آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔ وجے نے کہا کہ اس کو اندر بھیج دو۔

جو آدمی اندر آیا اس کی عمر پینتیس کے آس پاس تھی۔ قد اچھا تھا۔ رنگ نکھرا ہوا تھا۔ چہرے کا ناک نقشہ بھی برا نہیں تھا۔ وہ سرج کا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اپنے قدم اٹھانے کے انداز سے وہ سنجیدہ انسان معلوم ہوتا تھا۔

وجے نے ہاتھ کے اشارے سے ایک گدے دار کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ بیٹھتے ہی اجنبی نے بولنا شروع کر دیا۔ ”میں بمبئی سے آیا ہوں۔ آپ سے ملنا ضروری تھا۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔“

وجے نے قلم میز پر رکھتے ہوئے ذرا پیچھے کو اور جھکتے ہوئے دھیمے سے کہا۔ فرمایئے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

اجنبی نے ایک موٹا سا سگار دانتوں میں دبا کر جلایا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''میرا نام اجیت کمار ہے۔ بمبئی میں میرا کچھ کاروبار ہے۔ ایک بڑی بلڈنگ کا مالک ہوں۔ جس میں کئی دفتر بھی ہیں اور رہنے کے لیے فلیٹ بھی، ایک فلیٹ میں آپ کے دوست رنجن صاحب بھی رہتے ہیں۔

وجے رنجن کا نام سن کر چونکا اور اس کے دل میں امید کی ہلکی سی کرن چمکی۔ پوچھا کیا رنجن صاحب کے آپ سے کچھ گہرے تعلقات ہیں؟''

''بالکل نہیں۔ وہ محض میرے کرایہ دار ہیں۔ ہمارے یہاں سسٹم یہ ہے کہ سب کی ڈاک ہمارے بڑے لیٹر باکس میں آتی ہے۔ پھر وہ ڈاک ہر ایک کو الگ پہنچا دی جاتی ہے۔ کچھ مہینے اُدھر کی بات ہے کہ رنجن صاحب کے نام ایک لفافہ آیا وہ آپ کا لکھا ہوا تھا۔ لفافہ ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا۔ اس کے کھلے منہ سے ایک وزیٹنگ کارڈ باہر کو کھسک آیا تھا۔ اس کارڈ پر جیوتی نام کی ایک لڑکی اور اس کے گھر کا پتہ چھپا تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے وہ خط رنجن صاحب کو نہیں دیا بلکہ اسے شروع سے آخر تک پڑھا۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ خط رنجن کو ملا ہی نہیں اور نہ ہی رنجن نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی اس خط کا جو جواب آپ کو ملا وہ رنجن کا نہیں میرا جواب تھا۔ ٹائپ کیے ہوئے اس خط کے نیچے میں نے رنجن کے دستخط بنا دیے کیونکہ میں اس کے نیچے میں دستخط پہچانتا تھا۔

اتنا کہہ کر اجیت کمار نے اپنی جیب میں سے ایک لفافہ نکالا۔ اور وجے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا— ''آپ کی یہ امانت میں آپ کو واپس کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو جو خط میں نے رنجن کے نام سے آپ کو لکھا تھا وہ مجھے لوٹا دیں۔ اس کے بعد میں آپ کی کہانی آگے بڑھاؤں گا۔''

وجے کا پورا خیال جیوتی پر لگا ہوا تھا۔ اسے خطوط کے لین دین پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے فائل میں سے رنجن والا خط نکال کر اجیت کو لوٹا دیا۔

اجیت نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرے دل میں بے ایمانی آ گئی تھی۔ میں جیوتی سے خود رومانس لڑانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب آپ اس

پر جان چھڑکتے ہیں تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ حسین تو ہوگی۔ مگر وہ تو بے انتہا حسین نکلی۔ آپ کو رنجن کی طرف سے خط لکھنے کا مدعا صرف یہ تھا کہ آپ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ جیوتی کے دل میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اور آپ اسے ہمیشہ کے لیے بھلا دیں۔"

وجے ادھ کھلے منہ کے ساتھ اجیت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

اجیت نے اپنی کہانی جاری رکھی۔ "میں اپنے قصے کو کم سے کم لفظوں میں بیان کروں گا تاکہ نہ آپ کا وقت ضائع ہو نہ میرا۔ جیوتی سے تعلقات بڑھانا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ لڑکیوں کو لبھانے کے ہتھکنڈے مجھے خوب آتے ہیں۔ وہ تو سیدھی سادی، ملنسار سی لڑکی تھی۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مختصر لفظوں میں میں اتنا ہی کہوں گا کہ بہت کم عرصے میں ہماری گہری دوستی ہوگئی۔ میں اس سے کہیں زیادہ مالدار شخص ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میری دولت کا اندازہ لگا کر وہ چکا چوند ہوجائے گی۔ اس غلط فہمی میں ایک روز میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت ہم کنگ گارڈن میں تھے۔ میری اس حرکت پر جیوتی نے فوراً ہی ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ "اجیت صاحب۔ آپ میرے فرینڈ ضرور ہیں۔ لیکن یاد رکھیے کہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے کسی اور کا ہو چکا ہے۔"

"اس کی یہ بات سن کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ مجھے اتنی جلدی کورا جواب دے دے گی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ میں نے سوچا کہ لڑکیاں بس ایسے ہی ڈھل مل ہوتی ہیں۔ کچھ دن اور خوشامد کروں گا اور اپنی دولت کے جلوے دکھاؤں گا۔ تو وہ مجھ سے شادی کے لیے راضی ہوجائے گی۔ مگر وجے صاحب وہ تو اس معاملے میں پہاڑ کی طرح اٹل نکلی۔ مشکل یہ تھی کہ اس کی محبت میرے دل کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی۔ اب میں یہ بات ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ میرے سوا کسی اور کی بیوی بنے میں نے فیصلہ کیا کہ یا تو وہ میری بیوی بنے گی یا اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔"

وجے عجیب چکر میں تھا یہ اجنبی جو اچانک اس کے دفتر میں آ گیا تھا اور یہ باتیں کہہ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

اجیت کی آواز پھر آہستہ سے گونجی۔ ''میں یہ جانتا تھا کہ جیوتی ہر روز سورج نکلنے سے پہلے سمندر میں نہانے کے لیے جایا کرتی تھی وہ تیرنا بھی خوب جانتی تھی۔ جس جگہ وہ جاتی تھی وہ بالکل سنسان تھی۔ وہاں کچھ چٹانیں تھیں جن کی اوٹ میں وہ اپنے کپڑے اتار کر سوئمنگ سوٹ پہن لیتی۔ ایک صبح میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ سوئمنگ سوٹ پہن کر چٹانوں کی اوٹ سے باہر آئی تو اپنے سامنے مجھے کھڑا پایا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھی۔ جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اسے اصل معاملہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی وہ جانتی تھی کہ میں اس کی جان لینے پر تل گیا ہوں۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پستول اوپر اٹھایا اور اسے بتا دیا کہ یا تو وہ میری بیوی بننا قبول کرے ورنہ یہاں کتے کی موت ماردی جائے گی۔ پستول کی آواز گونجے گی نہیں اور اس سنسان جگہ پر کوئی بھی شخص یہ منظر دیکھنے کے لیے موجود نہیں تھا۔''

وجے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اجیت اپنی کہانی سنائے جا رہا تھا۔ ''میری اس دھمکی کا جیوتی پر صرف یہ اثر ہوا کہ وہ سینہ تان کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ تاکہ میں اسے گولی ماردوں۔ میں نے گولی چلا دی۔''

اتنا کہہ کر اجیت اٹھ کھڑا ہوا اور محبت کے معاملہ میں اس کی ثابت قدمی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ لیجئے یہاں پر میری کہانی ختم ہوئی ہے۔ اب میں آپ سے جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ دروازہ سے باہر نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی جیوتی کمرے میں داخل ہوئی اور ہلکے سے مسکرا کر بولی۔ ''اجیت نے میرے سینے پر گولی نہیں ماری گولی میرے سر کے اوپر سے نکل گئی۔''

وجے لڑکھڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جیوتی ایک قدم اور آگے بڑھ کر بولی۔ ''میں دوسری امانت ہوں جو اجیت آپ کو واپس کرنے آیا تھا۔

☆☆☆

یہ افسانہ بیسویں صدی دہلی جنوری 1984 میں میں شائع ہوا تھا کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

لٹکتی شامیں

(ڈائری کے چند اوراق)

اُن دنوں میں ادارہ آجکل میں تھا۔ حضرت جوش ملیح آبادی میر کارواں تھے، اور یہ کارواں جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی اور اس گنہ گار پر مشتمل تھا۔ دیویندر ستیارتھی اسی دفتر کے شعبہ ہندی میں مدیر تھے۔

آج اس ڈائری کو لکھے سترہ برس ہو رہے ہیں۔ خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی ان اوراق کو منظر عام پر لانا پڑے گا۔ اس زیادتی کی ذمہ داری یا اس کا سہرا ادارۂ شب خون کے سر ہے۔ اس وقت نوک پلک، نیز کوئی مصلحت پیش نظر نہیں تھی۔ جو کچھ لکھا روا روی میں اور اپنی یادداشت کے لیے لکھا ہے۔

کرشن اور میں نے ان نیم خوابیدہ شاموں کو "لٹکتی شامیں" کے نام سے معنون کیا۔ اس ڈائری کی افادیت؟ شاید کچھ بھی نہیں۔ غالباً ادب کے عجائب گھر کے کسی کونے میں ان اوراق کو پریشان کیا جاسکتا ہے' کیوں کہ ان میں کرشن ایسے نام اور مجھ ایسے نابکار ادیب بغیر کسی میک اپ کے دیکھے جاسکتے ہیں۔

30 دسمبر 1949 — بلونت سنگھ

دو یا تین ہفتے پہلے اوپندر ناتھ اشک الٰہ آباد سے یہاں آیا اور اس نے مجھے فون پر کہا کہ بھئی میں صاف گو آدمی ہوں، لاہور میں دو ایک مرتبہ ہم دونوں کی رسمی ملاقات ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں بیماری کے دوران مجھے تمھاری کہانیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا اور میں سمجھتا ہوں کہ تم نے بہ حیثیت افسانہ نگار کے ہم سب کو شکست دے دی ہے۔ یہاں دھرم پرکاش آنند بھی بیٹھے ہیں۔ یہ بھی تمھارے مداحوں میں شامل ہیں اور تم سے ملاقات کے مشتاق ہیں۔

(اپنے بارے میں، میں نے جو الفاظ اشک سے منسوب کیے ہیں اگر اشک صاحب چاہیں تو ان کی تردید کر سکتے ہیں۔ ویسے اب بھی میرے افسانوں کے بارے میں ان کی رائے بہت بدلی تو نہیں۔ رہی شکست دینے والی بات ممکن ہے انھوں نے یہ بات از راہ مذاق کہی ہو۔ حالاں کہ میں انھیں مسخرہ نہیں سمجھتا۔)

مجھے دھندلا سا خیال تھا کہ آنند بھی ایک صاحب ہیں جو کہانیاں لکھتے ہیں۔ (اشک کے تعارف کے بعد) کچھ دنوں تک ٹیلی فون پر (آنند سے) بات چیت ہوتی رہی۔ آخر (آج) 30 دسمبر 1949 کو میں پٹودی ہاؤس، جہاں وہ رہتے ہیں ان سے ملنے کے لیے گیا۔ جانے سے پہلے میں آنند کی صورت کا کوئی تصور نہیں باندھا تھا۔ اس لیے مجھے جیسی صورت نظر آئی میں نے قبول کر لی۔ لیکن مجھے دیکھ کر آنند کو تعجب ضرور ہوا کیوں کہ اس نے دو تین مرتبہ مجھ سے کہا کہ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ 'ادیب' کے اس قدر برعکس ہوں گے۔ آنند ناک نقشے کے لحاظ سے قبول صورت ہیں۔ جوان ہیں۔ قد پانچ فٹ ساڑھے پانچ انچ کے قریب ہوگا۔ بدن اکہرا، رنگ گندم گوں۔

ایک کالی کلوٹی آیا نے چھوٹی سی میز پر چائے کا سامان رکھا۔ مجھ سے دریافت کیا گیا کہ چائے پیو گے یا کافی، تو میں نے کافی کو ترجیح دی۔ بعد از اں مسز آنند بھی تشریف لے آئیں۔ وہ سمجھ دار، معزز اور حسین خاتون ہیں۔ رنگ گورا، بدن اکہرا، آنکھیں بڑی بڑی، ناک قدرے لمبی، کافی کے دوران ہم دونوں (آنند اور میں) باتیں کرتے رہے۔ لیکن مسز آنند نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ انھوں نے مدراسی چیزیں (بھی) چن رکھی تھیں۔ کہنے لگیں یہ بھی چکھیے۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہم مدراسی چیزیں بھی کھا لیتے ہیں۔ میں نے

جواب دیا، چند روز پہلے میں ایک صاحب کے یہاں صبح کی چائے پر مدعو تھا۔ انھوں نے بھی معذرت کے ساتھ مدراسی چیزیں پیش کیں اور کہا کہ ہم چینج کی خاطر کبھی کبھی مدراسی چیزیں بھی کھا لیتے ہیں۔ میں نے (ان سے) کہا تھا: اس کا ایک اور فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ مدراسی کھانا کھا لینے کے بعد اپنے کھانوں کا احترام اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

9 مارچ 1950

آج صبح میٹنگ کے لیے (این) بلاک گیا تھا۔ تین بجے کے قریب (دفتر) لوٹا۔ ستیارتھی کا 'پیام' آیا کہ ملو۔ میں نے کہلا بھیجا کہ میں بہت مصروف ہوں' کچھ دیر بعد فرصت پاؤں گا۔ وہ خود ہی آ گیا، بولا: کرشن چندر کی بہن سرلا دیوی کی شادی کا موقع ہے' آؤ اسے مل آئیں۔ میں نے کہا کہ ملاقات کے لیے پیغام تو مجھے بھی ملا تھا لیکن میں جا نہیں سکا۔ سوچتا ہوں وہ (کرشن چندر) شادی سے فرصت پالے تو مل لیں گے۔ ستیارتھی کے اصرار کرنے پر ہم تیس ہزاری، بھارگولین پہنچ گئے۔ کرشن چندر شامیانے نیچے چند احباب کی محفل میں بیٹھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ دو تین مرتبہ میری جانب دیکھ کر پرمعنی انداز میں سر ہلا کر پوچھا' کہو کیا حال ہے۔ میں نے جواب دیا دعا ہے۔

کرشن چندر تہ درتہ مسکراتا نظر آتا ہے۔ ہماری پہلی ملاقات 1942 میں ہوئی تھی۔ میں ابھی پڑھتا تھا لیکن میری کچھ کہانیاں ساقی میں چھپ چکی تھیں جو کرشن کو بھی پسند تھیں۔ ہماری ملاقات دہلی میں منعقدہ ایک اردو کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ میں کارونیشن ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ شاہد احمد دہلوی معہ چند احباب کے میرے پاس آ کر بیٹھے رہے لیکن کرشن اکیلا آیا اور ہم ہوٹل کی چھت پر چارپائی پر لیٹے دو تین گھنٹوں تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔

بعد ازاں ہم دونوں علاحدگی میں گفتگو کرتے رہے۔ گفتگو کا موضوع اس کی نئی کتاب تھی جس کا سودا ایک پبلشر سے طے ہو رہا تھا۔ کرشن میرے ذریعہ موافق شرائط حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے کرشن سے کہا کہ میری ملازمت کا سلسلہ تو عارضی ہے۔ اگر کبھی بمبئی آنا پڑے تو وہاں فلمی لائن میں کامیابی کی کوئی امید ہے یا نہیں اس نے کہا: تم جیسے لکھنے والوں کے لیے جگہ ضرور ہے لیکن کچھ دنوں ٹکریں مارنی پڑتی ہیں۔ پھر میں نے کہا: کرشن!

ایک مدت کی بات ہے جب ہم دونوں نے 1942 میں کارونیش ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ آج کم و بیش آٹھ برس کے بعد ہم دونوں۔ یعنی محض دونوں۔ اکٹھا بیٹھ سکیں۔ اس نے اتفاق کیا۔ اتوار 12 مارچ شام کے پانچ بجے وقت مقرر ہوا۔

ہم سب سے الگ کھڑے تھے۔ اتنے میں ستیارتھی بھی آن پہنچا۔ بات کا رخ بدل گیا۔ پھر ہم دونوں کرشن سے رخصت ہو کر کناٹ پلیس پہنچے۔ وہاں دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد کوکو۔ کچھ وقت کتابوں کی دکانوں پر گزرا۔ پھر خدا حافظ!

12 مارچ 1950

آج کرشن چندر سے ملاقات کی تاریخ تھی۔ اتفاق سے بس مل گئی۔ میں (دفتر سے) ساڑھے چار بجے ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ کرشن گھر میں نہیں ہے، وہ دو بجے ہی ریڈیو اسٹیشن چلا گیا تھا۔ میں چکرایا۔ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے۔ اسی اثنا میں سرلا دیوی آگئیں اس وقت بھی وہ دولہن کے لباس میں تھیں۔ پتہ چلا کہ کرشن رات کو آئیں گے میں نے کہا کہ پانچ بجے ملنے کا وعدہ تھا۔ پانچ تک ضرور انتظار کروں گا۔ تاکہ اس کم بخت کو جھوٹا تو کہہ سکوں۔ سرلا بولیں: آپ شوق سے انتظار کریں۔ وہ بے چاری خود میرے پاس بیٹھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ نہ اسے امید تھی کہ کرشن آئے گا اور نہ مجھے' کیوں کہ جب وہ ایک دفعہ چلا گیا تو وہاں سے اسے واپس کون آنے دے گا۔ دوستوں میں گھرا رہے گا۔ ادھر پانچ بجے ادھر تانگہ دروازے کے آگے آکر رکا اور اس پر سے کرشن چندر اور اس کا چھوٹا بھائی مہندر ناتھ اترے۔ کرشن نے پکار کر کہا: بھئی! امید ہے کہ مجھے دیر نہیں ہوئی کرشن منہ ہاتھ دھونے کے لیے اندر چلا گیا اور مہندر اور میں باہر (چھوٹے سے لان پر) بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خیال آیا کہ مہندر کو بھی ساتھ لے چلوں لیکن در اصل مہندر سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ پہلی بھی سرسری تھی اور دوسری بھی۔ میں نے اسے منگل چودہ مارچ کے روز چائے پر مدعو کیا۔ اتنے میں کرشن اندر سے آگیا۔ ہم چلنے کو تیار ہوئے تھے کہ چند احباب آپہنچے۔ ان میں تاباں اور پرکاش پنڈت بھی شامل تھے۔ میں نے سوچا نئی آفت آئی (ان اصحاب سے معافی کا خواست گار ہوں) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کرشن پہلے سے زیادہ وعدوں اور وقت کا پابند ہوگیا

تھا۔ ایک مرتبہ تو ہم سب بیٹھ گئے۔ دو ہی منٹ کے بعد کرشن نے میری جانب پر معنی انداز سے دیکھا اور کہا: ہم تو پہلے ہی آدھ گھنٹہ لیٹ ہو چکے ہیں۔

چنانچہ ہم اٹھ کر چل دیے۔

اب کرشن نے کہا: یاد ہے آج سے غالباً سات آٹھ برس پہلے ہم دونوں ملے تھے۔ کارونیشن ہوٹل گئی رات تک باتیں کرتے رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کرشن نے اپنا ناول شکست لکھا تھا۔

ان دنوں کرشن اکہرے بدن کا جوان تھا۔ اب وہ ادھیڑ عمر کا معلوم ہوتا تھا' اس کا قد پانچ فٹ چار انچ کے قریب ہوگا۔ رنگ خاصہ گندی، بدن پھول گیا تھا۔ ہاتھ نرم، چوڑی پیشانی، ہونٹ حساس، آنکھوں کی اب وہ کیفیت نہیں رہی تھی جو پہلے تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کا رومنٹک غبار دکھائی دیا کرتا تھا۔ اب چندیا کے بال بھی تیزی سے اڑ رہے ہیں۔ (البتہ) وہ میری طرح بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر نہیں چلتا۔ اسمارٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت سب سے پہلے اس کی آنکھوں پر نظر جاتی تھی۔ لیکن اب دیکھنے والوں کی نظر اس کے منہ کے دہانے، ہونٹوں اور ان کے گوشوں پر مرکوز رہتی ہے۔

کرشن کی بابت ہم جو کچھ بھی کہیں یا سوچیں لیکن فی الحقیقت زمانہ حال میں وہ اردو ادب میں اہم واقعہ سے کم نہیں ہے۔ اگر چہ وہ کہتا ہے کہ وہ محفل کا آدمی نہیں ہے، پھر بھی اس کے دنیا بھر سے تعلقات ہیں۔ اس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اسے سب پیار کرتے ہیں۔ محض اس کے فن کا قائل ہونا بات دیگر ہے۔ لیکن یہ پیار بالکل مختلف چیز ہے۔

پہلے ہم Savoy میں بیئر پیتے رہے۔ کرشن نے سگریٹ پینا ترک کر دیا ہے (پہلے ہم نے) لیمنکس کی بیئر پی۔ وہاں سے Volga پہنچے جہاں ڈچ بیئر منگوائی گئی۔ فی الحقیقت یہ پہلی بیئر سے بہتر تھی۔ کھانے میں کرشن نے چوزے کا سوپ، نرگسی کوفتہ، گردے، اور تنور کی ایک روٹی کھائی۔ اس نے ڈچ بیئر اور سوپ بہت پسند کیا۔

یوں تو باتوں باتوں میں ہم نے کئی مضامین کو چھوا لیکن میں نے جان بوجھ کر گفتگو بوجھل نہیں ہونے دی۔ بعض اہم معاملات میں جہاں مجھے کرشن سے اختلاف تھا، میں چپ رہا

کیوں کہ میں چاہتا تھا شام خوشگوار رہے۔

13 مارچ 1950

آج ستیارتھی نے کرشن کی دعوت کر رکھی تھی۔ اس لیے دفتر سے ہم دونوں کرشن کے مکان پر پہنچے۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ لیکن پانچ بجے تک لوٹ آیا۔ وہاں سے تانگہ میں بیٹھ کر پہلے ہم سیندھیا ہاؤس پہنچے۔ فوٹو کا پروگرام بھی تھا۔ اس کا خرچہ میرے ذمہ تھا۔ (آج کل یہ فوٹو اشک کے مطالعہ کے کمرے میں لٹک رہا ہے) فوٹو کھنچوانے کے بعد ہم لوگ کناٹ پلیس میں گھومتے رہے۔ قیاس سے معلوم ہوا کہ کرشن بیئر پینا پسند کرے گا، لیکن ستیارتھی میزبان ہونے پر بھی اس بات سے کترا رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کرشن کا جی بے زار ہو۔ چنانچہ والگا Volga میں جا بیٹھے۔ کوئی دو گھنٹوں تک بیئر پیتے رہے۔ بیس روپے سے اوپر بل آیا۔ ستیارتھی (بیوی کے ڈر سے) شراب نہیں پیتا، اسی لیے میں نے پوچھا نہیں۔ البتہ کرشن کے کہنے پر فوراً آمادہ ہوگیا۔ خوب محفل رہی۔ وہاں سے اٹھ کر ہم ستیارتھی کے مکان پر پہنچے۔ (مکان Baird روڈ پر تھا، لیکن لوگ ستیارتھی کی جھاڑ جھنکار داڑھی کی رعایت سے اسے Beard روڈ سمجھتے تھے) سخت بھوک لگی تھی، وہاں مرغ نہ کباب لے دے کے میٹھے چاول' جن سے مجھے نفرت ہے۔ کدو جس سے مجھے چڑ ہے' مینو میں شامل ہیں۔ شوربہ دار مٹروں سے بہ مشکل دو ڈھائی پھلکے کھا سکا۔ کرشن نے بھی ایک ہی چپاتی کھائی۔ سخت کوفت ہوئی......

14 مارچ 1950

دفتر میں ستیارتھی سے ملاقات ہوئی تو اس کی زبانی پتہ چلا کہ رات اس کی بیوی ہمارے بیئر پینے سے اس قدر چڑ گئی تھیں کہ ہمیں ڈھنگ سے کھانا بھی نہ کھلا سکیں۔ کئی اور سالن بھی تیار کیے گئے تھے' بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا گیا کہ بعض سالن تو ہمارے قریب پڑے رہے لیکن ہم نے نشے میں ان کی جانب دھیان ہی نہیں دیا۔ اب یہ محض...... تھی حضرت ستیارتھی غالباً جھینپ مٹانے کے لیے یہ کہہ رہے تھے۔ میں نے مہندر کو چائے پر مدعو کر رکھا تھا (لیکن وہ کسی کارن نہیں آسکا) ادھر بلونت سنگھ (پبلشر) نے بھی ہم دونوں یعنی ستیارتھی اور مجھے شام کی چائے پر بلا لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کرشن بھی شامل ہوگا۔ شام کو ستیارتھی اور میں

کرزن روڈ پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کرشن بھی آ گیا۔ چائے کی میز پر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ چائے پارٹی ختم ہونے پر باہر کے اصحاب رخصت ہوگئے اور ہم تینوں پبلشرز کے پاس رہ گئے۔ کچھ امور سرسری طور پر طے ہوئے (1) 'نئے زاویے' کی تیسری جلد بھی پبلشر شائع کرے (2) اردو کی اعلیٰ پایہ کی بارہ کتابیں شایع کی جائیں (3) ہندی میں ناولٹ جن کی ضخامت 150 صفحات سے زیادہ نہ ہو چھاپے جائیں (4) ہر ادیب کو رائلٹی کا پچاس فی صد پیشگی دیا جائے۔

اس کے بعد ہم تینوں کناٹ پلیس آ گئے۔ موقع ملنے پر میں دن بھر ستیارتھی کو ذلیل کرتا۔ میں نے کہا...... تیری دعوت نے تو ہمارا جی کھٹا کر دیا (کناٹ پلیس میں) نہ جانے اسے کیا تاؤ آیا، کہنے لگا: آؤ، کہیں بیٹھ کر پئیں۔ کرشن نے پہلے تو انکار کیا پھر راضی ہو گیا۔ اسی ارادے سے ہم نرولا پہنچے۔ مجھے یاد آیا کہ آج منگل ہے' بیئر نہیں ملے گی' میرا خیال درست نکلا۔ ہمیں مایوس ہونا پڑا (گھومتے پھرتے) ایک چوراہے پر حضرت آنند مل گئے۔ میری آنند سے کچھ بدمزگی ہوگئی تھی۔ بہ ظاہر نہیں۔ وہ کرشن سے بڑے تپاک سے ملا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولا بھئی! کل ہو، جس وقت تمھیں سہولت ہو۔ کرشن نے کہا: ہم ایک اور تین کے درمیان ایک ساتھ کھانا کھا سکتے ہیں۔ آنند نے حیل و حجت شروع کردی یا میرے گھر پر آؤ یا دفتر میں (نہ جانے کیوں) کرشن کو یہ دونوں باتیں منظور نہیں تھیں۔ کوئی پروگرام نہیں بن سکا تو وہ رخصت ہوگیا۔ اب ستیارتھی نے اصرار کیا کہ کل بیئر کا پروگرام رہے گا۔ کرشن نے کہا کہ کل رات کا کھانا وہ کسی دوست کے یہاں کھا رہا ہے۔ اب یہ طے پایا وہ بیئر ہمارے ساتھ پئے اور کھانا دوست کے ہاں کھائے۔ یہ طے ہوجانے پر ستیارتھی بھی رخصت ہوگیا۔ مجھے رات کا کھانا ابھی کھانا تھا۔ چنانچہ ہم والگا چلے گئے۔ کرشن نے میرے اصرار پر صرف چوزے کا سوپ لیا۔ میں نے سوپ کے بعد کھانا بھی کھالیا۔ باتوں باتوں میں کرشن نے بتایا کہ آنند بڑا کنجوس ٹائپ کا انسان ہے (چند فقرے حذف کر رہا ہوں) پھر کرشن نے پوچھا کہ جوش (ملیح آبادی) نے کبھی کوئی شرارت تو نہیں کی؟ میں نے جواب دیا کہ ذاتی طور پر مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے (اب پھر چند فقرے حذف کر رہا ہوں)۔ بات صرف یہ تھی کہ جب جوش اور

ساغر نظامی شالیمار ٹاکیز میں تھے تو کرشن اور جوش کے مابین کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں تھیں، کھانا ختم ہونے پر ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔

15 مارچ 1950

آج کرشن چندر کے ساتھ چوتھی شام گزری۔ وانگا کے ایک گوشہ میں بیئر کا دور شروع ہوا۔ اب کے کرشن اور کھل گیا۔ میں لطیفے اور لوک گیت سناتا اور (بھدی آواز میں) گاتا رہا۔ یہ محفل چھ بجے سے شروع ہوکر رات کے دس بجے ختم ہوئی۔ آج ستیارتھی نے مجھے بہ منت کہا تھا کہ کسی طرح چالیس روپے میں میرا پنڈ چھڑا دینا۔ شاید یہی ہوتا بھی لیکن آخری دور تک کرشن کے میزبان حضرت ساحل آ گئے۔ انھوں نے بھی شراب پی اور کھانا بھی وہیں کھانے کی ٹھہری جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بل اڑتالیس روپے تک پہنچ گیا۔ ستیارتھی چالیس روپے دے کر بغلیں جھانکنے لگا۔ اتفاق سے میرے پاس بھی روپیہ نہیں نکلا۔ آخر رقم بچارے کرشن کو ادا کرنی پڑی۔

(دہلی میں کرشن سے یہ آخری ملاقات تھی۔ کئی برس بعد الٰہ آباد میں ملے تو دلوں میں وہی گرمی اور باتوں میں وہی اشتیاق تھا۔)

☆☆☆

بلونت سنگھ کی ڈائری کے یہ اوراق 'شب خون' اپریل 1968 میں شائع ہوئے تھے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

تعویذ

''چار نمبر صاحب دو روپے مانگتے ہیں۔''

بیرے کا مطلب یہ تھا کہ جو صاحب کمرہ نمبر 4 میں ٹھہرے ہوئے ہیں وہ دو روپے طلب کرتے ہیں۔ مجھے تعجب ہوا اور غصہ بھی آیا کہ یہ شگوفہ کیسا؟ جو مسافر ہوٹل میں قیام پذیر ہو اس سے ہم روپیہ وصول کرنے کے عوض الٹا اسی کو اپنی گرہ سے روپے ادا کریں۔

میں نے بوٹوں کے تسمے کستے ہوئے پوچھا ''کیوں؟''

''وہ تار دینا چاہتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''ہم کا جانی — حجور''

بیرے کے اس جواب سے جھنجلاہٹ تو ہوئی۔ لیکن اس سے زیادہ بات چیت کرنی فضول تھی۔

''اچھا تو تم جا کر کہو کہ خود مالک آ رہے ہیں۔''

کچھ تو کام مندا ہو رہا تھا اور کچھ اس قسم کے مسافر پریشانی کا باعث ہوتے تھے۔ لیکن ہوٹل کا بزنس ایسا کہ ہر قسم کے انسان سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔

نیچے پہنچ کر میں نے ملازم سے کہا کہ چار نمبر صاحب کو دفتر میں ہی بلا لاؤ۔ میں نے منیجر کی جانب متوجہ ہو کر پوچھا۔

"یہ کس قسم کا مسافر ہے؟"

منیجر نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا "مسلمان ہے۔"

منیجر کا لب و لہجہ عجیب تھا۔ اس کا جواب بھی خلاف امید تھا۔ قدرے تامل کے بعد میں نے کہنا شروع کیا "اجی بڑا رعب گانٹھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں بہت پرانا آدمی ہوں۔ بڑی نکتہ چینی کرتا ہے اور اپنے آپ کو کسی راجہ صاحب کا مصاحب بتاتا ہے۔

مالک نے اس کی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ ہوٹل میں اکثر ایسے لوگ بہت آیا کرتے تھے مجھے ان سے نبٹنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

اسی اثنا میں حضرت موصوف آ گئے۔ ان کی صورت خلاف امید بالکل فدوی قسم کی دکھائی دی۔ پچاس کے قریب سن۔ ناٹا قد، داڑھی مونچھ غائب۔ یہاں تک کہ ابرو کا بھی صفایا کر ڈالا — اور ان پر یورپین لیڈیز کے مانند آئی برو پنسل سے خطوط کھینچ دیے گئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل، پتلیاں رقصاں، بند گلے کا کوٹ، پتلون نما پائجامہ، صورت مضحکہ خیز لیکن تیور سنجیدہ تھے۔

آتے ہی بھرپور آواز میں بولے "آداب عرض کرتا ہوں۔" میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کرسی کی جانب اشارہ کیا "تشریف رکھیے"

آپ نے سر تسلیم خم کیا اور پھر تشریف فرما ہو گئے۔

میں کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ وہ بول اٹھے۔

"بھائیں (یعنی میں)...... آپ کو پہچانتا ہوں۔ آپ...... آپ شاید مجھے نہیں پہچانتے۔ بھائیں اکثر آپ کے یہاں قیام پذیر ہوتا ہوں۔ آپ کے منیجر بھی نئے آئے ہیں...... اتفاق کی بات بھائیں جب کبھی آیا تو معلوم ہوا کہ حضور باہر تشریف لے گئے ہیں۔"

"جی ہاں بعض اوقات میں باہر بھی چلا جایا کرتا ہوں۔"

"زہے نصیب آج آپ کی زیارت حاصل ہو گئی۔ میرا نام شاہا ہے۔"

شاہا— عجیب نام تھا شاید اس کے بتانے میں غلطی ہوئی ہے کچھ۔ ''آپ کا نام شاہ ہے۔''

''جی نہیں شاہ نہیں۔ شاہا۔ شاہ اور ہا— شاہا۔''

''اچھا تو شاہا صاحب آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔''

''جی جی جی...... میں پانگرے سرکار کے حکم سے لکھنؤ گیا تھا وہاں سے یہاں آیا ہوں۔ حضور پانگرے سرکار کو ایک باور چی۔''

''یہ پانگرے صاحب کون ہیں؟''

''آپ پانگرے سرکار کو نہیں جانتے؟ نہیں آپ ضرور جانتے ہوں گے۔ پانگرے سرکار وہی جون پور ریاست کے راجا۔ اب تو دیسی راج میں ان کی ریاست بھی ختم ہوگئی۔ ورنہ انگریز بہادر کے راج میں ڈھر ولایت تک ان کی دھوم تھی۔ اب بھی ان کی شان وشوکت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اب انہوں نے کئی قسم کے کارخانے اور ملیں جاری کردی ہیں جن کے ذریعے سے انھیں لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے ہر ماہ۔ ہیں تو ہندو لیکن تعصب چھو کر نہیں گیا سنہ 1947 میں اتنے فسادات ہوئے لیکن ہم ہمیشہ سرکار کے ساتھ رہے۔ کیا مجال جو کسی کا بال بھی بیکا ہوا ہو۔ سچ مچ سرکار صحیح معنی میں گریٹ ہیں۔''

یوپی میں ہر چھوٹا بڑا زمیندار راجہ کہلاتا تھا۔ اس لیے مجھے ان سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے مطلب کی بات دریافت کی ''اچھا تو آپ......''

''جی میں سرکار کا مصاحب ہوں۔''

اس پر میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ اس کا لب ولہجہ کسی حد تک شستہ ضرور تھا لیکن شخصیت ایسی نہیں تھی کہ اس پر یقین کیا جاسکے...... یا پھر ان کی صورت سے راجہ صاحب کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

''ہاں تو بھائیں عرض کر رہا تھا کہ مائیں ان مصاحبین میں سے ہوں......''

''آپ کا کام کیا ہوتا ہے۔''

''یہی سرکار کا دل بہلانا۔ چٹکلے سنانا، انھیں خوش رکھنا...... جی تو سرکار کا مطلوبہ

باورچی مجھے یہاں مل گیا تھا۔ بھائیں نے روپے کے لیے اسی ہوٹل کا پتہ لکھا تھا۔لیکن روپیہ ابھی تک نہیں آیا......اگر دو روپے عنایت کیجیے تو ایک تار روانہ کردوں۔"

اس قسم کے مسافر ہمیشہ مشکوک ہوا کرتے ہیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا تو انہوں نے فوراً کہا" بھائیں تار کا مضمون لکھے دیتا ہوں آپ ملازم کو بھیج کر تار دلوادیں بس مجھے روپے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانگرے سرکار تار دیکھتے ہی روپیہ بھجوادیں گے۔"

اس کے اس بیان سے سچائی کی بو آئی۔ میں نے سوچا دو روپے کی حیثیت ہی کیا ہے۔اتنا سا اعتبار کر لینے میں کیا حرج ہے۔

ملازم کے جانے کے بعد شاہا صاحب نے گفتگو جاری رکھی۔

سردار صاحب' آپ کو دیکھ کر مجھے ایک اور سردار صاحب یاد آرہے ہیں......

میں چپ رہا لیکن شاہا صاحب جاری رہے۔

''وہ پانگرے سرکار کے دوست ہیں وہ بھی کسی سکھ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ہی کا سا ڈیل ڈول۔ یہ بھرپور اور بارعب چہرہ مضبوط جسم۔ آپ ہی کے ہم عمر۔ کیوں صاحب آپ کی عمر دریافت کرسکتا ہوں؟"

میں نے خشک لہجے میں جواب دیا"یہی پچاس سال کے لگ بھگ۔"

''تعجب! تعجب! حالانکہ آپ کی اتنی عمر ظاہر نہیں ہوتی۔"

''اٹھائیس برس کا تو میرا لڑکا ہے۔"

''اچھا تو چھوٹے حضور کیا کرتے ہیں؟"

''وہ ملٹری میں ہے اس سے چھوٹا جہاز رانی سیکھ رہا ہے اور اس سے بھی چھوٹا ابھی پڑھتا ہے۔"

''خوب خوب۔اللہ نے صاحب زادیاں کتنی عطا فرمائی ہیں؟"

''اس باب میں سخت بدنصیب واقع ہوا ہوں۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی بچپن میں مرگئی۔"

''اللہ کی دین ہے، اللہ کے کام نیارے ہیں......جن سردار صاحب کا ذکر بھائیں

کر رہا ہوں ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی...... صاحب آپ ان کے ہم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ جناب وہ زمین پر کھڑے ہو کر شیر کا شکار کھیلتے ہیں۔ پانگرے حضور ان سے کہا کرتے ہیں ارے سردار صاحب آپ تو خود ہی شیر ہیں۔ ہاہاہاہا۔"

اس کے بعد چار دن گزر گئے۔ پانگرے سرکار نے تار کا جواب تک نہ دیا۔ روپے بھیجنے تو رہے درکنار۔

ایک بار جب کہ میں شاہا کے کمرے کے آگے سے گزرا تو خیال آیا کہ اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرلوں۔ میں عموماً مسافروں کے کمروں میں جانے سے احتراز کرتا ہوں۔ لیکن یہ معاملہ ذرا مشکوک تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے میں نے آواز دی۔

"شاہا صاحب۔"

ادھر شاہا صاحب تہبند لہراتے دکھائی دیے۔ مجھے دیکھتے ہی فرش پر بچھ گئے۔ باچھیں کھل گئیں۔ "آیئے آیئے تشریف رکھئے"

ادھر اُدھر کی سرسری باتوں کے بعد میں نے کہا" آپ کا بل بڑھ رہا ہے۔ تار کا جواب بھی نہیں آیا۔"

"کچھ مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ہے سرکار شکار پر چلے گئے ہیں۔"

اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ بہت دنوں تک نہیں آسکیں گے۔

"جی نہیں ایسی بات نہیں ہے، سرکار جنگلوں میں مارے مارے نہیں پھرتے ہیں وہی راجاؤں والا حساب ہے۔ جنگل میں کل انتظامات ہوجانے پر ہی جاتے ہیں اور دو دن دھائیں دھائیں کرکے لوٹ آتے ہیں۔"

یہ گویا اشارہ اس امر کی طرف بھی تھا کہ میں شاہا نہیں ہوں۔ سچ سچ اس کا بات چیت کا انداز بڑا دلکش تھا...... آنکھوں اور نقلی بھوؤں سے کام لینا وہ خوب جانتے تھے ہنستے تو مضبوط پیلے دانت اور بدصورت مسوڑھے دکھائی دینے لگتے۔ اس وقت میرا دھیان ان کی باتوں کی جانب نہیں تھا۔ بلکہ اب میں ان کی کرسی کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

اس کی عمر بہ مشکل بارہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن اس قدر سنجیدہ مانوں کہ ساٹھ برس کی بڑھیا ہو۔ اس کا رنگ ذرا کھلتا ہوا سا سانولا۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور اداسی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹ ترشے ہوئے۔ وہ خوبصورت تو نہیں۔ البتہ پرکشش بچی تھی۔

میرے دریافت کرنے پر شاہا نے سر گھما کر بچی کی جانب دیکھا اور تعارف کرایا کہ یہ میری بچی ہے۔ اٹھو بیٹی سردار صاحب کو سلام عرض کرو۔''

اس پر بچی اٹھ کر مؤدبانہ کھڑی ہوگئی اور اپنا دبلا پتلا ہاتھ پیشانی تک لے جا کر آہستہ لہجہ میں بولا۔ ''سلام عرض کرتی ہوں۔''

مجھے اس پر بڑا پیار آیا۔ سوچا باپ نے بچی کو اچھی تربیت دی ہے۔ میں نے کمزور شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے قریب کھینچا اور اس کی پیشانی چوم کر بولا۔ ''تم تو بڑی اچھی سی بچی ہو۔'' شاہا صاحب مجھے آپ پر رشک آتا ہے۔

اس پر شاہا نے دعا مانگنے کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی کھٹ سے اوپر کو چڑھ گئیں اور نصف حد تک غائب ہوگئیں۔ پھر اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ ''یا اللہ! یا رسول پاک تیرا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔''

شاہا اسی انداز میں بیٹھے کچھ دیر تک آسمان کی جانب تکتے رہے پھر انھوں نے پلکوں کو جلد جلد جھپکایا جیسے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولے ''سردار صاحب' یہ بچی فرشتہ ہے فرشتہ۔''

میں نے ایک بار پھر بچی کے معصوم چہرے کا جائزہ لیا اور تہ دل سے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بے شک بے شک۔''

دن گزرتے گئے۔ شاہا کا بل بڑھتا جا رہا تھا۔ میں اکثر ان کی بچی عائشہ سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت پیاری لگتی تھی۔ میں شاہا سے کہا کرتا تھا ''کاش مجھے بھی بچی ہوتی۔ شاہا باتوں کے بادشاہ تھے۔ وہ نہ صرف ہاں میں ہاں ملاتے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیتے یہاں تک کہ یہ یاد ہی نہ رہ جاتا کہ اصل بات کہاں سے شروع ہوئی تھی۔

مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے زور پر اظہار تاسف کرتے رہے وہ اکثر کہتے کہ دنیا میں نت نئے جھگڑوں اور دکھوں کی وجہ یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے نبیوں کی تعلیمات بھول گئے ہیں۔ کسی کو کیا کہوں۔ خود مسلمان وہ مسلمان نہیں رہے۔ سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی سوانح حیات ملاحظہ فرمایئے تو حیران و ششدر رہ جایئے۔ حضور کی زندگی میں سے ایک چھوٹا سا واقعہ عرض کرتا ہوں حضور کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ایک کوچے سے ہوتے ہوئے گھر لوٹ آتے تھے وہاں ایک نہایت بدظن خاتون رہتی تھی۔ وہ حضور کی تعلیمات کو نعوذ باللہ پسند نہیں کرتی تھی اور اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت ادھر سے گذرتے تو وہ خبیثہ مکان کی کھڑکی میں سے کوڑے کا بھرا ہوا ٹوکرا حضور پر دے مارتی۔ مصاحبین مارے غضب کے کانپنے لگے۔ لیکن آنحضرت ان کو نہ روکتے اور کمال ضبط سے کام لے کر اپنے لبادے اور ریش شریف کو کوڑے کرکٹ سے پاک کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ان پر کوڑے کا ٹوکرا نہیں پھینکا گیا۔ آنحضرت کے قدم رک گئے اور انھوں نے مصاحبین میں سے ایک کو اشارہ کیا کہ معلوم کرو۔ 'آج خاتون موصوف نے عنایت کیوں نہیں کی؟ مصاحب خبر لایا کہ آج اس خاتون کا انتقال ہو گیا ہے۔؟''

یہ کہہ کر شاہانے پر آب آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا '' آپ کو معلوم ہے اس پر آنحضرت نے کیا کیا؟— آنحضرت نفس نفیس تعزیت کے لیے مکان پر چڑھ گئے۔''

اس کے بعد شاہا پھوٹ کر رونے لگے۔

خود میری آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں۔

کیا آج کل کی دنیا میں کریکٹر کی ایسی اعلیٰ مثال ڈھونڈنے سے بھی مل سکتی ہے۔

عائشہ کی موجودگی اور شاہا سے اس قسم کی باتوں کا نتیجہ تھا کہ میں نے بل کی ادائیگی کے لیے سختی سے تقاضا نہیں کیا۔ یوں بھی مجھ سے آنکھیں چار ہوتے ہی شاہا محجوب ہو کر اظہار تاسف کرنے لگتا۔ نہ جانے سرکار خاموش کیوں ہیں سرکار نے پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا ممکن ہے سرکار طویل دورے پر چلے گئے ہوں۔ سردار صاحب! سرکار نے بڑا اعلیٰ دماغ پایا ہے۔

انھوں نے پہلے ہی سے بھانپ لیا تھا کہ حکومت ہند ریاستوں کو ختم کر دے گی۔ چنانچہ انھوں نے ایسے ایسے کاروبار شروع کر دیے کہ ماہانہ لاکھوں کی آمدنی پیدا کر رہے ہیں۔"

غرض اس طرح گیارہ دن بیت گئے۔

ایک روز دوپہر کے وقت میں ان کے کمرے کے آگے سے گزرا تو ان کا دروازہ نیم وا پایا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دستک دی۔ شاہا صاحب ہیں کیا؟

قدرے سکوت کے بعد عائشہ کی شیریں آواز سنائی دی۔ باہر گئے ہیں۔"

میں نے اندر جھانک کر دیکھا کہ عائشہ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر دو زانوں بیٹھی ہے۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا۔

''کیا تم نماز بھی پڑھ لیتی ہو؟''

''جی نہیں۔'' اس نے شرما کر جواب دیا۔ ابا نے سکھائی ہی نہیں۔ لیکن میں دو زانو ہو کر خدا سے دعا مانگ لیا کرتی ہوں۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے عائشہ کو اپنے قریب بلایا اور پیار سے پوچھا۔ ''اچھا تو تمھیں نماز پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"

''جی—'' اس کی آواز بے حد شیریں اور لب و لہجہ بہت پیارا تھا۔ میں نے اس کے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے اس کے ٹھنڈے رخسار کو چوم لیا اور کہا۔ ''عائشہ تم ہماری بیٹی بن جاؤ۔''

''بہتر۔''

مجھے اس کا لفظ ''بہتر'' کہنے کا انداز بہت بھلا معلوم ہوا۔ پھر ہم تمھیں نماز پڑھنے کا طریقہ سکھانے کے لیے کسی اچھے مولوی صاحب کو بلا دیں گے۔"

''بہتر۔''

''بھئی یوں نہیں، ہمارا دل خوش کرنے کی باتیں نہ کرو۔ سچ کہو ہماری بیٹی ہو نا تم؟''

''جی بالکل'' اس نے قطعاً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اسی شام شاہا صاحب مجھے الگ ایک گوشے میں لے گئے اور بولے ''میں بے حد

شرمندہ ہوں، نہ جانے اب تک روپے کیوں نہیں آئے۔ زیادہ عرصے تک یہاں رہنا میرے لیے دوبھر ہو رہا ہے۔ ایک تجویز عرض کروں؟"

یہ کہہ کر شاہا نے پر خلوص انداز سے میری جانب دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب یہ چڑیا پُھر سے اڑنا چاہتی ہے۔ شاہا صاحب بولے۔

"آپ اجازت دیں تو میں لوٹ جاؤں۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کے روپے بھجوا دوں گا۔"

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ ایسے نازک موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ قانون کا سہارا لینا بے کار تھا۔ نہ شاہا صاحب کے پاس قیمتی سامان ہی تھا۔ وہ پھر بولے۔

"سردار صاحب، ایک زحمت دینا چاہتا ہوں ریلوے کا کرایہ ادا کرنا ہوگا آپ کو۔"

یہ کہہ کر انھوں نے ایک بار پھر کمال خلوص سے مجھ سے نظریں ملائیں۔

"بھائیں درحقیقت بہت شرمندہ ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ میرا اعتبار کر سکتے ہیں۔"

تجربہ یہی کہتا ہے کہ ایسے موقع پر ایک دمڑی تک وصول نہیں ہو سکتی۔ ننانوے فی صدی یقین تھا کہ اب یہ روپے مجھے نہیں مل سکیں گے لیکن بزنس جوا ہی تو ہے۔

"سردار صاحب! میری ننھی بچی کا ہی خیال کیجیے۔"

میں رضامند ہو گیا۔

اس پر شاہا نے جیب میں سے سلولائیڈ کی بنی ہوئی پیلے رنگ کی ایک ڈبیا نکالی۔ اور پھر میری جانب پر آب آنکھوں سے دیکھ کر آگے بڑھایا۔ "یہ لیجیے درویش کی نشانی اس میں ایک تعویذ ہے، اسے سنبھال کر رکھیے۔ اللہ بہت دے گا۔"

یہ سن کر میں بدکا۔ سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ محض درویش کی نشانی۔ میرے پاس رہ جائے اور درویش کا کچھ پتہ ہی نہ چلے۔ چنانچہ میں نے ڈبیا کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ دیکھیے شاہا صاحب! بزنس بزنس ہے، تعویذ رہنے دیجیے میں بس یہ چاہتا ہوں کہ آپ جاتے ہی میرا روپیہ مجھ کو روانہ کر دیجیے گا۔"

''انشاء اللہ! انشاء اللہ! آپ کا روپیہ فوراً روانہ کر دینا تو میرا فرض ہے اور آپ دیکھیے گا کہ میں اپنا فرض کس طرح پورا کرتا ہوں۔ رہا یہ تعویذ تو اسے محض درویش کی نشانی سمجھ کر قبول فرما لیجیے۔ آپ اس کی تاثیر دیکھ کر حیران رہ جایئے گا۔''

میں اس فضول حرکت پر ہچکچا رہا تھا۔ لیکن شاہا نے بصد اصرار ڈبیا میرے ہاتھ میں تھما دی۔

اس رات شاہا صاحب نے مجھ سے بیس روپے نقد لیے اور بل چکانے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ دن گزرتے گئے شاہا صاحب نے کوئی خبر نہیں بھیجی اور نہ روپیہ بھیجا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ شاہا صاحب تو گئے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

البتہ ایک بات بہت عجیب معلوم ہوئی وہ یہ کہ جب سے وہ تعویذ میرے قبضے میں آیا تھا آمدنی سچ مچ بڑھ گئی تھی۔ دکانداری چمک اٹھی تھی۔ میری بیوی کہتی تھی کہ یہ اسی تعویذ کی برکت ہے۔

لیکن میں اسے محض اتفاقی امر سمجھتا تھا۔ بھلا شاہا جیسے آدمی میں کوئی کرامات کہاں سے آسکتی تھی۔

شاہا کے دیے ہوئے پتے پر چند خطوط لکھے گئے جواب ندارد کا معاملہ تھا سوچا قانونی چارہ جوئی کی جائے اس سے روپیہ بھلے ہی نہ ملے شاہا صاحب کو پریشانی تو ہوگی۔

وکیل سے مشورہ لینے سے پہلے میں بیوی کے پاس گیا۔

بیوی نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتے کیا ہیں اس میں آیت لکھی ہوگی کوئی۔''

میں نے کچھ کہے بغیر کاغذ کھولا یہاں تک کہ فل اسکیپ کا پورا کاغذ میرے سامنے تھا جن کے بیچوں بیچ خوب موٹے حرفوں میں لکھا تھا کہئے کیسا بنایا۔ آپ کا شاہا۔

یہ بات میری امید کے مطابق ہی تھی۔ تب میں بیوی کے بھولے پن اور تعویذ کی اصلیت پر ایک زوردار قہقہہ لگانے ہی والا تھا کہ کاغذ کے ایک کونے میں کچھ بہت ہی چھوٹے چھوٹے اور ٹیڑھے میڑھے حرف دکھائی دیے لکھا تھا۔

"میں اپنے خدا سے ہر روز آپ کے سکھ کے لیے دعا مانگا کروں گی۔"

اور یکا یک میرا قہقہہ حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ مقدمہ چلانے کا خیال چھوڑ کر میں نے تعویذ بیوی کی طرف بڑھایا تو اس نے پوچھا کیا آیت ہی لکھی ہے نا بے شک! میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

☆☆☆

یہ افسانہ "روح ادب" (سنہ نامعلوم) میں شائع ہوا تھا کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈرامے

قلوپطرہ کی موت

افراد

1- دنیا کی ایک حسین ترین عورت، جس کا حسن انقلابات اور خونریزیوں کا باعث ہوا جس ساحرہ کے حسن وعشق کے قصے آج بھی دریائے نیل کے ماہی گیروں کو ازبر یاد ہیں یعنی مصر کی رانی......قلوپطرہ۔

2- ایک خوب صورت ناگن، جس نے دنیا کو بتا دیا کہ ایک ناکام عورت کس طرح اپنے ملک، اپنے محبوب کی تنزلی کا باعث بنتی ہے اور کس طرح دیوتاؤں اور خبیث روحوں کے قہر کو دعوت دیتی ہے یعنی قلوپطرہ کی داسی...... چیرمیاں

3- اوسارس کے پجاری کا بیٹا، قلوپطرہ کے خلاف باغیوں کے سرغنہ، مگر حسن کے پہلے بے پناہ حملے کے سامنے پسپا ہو جانے والا ناکام عاشق، اصلی نام ہرمشس، لیکن قلوپطرہ کے دربار میں شاہی طبیب کی حیثیت سے......اولمپس۔

4- ایک زبردست سالار جنگ، جس کے بازوؤں میں قوت تھی، تلوار میں تڑپ، اکھڑ اور جنگجو۔ فاتح اور مغرور، مگر آستانِ حسن پر سر جھکا دینے والا قلوپطرہ کا کامیاب

عاشق......انطونی

علاوہ ازیں آئرس اور ایک حبشی

زمانہ: جب ایک طرف سیرز اور انطونی جیسے بے بدل اور اولوالعزم فاتح پیدا ہوئے اور دوسری طرف قلوپطرہ، مصر کی رانی، ایک کافر جمال زہریلی ناگن جس نے ان بہادروں پر بھی فتح پائی۔

مقام...........اسکندریہ

ہیلن، قلوپطرہ، میری (Mary of Scots) وغیرہ ان چند عورتوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنا حسن سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا۔ اور جو تاریخ عالم میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان گنتی کی عورتوں کی بابت بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ قلوپطرہ کی رومان انگیز زندگی کی کشش دیکھیے کہ شیکسپیئر برنارڈ شاہ اور رائیڈر ہیگرڈ جیسے مصنفین بھی اس طرف توجہ دیے بغیر نہ رہ سکے رائیڈر ہیگرڈ نے قلوپطرہ کی داستان محبت کو ایک نئے پیرائے میں لکھا۔ مندرجہ ذیل ایک ایکٹ کے ڈرامے کو اس کتاب 'قلوپطرہ' کا ایک باب سمجھنا چاہیے۔ قلوپطرہ نے 29 برس کی عمر پائی۔ اس کی موت کی بابت بہت سی روایات مشہور ہیں۔ چونکہ میں نے یہ واقعہ رائیڈ ہیگرڈ کی کتاب سے لیا ہے۔ لہٰذا واقعہ میں کچھ قطع برید کے بعد موت کی روایت وہی قائم رکھی گئی ہے۔

منظر اوّل

شاہی عمارت کا ایک کمرہ

وقت ——— صبح

ایک طرف دو بھاری ستون ہیں جن پر عجیب صورتیں اور سنہری و روپہلی نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ان دوستونوں کے درمیان دو دیو قامت برہنہ مجسمے ایسی صورت میں بنے ہوئے ہیں۔ جیسے کہ وہ کرسیوں پر بیٹھے ہوں اور ان کے ہاتھ ان کے زانوؤں پر ہیں۔ دیواروں پر قسم قسم کی صورتیں بنی ہوئی ہیں ایک اونچے چبوترے پر تخت شاہی ہے جس کے دونوں بازوؤں کی جگہ دوشیر ببر بنے ہوئے ہیں۔ کرسی کی پشت ایسی ہے جیسے مور پر پھیلائے رقص کر رہا ہو۔ تخت شاہی کے آگے شیر کی کھال بچھی ہوئی ہے۔ کمرے میں خاموشی اور سکون ہے۔ ایک دروازے سے مہارانی قلوپطرہ اندر داخل ہوتی ہے اس کے ساتھ اس کی خوب صورت باندی چیرمیاںؔ ہے۔ قلوپطرہ کے سر پر تاج شاہی ہے، گلے میں قیمتی موتیوں کا ہار ہے، باریک لباس اور پاؤں میں چپلیاں جن میں ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے چہرے

سے شاہانہ وقار، عزم و استقلال کے آثار عیاں ہیں اور ساتھ ہی سیاست دانوں کی سی سنجیدگی اور جہاندیدہ بزرگوں کی سی متانت بھی ہویدا ہے۔ وہ پر وقار انداز سے چلتی تخت کے قریب پہنچتی ہے اور ایک شاہانہ تکبر کے ساتھ اس پر بیٹھ جاتی ہے، اس کا سر اٹھا ہوا ہے نظریں سامنے کی طرف گڑی ہوئی ہیں۔ چیتا اس کے پاؤں کے قریب بیٹھ جاتا ہے اور چیر میاں مور چھل کرنے لگتی ہے۔

قلوپطرہ: چیر میاں!...... کیا وہ آئرس ہی ہے نا؟

چیر میاں: (ذرا جھک کر) ہاں مہارانی! وہ آئرس ہی ہے...... ملاحظہ کیجیے اس کی چال۔ ایک بزدل چھچھوندر کی طرح تاریک دیوار کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ (قلوپطرہ خاموش رہتی ہے۔)

چیر میاں: اس میں کچھ راز ہے (بلند تر آواز سے) او آئرس! تو جو لومڑی کی طرح منہ لٹکائے چلی آتی ہے، تیری سیاہ آنکھوں میں آنسو ایسے پوشیدہ ہیں جیسے کالی گھٹاؤں میں پانی—— سچ بتلا کیا ماجرا ہے؟

قلوپطرہ: پیش تر اس کے کہ تو چیر میاں کے سوال کا جواب دے اور پیش تر اس کے کہ تو ایک قدم بھی آگے بڑھائے (تیز اور کرخت آواز میں) تو بتا کہ تیرے پیچھے تاریک گوشے میں دبکا ہوا سیاہ فام حبشی کون ہے؟

آئرس: پہلے حبشی اور پھر قلوپطرہ کی طرف پرنم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے) مہارانی

قلوپطرہ: (فرش پر پاؤں مار کر آئرس!!)

آئرس: (رو کر) مہارانی!!

قلوپطرہ: (کڑک کر) چیر میاں! نیزہ لاؤ۔

(آئرس تیر کی سی تیزی سے آتی ہے اور خود کو قلوپطرہ کے پاؤں پر گرا دیتی ہے، قلوپطرہ اس کے بال پکڑ کر اسے اوپر اٹھاتی ہے۔)

آئرس: (ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے) مہارانی! مہارانی!! مجھے تاب نہیں...... مجھے تاب نہیں...... یہ حبشی عالی جاہ انطونی کے پاس سے آیا ہے۔

(قلوپطرہ نہایت خفگی کے ساتھ اس کے بال کھینچ کر پیچھے کی طرف زور کے ساتھ دھکیل دیتی ہے اور خود پھر اسی وقار کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے)

قلوپطرہ: او سیاہ فام غلام! بول۔

(حبشی کی ٹانگیں لرزنے لگتی ہیں۔)

قلوپطرہ: کیا تو شاہ انطونی کے پاس سے آیا ہے؟

حبشی: میرے نصیب میں یوں ہی لکھا تھا۔ شاہوں کو شاہوں کے پیغامات پہنچانا ہر ایک کی تقدیر میں نہیں ہوتا۔

قلوپطرہ: تو نے ٹھیک کہا۔ بتا تجھے اور کیا کہنا ہے؟

حبشی: کاش! میں یہ پیغام تحریر کی صورت میں پیش کرسکتا۔

قلوپطرہ: (چیرمیاں کی طرف ہاتھ بڑھا کر) نیزہ۔ نیزہ ہاتھ میں لے لیتی ہے۔

حبشی: (خوف زدہ ہوکر) اور مہارانی! مجھے وہ الفاظ نہیں ملتے......

قلوپطرہ: (نیزہ ہاتھ میں تولتے ہوئے) اچھا تو......

(دوسرے لمحے حبشی فرش پر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔)

حبشی: (سر اٹھا کر) پناہ! مہارانی! پناہ!! جب عالی جاہ نے حضور کی موت کی خبر سنی تو انھوں نے اپنے سینہ میں خنجر گھونپ لیا۔

قلوپطرہ: (انتہائی غصہ میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے) کمینہ! کتا۔

حبشی: (گڑگڑا کر) بخش دے۔ مہارانی میں عالی جاہ کے دستر خوان سے بچے کھچے ٹکڑے کھانے والا غلام ہوں۔

(قلوپطرہ کے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے اور وہ نیزہ، جان کے خوف سے فرار ہوتے ہوئے حبشی کی پشت میں پیوست ہوجاتا ہے اور وہ بھوکے بھیڑیے کی مانند ایک دل دوز چیخ مار کر گر پڑتا ہے اور پھر تڑپ کر مر جاتا ہے۔)

قلوپطرہ: (تخت پر بیٹھتے ہوئے) چیرمیاں! کیا ایسا پیغام لانے والے کو اس سے بہتر انعام دیا جاسکتا ہے؟

چیرمیاں: نہیں مہارانی جی!

قلوپطرہ: (سکوت کے بعد سامنے خلا میں گھورتے ہوئے) چیرمیاں!

چیرمیاں: مہارانی!

قلوپطرہ: تونے سنا اس سیاہ کتے نے کیا کہا!

چیرمیاں: ہاں مہارانی جی اس نے کہا تھا کہ......

قلوپطرہ: اس نے کہا— بس چیرمیاں (اس کا ہاتھ تھام کر) بس وہ الفاظ ایسے نہیں جنھیں میں پھر سن سکوں۔

(اس کی گردن میں خم آجاتا ہے اس کا سر جھک جاتا ہے۔ آئرس بڑھ کر اسے سنبھالتی ہے۔)

آئرس: مہارانی بے ہوش ہوگئیں۔ جا چیرمیاں تھوڑی سی شراب لے آ۔ (پیالہ لے کر پلاتی ہے) مہارانی جی! ہوش میں آیے (سر اٹھا کر) چیرمیاں! یہ شور کیسا سنائی دے رہا ہے؟ دیکھو تو۔

چیرمیاں: (دریچے میں سے جھانک کر) ہائے! یہ تو عالی جاہ انطونی ہیں۔ خون میں لت پت ہورہے ہیں۔

آئرس: انھیں اوپر لانا چاہیے۔

چیرمیاں: مگر مہارانی نے دروازہ کھولنے کی ممانعت کردی ہے۔

آئرس: مہارانی کو ضرور کچھ خطرہ ہوگا۔ اتنے شور وغل میں دروازے کا کھول دینا مناسب نہیں۔

قلوپطرہ: (ہوش میں آکر) کیا ہے؟

(چیرمیاں پیچھے کی طرف سرک کر جاتی ہے تاکہ اسے کچھ نہ کہنا پڑے۔ آئرس چیرمیاں کو بولنے کا اشارہ کرتی ہے۔)

قلوپطرہ: (گھوم کر چیرمیاں کی طرف دیکھتی ہے) کیوں او چیرمیاں یہ کیا مشورے ہورہے ہیں۔ آخر کیا بات ہے؟

(نیچے شور وغل کی آوازیں اٹھتی ہیں۔ چیر میاں بلا جواب دیے ایک رسّا لے کر دریچے کی طرف جاتی ہے۔ قلوپطرہ اور آئرس بھی دوڑ کر جاتی ہیں اور رسّا نیچے لٹکا دیا جاتا ہے۔)

قلوپطرہ: (منہ ڈھانپ کر) چیر میاں یہ کیا۔

چیر میاں: مہارانی جی! طبیعت کو سنبھالیے۔ لوگوں نے رسّا عالی جاہ کی کمر سے باندھ دیا ہے آپ کی مدد کے بغیر اُنھیں اوپر کھینچنا مشکل ہے۔

(تینوں زور لگاتی ہیں۔ کئی دفعہ رسّا ان کے ہاتھوں سے نکل جاتا ہے مگر آخر کار وہ کامیاب ہوجاتی ہیں۔)

قلوپطرہ: (ہانپتے ہوئے) آئرس چیر میاں!! آؤ انھیں بستر پر لٹا دو۔ اور دیکھو وہ رسّا نیچے لٹکا دو۔ تاکہ اولمپس اوپر آجائے۔

(انطونی کو لٹا کر قلوپطرہ مارے غم کے ذرا دور جا کھڑی ہوتی ہے۔ انطونی ہوش میں آجاتا ہے۔)

انطونی: (حیرت سے) قلوپطرہ۔

قلوپطرہ: انطونی۔

انطونی: آؤ، قلوپطرہ۔

(قلوپطرہ بازو پھیلائے ہوئے انطونی کے اوپر جا گرتی ہے)

قلوپطرہ: (رو کر) میرے تاج! میرے مالک! میرے آقا!!

انطونی: تم زندہ ہو؟ یہ ہاتھ کس کا ہے؟ قلوپطرہ! قلوپطرہ!!

قلوپطرہ: (دامن میں منہ چھپا کر) انطونی! تم نے مجھ پر شک کیا۔ تم نے سمجھا کہ میں نے لڑائی میں تمھیں دھوکا دیا۔ حالانکہ یہ بات ہرگز نہ تھی میری روح ہی دہشت زدہ ہوگئی۔ اس لیے میں میدان جنگ میں سے بھاگ نکلی۔ مگر میں تمھیں کس طرح سمجھاتی تم مجھ پر شبہ کرو؟ کیا یہ میرے لیے مرجانے کا مقام نہیں، میں تو عنقریب خودکشی کرنے والی تھی، اس لیے میں نے تمھیں اطلاع بھیج دی۔ لیکن میں یہ نہیں

جانتی تھی کہ تم پر اس کا ایسا اثر ہوگا۔

انطونی: قلوپطرہ! میرا دل صاف ہے، جو ہوا سو ہوا۔ اب لحہ بھر کے لیے بیٹھو۔ کچھ پیار کی باتیں کرو۔

قلوپطرہ: (پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اور اپنے چہرے کو انطونی کے زخمی سینے پر رکھتے ہوئے) انطونی! انطونی!!

انطونی: (خفگی سے) یہ تو نے کیا کیا؟ تمام چہرہ خون سے رنگین کر لیا۔ قلوپطرہ میرا آخری وقت ہے۔ میں تیری ایسی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں قلوپطرہ کی وہی صورت دیکھتے ہوئے مرجانا چاہتا ہوں جو کہ میرے دل میں بسی ہوئی ہے۔ لاؤ میں یہ خون آلود چہرہ صاف کر دوں۔

(کپڑے سے قلوپطرہ کا چہرہ صاف کرتا ہے۔)

قلوپطرہ: میرا جیسے دم گھٹا جا رہا ہے۔ آج اس دنیا کی وسعت بھی تنگ معلوم دے رہی ہے۔

انطونی: تجھے ان دیوتاؤں کی قسم جن کو تو نے اپنے افعال کی بدولت خفا کر دیا ہے۔ اب یہ تقریر ختم کر۔ اُس پرانی یاد کو تازہ کریں۔ وہ دن یاد نہیں؟ جب گھٹائیں جھوم کر اٹھتی تھیں، تم بربط کے ساتھ اپنی نقرئی آواز ملا کر جھوم جھوم کر گاتی تھیں اور میں ایک بچے کی طرح جھومتا تھا۔ بالکل ہمہ تن گوش......آہ وہ دریائے نیل کی راتیں......

(اس کے ہاتھ سے قلوپطرہ کا ہاتھ چھوٹ جاتا ہے)

قلوپطرہ: (گھبرا کر) انطونی!

انطونی: (ہوش میں آکر) کیوں؟ میں زندہ ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ کیا میں خاموش ہو گیا تھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا؟...... ہاں تو دیکھو کیا تمھیں وہ انطونی یاد ہے جس نے اپنی کشتی حیات کے چپو تمھیں سونپ دیے تھے۔ اور تم جس کی باتیں سنتی نہ تھکتی تھیں، لو! اب اس انطونی کے لبوں پر مہر سکوت لگنے والی ہے۔ ایسی کہ آئندہ وہ آواز تم کبھی بھی نہ سن پاؤ گی۔

قلوپطرہ: (شدّتِ غم سے چلّا کر) میرے مالک۔ آخر تم ایسی دل دکھانے والی باتیں کیوں

کرتے ہو؟

انطونی: اور جب انطونی مرجائے تو تم صبر کرنا اور زندہ رہنا۔

قلوپطرہ: (چلا کر) ایسا نہیں ہوگا۔ (روتے ہوئے اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھتے ہوئے) میرے سرتاج، میرے آقا آخر اس قدر بے قراری کیوں، ایسا کیوں ہونے لگا۔ نہیں تم نہیں مروگے۔

انطونی: (کمزور اور دھیمی آواز میں) کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک شخص جو تلواروں کے سائے میں پروان چڑھا ہو، جس کی زندگی کا زیادہ حصہ میدانِ جنگ میں گذرا ہو، وہ آج میدان کارزار میں اپنے کسی ہم پلّہ بہادر کی تلوار کے وار سے مرجانے کی بجائے ایک حسینہ کے زانو پر سر رکھے جان دے رہا ہے۔ بحیثیت ایک جنگجو سپاہی کے مجھے یہ موت پسند نہیں کیا کسی کشور کشا فاتح کو ایسی موت زیب دے سکتی ہے؟ مگر میں نے ایک بزدل کی طرح خودکشی کی اور پتھر کے کھردرے فرش پر زندگی کے آخری لمحات گن رہا تھا۔ میرے خیال میں یہ موت اس موت سے زیادہ راحت آمیز ہے۔ قلوپطرہ...... قلو......

قلوپطرہ: (دونوں ہاتھ اٹھا کر چلاتی ہے) چیرمیاں! (بال نوچتی ہوئی پچھاڑ کر گر پڑتی ہے) (چیرمیاں، آئرس اور اولمپس اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔)

منظر دوم

وہی کمرہ

وقت .... بعد از دوپہر

ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنیں بڑے بڑے مجسموں پر پڑ رہی ہیں۔ چیتا ان کے قدموں میں دبکا پڑا ہے۔ دیواروں پر کئی تصاویر فراعنہ مصر کی زندگی کے اہم واقعات پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک طرف لکڑی کی ایک طویل کشتی بنی ہوئی ہے۔ جسے ملاح کھے رہے ہیں، اور جس کے چپو سفید ہیں۔ مگر چپوؤں کے دستے سنہری ہیں۔ کوچ کے قریب بانسری، دف، بربط وغیرہ چند ساز پڑے ہیں۔ بھاری پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ سامنے کے بڑے دریچے میں سے شہر کی عمارتوں کے چوڑے چوڑے پتھروں کی دیواریں نظر آ رہی ہیں۔ دوسرے دریچے میں سے دریائے نیل کے کنارے گانے والے ملاحوں کے دیہاتی گیتوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک کونے میں ایک ہشت پہلو برتن رکھا ہے۔ جس میں کوئی خوشبو جل رہی ہے۔ اور دھوئیں کی پتلی سی لکیر بل کھاتی ہوئی چھت تک چلی گئی ہے۔ چیرمیاں پتھر کی بڑی میز پر کھانا چن رہی ہے اور ساتھ ہی کوئی گیت گنگنا رہی ہے، اولپس بھی پاس کھڑا داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔

اولپس: تم پھر گانے لگیں؟ مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا؟

چیرمیاں: یہ گھڑی تو خوشی منانے کی ہے تم متفکر کیوں کھڑے ہو — آہ عورت کا عشق جس نے تمھیں تباہ کر ڈالا، اب بھی تمھارے دل سے گیا نہیں۔

اولمپس: (ایک قدم آگے بڑھ کر) چیرمیاں! اب یہ طنز اور یہ مذاق ختم کر۔ اچھا تو قلوپطرہ بہت غمگین تھی۔ تم نے اس کی دل جمعی کرنی چاہی تو پھر اُس نے کیا کہا۔

چیرمیاں: مہارانی مجھ سے خفا ہو کر کہنے لگیں۔ ''میں مہارانی؟ کیا مذاق ہے۔ مجھ سے بانسری بجانے والی چھوکریاں اچھی ہیں۔ وہ کسبیاں میری نسبت آرام میں ہیں۔ جو اسکندریہ کی سڑکوں پر بے باکی سے گھومتی پھرتی ہیں' میری نسبت تو وہ چھوکرے تک اچھے ہیں۔ جو صبح کے وقت سبزیاں گدھوں پر لادے چلاّتے اور شور مچاتے شہر میں آیا کرتے ہیں — کیا میں ہی وہ سرکش ملکہ ہوں، جس کے حسن و جمال کا شہرہ دور دور تک تھا۔ کیا میں ہی وہ رانی ہوں جس کا غلام بننے میں انطونی جیسے فاتح نے فخر سمجھا۔ کیا میں ہی وہ مہارانی ہوں جس کے ابرو کے ایک اشارے نے باغی ہرمشس کو نیچا دکھا دیا۔ اور کیا میں ہی وہ حسینہ ہوں جس کی ایک ادا نے میرز کو جنگ کے تمام داؤں پیچ بھلا دیے تھے، او چیرمیاں میں انھیں رومیوں کے خوف سے یہاں دبکی بیٹھی ہوں، میں گرفتار کر لی جاؤں گی اور مجرموں کی طرح روم لے جائی جاؤں گی۔ پھر مجھے برہنہ جسم سڑکوں پر گھمایا جائے گا۔ رومی اور یونانی مجھ پر آوازیں کسیں گے میرے جسم کی نرم و خوشنما جلد دھوپ کی تپش اور زمین کی گرد کی وجہ سے بھدی ہو جائے گی — بتا بتا! تو بتا تیری مہارانی کی یہ بے بسی؟ کیا اس ذلت سے بچنے کی کوئی ترکیب نہیں؟''

اولمپس: پھر تو نے کیا جواب دیا؟

چیرمیاں: میں نے کہا ''ہاں مہارانی ہے۔''

اولمپس: خوب!

چیرمیاں: وہ ایک خشک ہنسی ہنس کر بائیں ہاتھ والے دریچے کی طرف چلی گئیں اور دور دریا کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں دبے پاؤں ان کے قریب پہنچی اور ان کی پشت پر ہاتھ

رکھ کر بولی۔ ''آپ ایک مہارانی کی طرح مرسکتی ہیں۔''

اولپس: شاباش!

چیرمیاں: پھر وہ میری طرف پلٹیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک نئی روشنی پیدا ہوگئی۔ اُن کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ ان کا سینہ تن گیا۔ مضبوط آواز میں کہنے لگیں۔ ''کیا میں مہارانی کی طرح مرسکتی ہوں؟'' میں اور قریب ہوگئی اور بولی ''بے شک مہارانی مرتے دم تک مہارانی ہی رہے گی۔''

اولپس: تو نے خوب کہا۔ اچھا پھر؟

چیرمیاں: مہارانی جی نے مجھے چھاتی سے لگا لیا اور کہنے لگیں ''تو نے ہر مرتبہ مجھے عمدہ ہی رائے دی۔'' پھر انھوں نے مجھے سینے سے علاحدہ کیا، اور پکار کر بولیں ''او آئرس! جلد جا اور میرے غسل کا سامان تیار کر، میرے لیے بہترین لباس لا۔ قیمتی خوشبوؤں سے میرا جسم معطر کردے — مہارانی، مہارانی ہی رہے گی۔'' تب اُنھوں نے کپڑے اتار دیے اور مجھے آخری دعوت کے لیے لذیذ ترین کھانے چننے کے لیے کہا، اور تمھارے لیے یہ حکم دیا کہ جب تم دعوت میں شامل ہونے کے لیے آؤ تو سب سے زیادہ تیز اور پرتاثیر زہر لیتے آؤ۔ کیا تم نے مہارانی کے حکم کی تعمیل کی ہے؟

اولپس: (مسکرا کر) یہ زہر تو میں نے تبھی تیار کر لیا تھا۔ جب ہم دونوں نے یہ سازش کی تھی۔

چیرمیاں: (ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر) خاموش! کہیں کوئی سن نہ پائے۔

اولپس: (آہستہ سے) آہ آخر کار اس کی موت کی گھڑی آن ہی پہنچی — میرا دل اب بھی اس عورت کی طرف مائل ہے جو میری بربادی کا باعث ہوئی — میں اس سے آنکھیں کیوں کر ملا سکوں گا۔ میں کیسے بول سکوں گا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔

چیرمیاں: کیا بڑبڑا رہے ہو۔ لو بیٹھو، مہارانی آتی ہی ہوں گی۔

(وقفہ)

چیرمیاں: اے لو! مہارانی آگئیں۔

(قلوپطرہ کا داخلہ۔ اس کا لباس مہین اور خوش رنگ ہے، سر پر تاج ہے جس پر گدھ کی شبیہ بنی ہوئی ہے۔ گدھ کے پھیلے ہوئے پر قلوپطرہ کے کانوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں۔ وہ کوچ پر بیٹھ جاتی ہے۔ آئرس مورچھل لے کر اس کے پیچھے کی طرف جا کھڑی ہوتی ہے۔ قلوپطرہ بلا کی حسین نظر آ رہی ہے۔ کھانا شروع ہوتا ہے—)

قلوپطرہ: (مسکرا کر) آج اس آخری دعوت میں بہت کم مہمان شامل ہیں۔ بیسیوں غلاموں کی بجائے آئرس مختلف کام انجام دے رہی ہے۔ سینکڑوں کنیزیں لا پتہ ہیں، مگر ہاں شریر چیرمیاں ابھی تک ساتھ دے رہی ہے۔ اور پھر میرے معزز مہمان اولمپس کی موجودگی میرے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہے— کیوں اولمپس! تم حسن کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟ کہو تو موت کے خوف نے میرے حسن کو پھیکا تو نہیں کر دیا۔ (ہنس کر) آہ! ٹھیک ہے۔ دیکھو چیرمیاں میرے خیال میں کسی بوڑھے مفکر کے ساتھ اس قسم کی شوخیاں کچھ نامناسب سی معلوم ہوتی ہیں۔

چیرمیاں: (منہ بنا کر) اوہو، حسینوں کو اور کام ہی کیا ہے، بس ستانا، جلانا، رلانا۔

قلوپطرہ: (ہاتھ اٹھا کر) نہیں چیرمیاں نہیں۔ دیکھو شرارت سے باز آ— اور تو بھولتی جا رہی ہے کہ تو اس وقت کس کے سامنے بول رہی ہے۔ مگر نہیں میں آج تم سے ایسے باتیں کروں گی جیسے کوئی عورت اپنی کسی سہیلی سے۔ ہاں البتہ رومی کتنے دیکھیں کہ وہ رانی کو باندی نہ بنا سکے۔

چیرمیاں: بوڑھے اولمپس نے ایک مہارانی کو مرتے کبھی نہ دیکھا ہوگا— (جھک کر) آہ! کیا آپ خفا ہو گئے؟

(اولمپس چپ سادھے رہتا ہے)

قلوپطرہ: خفا نہیں ہو گئے۔ لیکن یہ تو فلسفیوں کا قول ہے کہ بولو کم، سنو زیادہ۔

چیرمیاں: تب تو بے لطفی ہی رہے گی۔

قلوپطرہ: اگر تم بربط اٹھا لو اور ایک گیت سنا دو تو ساری بے لطفی جاتی رہے گی اتنے میں اولمپس کی زبان بھی کھل جائے گی۔

چیر میاں: (بربط ہاتھ میں لے کر) جو حکم (گاتی ہے)

اے میری مہارانی!
تجھے ہیلن کہوں، یا حسن کی دیوی زہرہ
جس کی پوجا اسکندریہ کی کمسن کسبیاں کرتی ہیں
تیرے بال ایسے ہیں، جیسے
کالی گھٹائیں،
مانگ، جیسے
کالی گھٹاؤں میں بگلوں کی قطار،
جب تیری پیشانی سے سیاہ زلفیں ہٹ جاتی ہیں، تو جیسے
یونانیوں کی دیوی اردرارات کے سیاہ پردے
ہٹا کر مشرق کے روپہلی پھاٹک کھول دے
آنکھیں، گویا
مے مدہوش کن سے لبریز دو جام، جن میں
لپٹی ہوئی بجلیاں۔
نگاہیں، جیسے
تاریک بادلوں میں سے طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں
لب، گویا
آب حیات کے چشمے!
رخساروں کی لالی، جسے دیکھ کر
شفق کی سرخیاں سپید پڑ جائیں
ٹھوڑی، جس طرح کہ

ایک سیب،
لرزاں سینہ، گویا
کسی مشرقی جھیل کی سطح آب پر متحرک کنول۔
آواز، جیسے
بربط کی تار پر پھولوں کی ڈالی آگرے
رفتار، جیسے
موسم برشگال میں بادل برس کر دھیرے دھیرے اڑے جا رہے ہوں۔
تیرا حسن، میری مہارانی!

پنہاں، شرمیلا، سہا ہوا، اور ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے والا نہیں، بلکہ تیرا حسن عریاں، ہر ادا بے باک، ہر نگاہ برق، ہر غمزہ ایک فتنہ ہے، تیرے حسن نے دن دہاڑے فاتح اور اکھڑ ڈاکوؤں کو لوٹ لیا۔

مگر آہ! یہ مٹھی بھر خاک
ہوا میں اڑا دی جائے گی، تیری ہڈیاں
زمین کے کیڑوں کی خوراک بنیں گی۔
(گانا ختم ہو جاتا ہے)

قلوپطرہ: (جھرجھری سی لے کر) تو نے سچ کہا، بہت تلخ حقیقت، مگر تو نے حسن کی تعریف کچھ ایسی بے باکی سے کی ہے کہ اولمپس جیسے خشک مزاج حکیم کے دل میں بھی لڈو پھوٹنے لگیں۔

(اولمپس خاموش رہتا ہے)

قلوپطرہ: (محویت میں) کیسا حسن ہوا ہوگا میرا، جب سبز غالیچہ میں سے نوخیز حسینہ کو نکلتے دیکھا تو اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ عورت ذات کا دشمن مغرور ہرمش میری نگاہ غلط انداز کے پہلے ہی تیر سے ایسا گھائل ہوا کہ جاں بر نہ ہو سکا، سرکش انطونی مجھ کو اپنانے کے لیے بھیڑ کی طرح حلیم ہوگیا— چیر میاں! جب کبھی میں خود پر نظر ڈالتی

ہوں اور اپنی عیش پسندیوں، ہوس رانیوں، نفس پرستیوں اور اپنی غیر معمولی فتحیابیوں کو دیکھتی ہوں۔ تو میں پھولی نہیں سماتی، مارے غرور کے تن جاتی ہوں۔

اولمپس: عورت سی ناپاک مخلوق پیدا ہی نہیں ہوئی، کیسی کیسی خونریزیاں، عیش پرستیاں اس کے نام سے وابستہ ہیں۔ عورت، گھناؤنے اور مکروہ گناہوں کا مخزن ہے۔

قلوپطرہ: آج کے دن سب معاف ہے ورنہ او بوڑھے اولمپس! یہ تیرے آخری الفاظ ثابت ہوتے۔ مگر بولو! اولمپس! تم کچھ بھی کہو بوقت گفتار تمھاری لانبی ہلتی ہوئی مضحکہ خیز داڑھی تمھاری باتوں کی تلخی کو بہت حد تک دور کر دیتی ہے۔

چیرمیاں: (موضوع بدلتے ہوئے) آج مشرق کی طرف سے سیاہ گھٹائیں جھوم کر اٹھی ہیں۔ سخت آندھی اور موسلا دھار بارش کے آثار نظر آتے ہیں۔

قلوپطرہ: ایک بات یاد آگئی۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں ایک شخص کا نام تھا سم نخ کرا۔ اسے برسات کے گیت خوب آتے تھے۔ کیوں ری تو جانتی ہے یا نہیں کہ ایسے گیت بھی ہوتے ہیں جو ہر خاص برسات میں گائے جاتے ہیں۔ مجھے تو موسیقی سے بہت دلچسپی ہے۔ فن کوئی بھی ہو اچھا ہے۔ تم بھولی تو نہ ہوگی۔ ہرمشس کو۔ میں ایسے گیت سنایا کرتی تھی اور وہ مختلف سیاروں کی گردش سے ایسے ایسے نتائج اخذ کرتا تھا کہ میں حیران رہ جاتی تھی۔

چیرمیاں: وہ باغی شہزادہ؟ پجاری؟

قلوپطرہ: (ہوا میں تاکتے ہوئے) ہاں وہی دیوی آئی سس (Isis) کا پجاری۔ دیوی آئی سس جو دیوتا اورسارس کی ماں بھی ہے، بہن بھی، بیوی بھی ہے اور بیٹی بھی۔

چیرمیاں: اچھا اب ان باتوں سے کیا حاصل؟

قلوپطرہ: ادھر آ تو میں تیری چھاتی پر ہاتھ رکھ کر دیکھوں، کیا تیرا دل اس ناکام عاشق کی یاد دہانی پر دھڑکنے لگا ہے؟ تیری محبت محض نفسانی تھی۔ تیرا عشق ادنیٰ قسم کا تھا۔ وہ باغی شہزادہ کبھی ناکامیاب نہ رہتا، مگر واہ رے عورت کا رشک، حسد۔ اس کی کامیابی میں روڑا اٹکایا تو نے، اس کی بغاوت کا بھانڈا پھوڑا تو نے، مجھے اس سے شادی

کرنے سے منع کیا تو نے، اچھا ہوا، مجھے افلطونی تو مل گیا— لیکن (ہاتھ پھیلا کر) چیر میاں جب الّو کے ہوکنے کی آواز سن کر وہ کہا کرتا تھا کہ "یہ الّو نہیں بلکہ وہ ماں ہے جو اپنے چھوٹے سے بچے کو چھوڑ کر مر جائے اور وہ اپنے بچے کی یاد میں ایسی دردناک آواز میں روتی ہے۔ وہ بڑے بڑے ہاتھوں سے اشارے کرتا اور کہا کرتا تھا کہ بدروحیں تاریک گلیوں میں گھومتی رہتی ہیں، سنسان گھروں کو اپنا مسکن بناتی ہیں، کچھ روحیں بڑے بڑے چگادڑوں کی شکل میں پروں کو پھڑ پھڑاتی دھند لکے میں اڑتی ہیں اور جب کسی راہ گیر کو دیکھ پاتی ہیں تو اس کی نرم گردن سے چپک کر تمام لہو چوس لیتی ہیں۔ کبھی شیر بن کر دہاڑتی ہیں اور کبھی گیدڑوں کے بھیس میں زور زور سے روتی ہیں، ایسی چڑیلیں بھی ہیں جو کہ پہاڑوں کی غاروں اور دلدلوں میں رہتی ہیں اور کمسن بچوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور ایک ڈائن ہوتی ہے جو بچوں کو اپنے پچھٹے پچھٹے دیدے دکھا کر مار ڈالتی ہے۔ یا ان کا دم کھینچ کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ (ہاتھ پھیلا کر) چیر میاں! آہ! اس کی شکل و شباہت اس کی تیز اور روشن آنکھیں میں نہیں بھول سکتی۔ وہ مصر کے قدیم فنون کا ماہر اور ماضی کے راز ہائے سربستہ سے بخوبی واقف تھا۔ کالا جادو، تنتر منتر، نجوم مسمریزم، بھوت پریت غرض کیا تھا جس سے وہ بے گانہ تھا— نا معلوم آج میں اس کی موجودگی کا احساس کیوں کر رہی ہوں؟ میرے دل پر کیوں بوجھ سا رہتا ہے، دماغ پر عجب قسم کا سایہ ہے، اور میری روح پر غبار سا چھایا رہتا ہے چیر میاں!

چیر میاں: (قلوپطرہ کا ہاتھ تھام کر) آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ کچھ اور بات کیجیے۔

قلوپطرہ: (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاں! ہاں سکھی تم ٹھیک کہتی ہو، ایسی باتوں سے میرا چہرہ اتر جائے گا— مجھے تو تفریح تعیش کا ذکر کرنا چاہیے، بدمست اور البیلی حسین رقاصاؤں کا ذکر کرنا چاہیے جو اسکندریہ کی گذرگاہوں پر بے باکی سے تھرک تھرک کر ناچتی ہیں اور عاشق مزاج نوجوانوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ یا مجھے اُن الہڑ، چھیل چھبیلی کمسن بانسری بجانے والیوں کی باتیں کرنی چاہئیں۔ جو، بانچوں

میں بھیک مانگتی پھرتی ہیں۔ یا چیر میاں تم بابلیوں کی دیوی اشطر کے مندر میں جانے والی دوشیزاؤں کی باتیں سناؤ جو آزادی کے ساتھ عارضی طور پر کسی نہ کسی نوجوان کو منتخب کر لیتی تھیں۔

چیر میاں: اور لیجیے۔آپ ہی سنایئے بھلا آپ کی داسی کو سوائے گانے کے کیا آتا ہے؟

قلو پطرہ: اچھا تو لو سنو۔ عشق کی داستانوں میں بابلیوں کی دیوی اشطر کا افسانہ بھی عجیب ہے۔ اُس نے بھی عشق کی راہ میں بہت سے مصائب کا سامنا کیا۔ طاموز ایک گڈریا تھا جس پر آسمانوں کی دیوی اشطر اور پاتال کی دیوی الاطو دونوں عاشق تھیں—طاموز مر گیا۔

چیر میاں: (نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے) ہائے یہ تو بڑا برا ہوا۔

قلو پطرہ: مرنے کے بعد طاموز کو پاتال میں جانا پڑا۔ جہاں کہ ہر ایک کو موت کے بعد جانا ہی پڑتا تھا اور یہ وہ جگہ تھی جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی اور جہاں کھانے کے لیے کیچڑ ملتی تھی۔

چیر میاں: تو گویا طاموز دیوی الاطو کے قابو میں آ گیا۔

قلو پطرہ: اب ادھر سے دیوی اشطر اپنے محبوب کی تلاش میں پاتال کی طرف روانہ ہوئی جب الاطو کی سلطنت کی حد پر پہنچی تو محافظ نے پھاٹک پر روکا۔ اشطر نے کہا کہ اگر اس کو اندر آنے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ پھاٹک توڑ پھوڑ کر اندر چلی جاوے گی۔ مگر محافظ نے اس سے کہا پہلے وہ مہارانی الاطو کو اس کے آنے کی اطلاع ضرور دے گا۔

چیر میاں: مگر الاطو نے اجازت بالکل نہ دی ہوگی۔

قلو پطرہ: واہ کیوں نہیں دیوی الاطو نے سوچا کہ یہ اچھا موقع ہے۔ اسے ذلیل کرنے کا۔ لہٰذا محافظ کو کہا کہ اشطر کو اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔ مگر اس کے ساتھ سلوک ویسا ہی کیا جائے جیسا کہ ہر نو وارد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پس پھاٹک کھول دیا گیا۔ اشطر اندر داخل ہوئی تو پہلے پھاٹک پر اُس کا تاج اُتار لیا گیا۔ دوسرے پھاٹک پر اس کے کانوں کی بالیاں اُتار لی گئیں۔ تیسرے پھاٹک پر اس کا قیمتی

جواہرات والا ہار اُتارا گیا۔ چوتھے پر اس کے سینہ پر کے زیورات اتار لیے گئے۔ اور اسی طرح سے پانچویں پر اس کا مرصع کمر بند، چھٹے پر اس کے ہاتھ پاؤں کے کنگن اور ساتویں پر اس کا لبادہ تک اتار لیا گیا۔ ہر پھاٹک پر اس نے اس دست درازی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر ہر دفعہ محافظ نے یہی جواب دیا کہ
''الاطو کا حکم یہی ہے۔''

چیر میاں: (دل چسپی لیتے ہوئے) اچھا تو پھر کیا ہوا۔

قلوپطرہ: تب آسمانوں کی حسین، حسین مگر مغرور دیوی پاتال کی دیوی کے سامنے پہنچی مگر بالکل عریاں الاطو نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس کے جسم میں کئی بیماریاں پیدا کر دیں۔ اِدھر اس کا یہ حشر ہوا۔ اُدھر تمام دنیا کی شادابی ختم ہوگئی۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنے عاشق کو مل سکی یا نہیں مگر میں اتنا جانتی ہوں کہ اے اور سن جیسے دیوتاؤں نے دیوی اشطر کی رہائی کے لیے نادو شونا مر کو بھیجا۔ جس نے الاطو کو دیوتاؤں کا حکم جا سنایا، الاطو یہ سن کر چھاتی پیٹ کر روئی۔ مگر مصیبت زدہ دیوی اشطر کو رہا کرنا ہی پڑا۔

چیر میاں: آہ وہ زمانے کدھر چلے گئے۔ جب جوپیٹر کو محبت کرنے کے لیے عرش سے فرش پر آنا پڑتا تھا اور جب اس دنیا کے خاکی نوجوانوں پر آسمانوں کی دیویاں عاشق ہوتی تھیں...... یہ حکایتیں سن سن کر دل کی عجب کیفیت ہوگئی ہے۔

قلوپطرہ: (نظر اٹھا کر) دیکھو بادلوں کا نظارہ۔ (ایک لحہ کے لیے قلوپطرہ ٹکٹکی باندھے سامنے کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر اس کا چہرہ متغیر ہونے لگتا ہے) چیر میاں!

چیر میاں: مہارانی جی!۔۔۔ وہ گھڑی اب نزدیک آرہی ہے۔

قلوپطرہ: (مسکرا کر) وہ مبارک گھڑی جس کا میں انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ سکھی دیکھ تو آج آئرس نے میرے جسم پر کیسا عمدہ تیل ملا ہے۔ آ، یہ دیکھ میرے بدن سے خوشبوؤں کی لپٹیں آرہی ہیں، میرے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ کیسا نکھرا ہوا ہے، بتا تو میں نے اپنی بھنوؤں کو کس عمدگی کے ساتھ سیاہ کیا ہے۔ بھلا آرائش بدن اور

افزائش حسن کا وہ کون سا طریقہ ہے جس سے قلو پطرہ ناواقف ہے۔ غمزہ وادا کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر ایک عالم پر فوقیت رکھنے والی حسینہ حاوی نہیں۔ میرا حسن، او چیر میاں! اب بھی بگڑی سلطنتوں کو بنا سکتا ہے اور بنی سلطنتوں کو بگاڑ سکتا ہے۔

(دور سے شہر کی عبادت گاہوں سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی ہیں ـــ)

قلوپطرہ: آہا! یہ نرسنگھے اور ترئی کی ہلکی ہلکی آوازیں کتنی دل کش معلوم ہوتی ہیں۔ (قلوپطرہ محویت کے عالم میں چلتی ہوئی دریچے کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ چیر میاں بھی پیچھے جا کھڑی ہوتی ہے۔)

چیر میاں: دریائے نیل کا یہ نظارہ کس قدر حسین ہے۔

قلوپطرہ: اس نیل سے میری محبت کی داستانیں وابستہ ہیں۔ یونانیوں کے دیوتا اپالو نے حسین دفنے سے کس شدت کے ساتھ محبت کی ہوگی یہ تو میں نہیں جانتی، البتہ میرے عاشقوں نے جس گرم جوشی کا اظہار کیا اس پر کوئی بھی عورت ہو رشک کر سکتی ہے۔ (سکوت کے بعد) پورب کے کالے بادلوں کی اٹھتی ہوئی گھٹائیں، ریت کے ٹیلوں کے پیچھے غروب ہوتا ہوا سورج سطح آب پر تیرتی ہوئی ہلکی پھلکی کشتیاں، کیسا حسین منظر (پلٹ کر) جا سکھی بربط اٹھا لائیں، ایک گیت گاؤں گی...... (بربط ہاتھ میں لے کر اس کے تاروں کو اپنی نازک انگلیوں سے چھیڑتی ہے اور تار جواب میں ایک دردناک صدا دیتے ہیں)...... لو سکھی سنو اپنی رانی کا آخری گیت سنو۔

(گاتی ہے)

طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک ان لہروں کا بس یہی شغل ہے۔

ان کی یہ سرگرمیاں کہاں سے شروع ہوئیں اور کہاں ختم ہوں گی۔

اس کا انھیں خود بھی پتہ نہیں۔

شباب کی آمد آمد سے جس طرح ایک دوشیزہ کے قدم بار حسن کے سبب لڑکھڑاتے

ہیں اس طرح موسم برسات میں نیل کی لہریں بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہیں۔
شام کے وقت،
خورشید کی رخصت ہوتی ہوئی شعائیں
دریائے نیل کے سینے میں آگ سی لگا دیتی ہیں
تب پورب سے سرد ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔
دھوپ اور لو میں جھلسی ہوئی کلیاں نیم وا ہو جاتی ہیں۔
دن اور رات گلے ملتے نظر آتے ہیں اور پھر
ملکۂ شب کی حکومت کا وہ دور شروع ہوتا ہے جب
آسمان سے شراب کی پھوار سی پڑتی ہے
وہی مئے مدہوش کن پیکر کلیاں رات بھر بدمست پڑی رہتی ہیں۔
جب تک کہ صبح کا ستارہ طلوع نہیں ہو جاتا،
اور نسیم سحری گلاب کی خشک پنکھڑیاں لا کر ان کے قدموں میں بکھیر نہیں دیتی،
تب تلک وہ کلیاں انگڑائی نہیں لیتیں،
پھر محفل شب کی رونق بڑھانے کے لیے
سونے کے تھال کی مانند
نور میں نہایا ہوا چاند ایک لکۂ ابر کی اوٹ سے نکل آتا ہے جیسے
کسی سیم تن حسینہ کا شانہ دفعتاً عریاں ہو جائے،
بدر کامل کی چاندنی سے خوف زدہ ہو کر
گیدڑوں کے غول تاریک گوشوں کی طرف لپکتے ہیں۔
ظلمتِ شب دم توڑ دیتی ہے، یا
تاریکی ملکۂ شب سے روٹھ کر غاروں میں، اور درختوں تلے، چلی جاتی ہے،
ماہِ نو کی کرنیں کسی شوخ و شنگ، کافر جمال، برق رفتار رقاصہ کی طرح
لہروں پر رقص کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں،

عالم تصور میں کسی کم سن مصری حسینہ کو گیلی ریت پر بیٹھے دیکھتی ہوں—
جو اپنے عاشق کی فرقت میں روتی ہے اور اس کی دونوں آنکھوں سے
آنسوؤں کے تار بندھ جاتے ہیں،
اس دو تاروں والے انوکھے ساز پر، دف بجا بجا کر وہ
عشق و محبت، وصل و فرقت کے گیت گاتی ہے
معاً یونانیوں کے دیوتا فیبس، اپالو کی مانند ایک نوجوان نمودار ہوتا ہے
دوشیزہ، اپنے جسم کو مارے حیا کے دف کے پیچھے چھپا لینا چاہتی ہے،
نوجوان عاشق کی بانسری کی آواز فضا میں گونجتی ہے،
اور کم سن حسینہ کے غم کے آنسو خوشی کے آنسوؤں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔
کاش! اس جسدِ خاکی کے ذرّات منتشر ہو کر
بانسری کی شیریں آواز یا حسینہ کی دردناک لے میں حل ہو جاتے ہیں،
کل جہان میں خاموشی کا عالم طاری ہونے لگتا ہے۔
ان بدمست لہروں، پھولوں، پیڑوں، اور نکھری ہوئی چاندنی کو کیا کہوں،
حسن خوابیدہ؟
اس منظر کی مدح کرنے سے اس کا حسن میلا ہوتا ہے۔
دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے میں یہ منظر شراب سے کچھ کم نہیں سوائے
اس کے کہ
یہ شراب آنکھوں کے ذریعے پی جاتی ہے
اُس حسنِ خوابیدہ کی تعریف میں
لب بند، دماغ مدہوش، قلم لرزاں، بس
دل میں آتی ہے کہ
اس ہوش ربا منظر کو ایک ہی دفعہ اٹھا کر آنکھ میں رکھ لوں، اور پھر
آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر لوں،

اس مٹھی بھر خاک کو کشتی کے سپرد کر دوں
اور کشتی ان بے باک لہروں کے رحم پر چھوڑ دوں
پھر اپنا بھی یہی شغل رہے،
طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک،
(گیت ختم ہو جانے پر وہ خاموش ہو جاتی ہے اور اپنے سامنے ٹکٹکی باندھے کھڑی رہتی ہے۔)

چیرمیاں: (آہستہ سے) کیسا حسین گیت، کیسی دل کش آواز، آنسوؤں کی کیسی انوکھی دنیا، جہاں آنسو خوشی کے بھی ہیں اور غم کے بھی۔

قلوپطرہ: (خلا میں گھورتے ہوئے) چیرمیاں! تم کہاں ہو، آؤ میری چھاتی سے لگ جاؤ— بادل چھا رہے ہیں، تاریکی بڑھ رہی ہے، اب مجھے جانا ہوگا، میرا سامان تیار ہے نا؟

چیرمیاں: (کھرّائی ہوئی آواز میں) میری مہارانی کا سب سامان تیار ہے۔

قلوپطرہ: ابھی تو زندگی کی شام بھی نہیں ہوئی— مگر میں مہارانی ہوں، کنیز نہیں، اور مہارانیاں جب چاہیں سفر اختیار کر سکتی ہیں۔ (ہوا میں تاکتے اور مسکراتے ہوئے) آہا میرے سر پر مبارک گدھ والا تاج ہوگا۔ گدھ کے پھیلے ہوئے پروں کے نیچے میرے کان چھپ جائیں گے۔ میرا لباس شاہانہ ہوگا۔ میرے ہاتھ میں عصائے شاہی ہوگا، چیرمیاں! تو کوئی نغمہ الاپنا، بادل آنسو بہائیں گے، بجلی چمک چمک کر رستہ دکھائے گی، کس شان سے نکلے گی سواری مصر کی رانی قلوپطرہ کی۔ چلو میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ (بلند آواز سے)......اولمپس!

اولمپس: مہارانی!

قلوپطرہ: تم ایک قابل حکیم ہو، مجھے یقین ہے کہ تم نے کافی تیز زہر تیار کیا ہوگا۔

اولمپس: مصر کی رانی قلوپطرہ کے حکم کی لفظ بہ لفظ تعمیل کی گئی ہے۔

(پیالہ ہاتھ میں لے کر)

قلوپطرہ: (پیالہ ہاتھ میں لے کر) لیکن اگلی دنیا میں میرا استقبال کون کرے گا۔

آئرس: (آگے بڑھ کر) کنیز حاضر ہے۔

قلوپطرہ: لے او آئرس! تو اپنی مہارانی کو راہ دکھا (اولپس کی طرف دیکھ کر) میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ میرے حکم کی کہاں تک تعمیل کی گئی ہے۔

(آئرس زہر پیتی ہے، پیالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا دباتی ہے۔ پھر فرش پر گر کر، چند لمحوں کے لیے تڑپنے کے بعد فوراً مر جاتی ہے۔)

قلوپطرہ: (پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے) آہ! مر گئی، بہت جلد مر گئی، لاؤ۔

اولپس: اور لاؤ...... میری کنیز میری راہ تک رہی ہوگی۔

(اولپس نظر بچا کر زہر کے پیالے میں تھوڑا سا پانی ملا دیتا ہے، قلوپطرہ پیالہ ہاتھ میں لے لیتی ہے اس کی آنکھیں بند ہیں، غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں دریچہ میں سے ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی ہیں۔)

قلوپطرہ: (آہستہ سے) سورج غروب ہو رہا ہے، کالی گھٹائیں پھیلتی جا رہی ہیں، تاریکیاں چھا رہی ہیں— سب دیوتا مجھ سے ناخوش ہیں۔ میں دعا کس سے مانگوں؟ اس مختصر زندگی کے چند حسین واقعات میرے دماغ میں محفوظ ہیں، انھیں کی یاد لیے جاتی ہوں— الوداع! دریائے نیل کی لہرو! الوداع! رخصت! ریگستان میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیو! ان بڑے بڑے کھجوروں کے درختوں کو سلام، گھاس کے خشک تنکوں کو سلام! الوداع اولپس!— عزیز چیرمیاں— انطونی!!......(زہر پی کر پیالہ زمین پر پٹخ دیتی ہے)...... میں زندگی سے پیار ضرور کرتی ہوں، مگر موت سے بھی نہیں ڈرتی۔ خصوصاً جب شاہی وقار کا سوال درپیش ہو— موت کس قدر راحت آمیز ہے موت، آہ! (اس کے ہونٹ نیلے پڑ جاتے ہیں، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن تھام لیتی ہے) لیکن اولپس! موت کیوں نہیں آتی؟

اولپس: (بھاری آواز میں) آئے گی۔

قلوپطرہ: (خوف زدہ ہو کر) کب؟

اولمپس: کبھی بھی آئے، آئے گی ضرور۔

قلوپطرہ: (چونکتی ہے اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اولمپس کی طرف دیکھتی ہے) مجھے تمھاری آنکھیں دیکھ کر خوف کیوں معلوم ہوتا ہے۔

اولمپس: (آگے بڑھتا ہے اور اپنی آنکھیں قلوپطرہ کے چہرہ پر گاڑ دیتا ہے)
خوف کیوں نہیں معلوم ہوتا ہے؟ میری آنکھوں کی طرف ذرا غور سے دیکھو۔

قلوپطرہ: (سر تھام کر) میں...... میں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔

اولمپس: (سخت آواز میں) مگر میں کون ہوں؟

قلوپطرہ: (حیرت و خوف سے) تم کون ہو؟

اولمپس: (اور بھی قریب جا کر) میں ہرمشس ہوں۔

قلوپطرہ: (چیخ کر) ہرمشس؟ دغا باز؟ آہ فریب...... دھوکا......

(ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند اور ستارے یکلخت بادلوں میں چھپ جاتے ہیں— تاریکی ایک دم بڑھ جاتی ہے، بادل گرجتے ہیں اور ہرمشس (اولمپس) خوف ناک قہقہے لگاتا ہے)

اولمپس: (قہقہہ لگا کر) ہاں ہرمشس، باغی ہرمشس، جسے تباہ کرنے کے لیے تو نے اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں، جس نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے دیوتاؤں کی خفگی مول لی۔ اور جس نے تیرے ایک تبسم کے لیے اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں کی امیدوں کا خون کر دیا۔

قلوپطرہ: (لڑکھڑا کر اور پھر ایک کوچ کا سہارا لے کر) تو ابھی تک زندہ ہے۔ تیری موت کی خبریں یقیناً بے بنیاد تھیں۔

اولمپس: بے شک، اور میں! ابھی زندہ رہوں گا۔ تو زمین کے سینے پر بوجھ ہے تیری زندگی غلاظت میں رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ مکروہ ہے۔ اور میں تجھے تیرے گناہوں کی سزا دلا کر ہی رہوں گا۔

قلوپطرہ: (سر بلند کر کے) پروا نہیں او آئسس کے پجاری، اور سارس کے غلام، مجھے تیری دیویوں اور تیرے دیوتاؤں کی ذرّہ برابر پروا نہیں۔

اولمپس: (کڑک کر) او رنگیں جمال فسوں گر! او غارت گرِ سرمست، او دل فریب کافرہ، او فتنہ رفتار مہ لقا! او خوش چشم ڈائن! او حسن فروش دل ربا، اب تیرا وقت آن پہنچا۔ تیری نفس پرستیاں اور ہوس رانیاں جن پر تجھے ناز ہے اب ایک قلم ختم کر دی جائیں گی۔ او شوخ و بے باک، دیکھ، اب کیوں کر تجھ پر دیوتاؤں کا قہر نازل ہوتا ہے۔

(قلوپطرہ عالمِ نزع میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے فضا میں دیکھتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔ خوب صورت پیشانی اور گردن پر نیلی نیلی رگیں ابھر آتی ہیں۔ بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، کمرے میں بارش کی بوچھار پڑنے لگتی ہے۔ اولمپس ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور پاؤں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

اولمپس: (گرج کر) کھول دے، او او سارس، دوزخ کے دروازے کھول دے، دیکھ او ڈائن! اب تیرا بھائی آتا ہے جسے تو نے زہر دے کر مار ڈالا تھا، کہاں ہے۔ سپا جسے قلوپطرہ نے ترسا ترسا کر موت کی گود میں سلا دیا۔ آ او شاہ مینکارا! جس کا سینہ چیر کر اس چڑیل نے خزانہ نکالا اور اپنی خواہشات کی سیری کرنے کے لیے لٹا ڈالا۔ آؤ بدروحو! سب مل جل کر آؤ، او او سارس! اپنے پجاری کی دعا قبول کر۔

(ایک بڑا چمگادڑ پر پھڑ پھڑاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے، قلوپطرہ کے سر پر تین چکر لگاتا ہے، پھر اس کی چھاتی پر لٹکے ہوئے ہیرے سے چمٹ جاتا ہے، تب وہ ایک دردناک آواز میں چیختا ہے، اپنے پروں کو تین مرتبہ پھڑ پھڑا کر تیزی سے اڑتا ہوا کمرے سے باہر چلا جاتا ہے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک بڑھ جاتی ہے۔ اولمپس خوف ناک قہقہے لگاتا ہے۔ کئی ڈراؤنی روحیں اندر داخل ہوتی ہیں۔ ایک طرف قلوپطرہ کا مقتول بھائی دوسری طرف باغی سیپا اور شاہ مینکارا وغیرہ کی روحیں جنھیں قلوپطرہ نے برباد کیا تھا اُسے گھیر لیتی ہیں اور تاریکی میں اسے ڈراتی ہیں،

کوئی اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، کوئی بھیانک قہقہے لگاتی ہے، کوئی دانت دکھاتی ہے، قلوپطرہ مارے خوف کے کانپتی ہے۔)

اولمپس: (کڑک کر) جاؤ قلوپطرہ! اب تیرے لیے دوزخ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں جا بد بخت، جا ظالم، جا بے وفا، جا سنگ دل، یہ بد روحیں تیرا ہی استقبال کرنے کے لیے جمع ہوئی ہیں۔ یہی تجھے دوزخ کا راستہ دکھائیں گی۔

(معاً بادل یوں گرجتا ہے جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ چیر میاں بے ہوش ہو جاتی ہے، قلوپطرہ ایک دل دوز چیخ مار کر کوچ پر گر پڑتی ہے اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جاتی ہے۔ وہ دیو قامت مجسمے لرز کر گر پڑتے ہیں۔ اور فرش سے گرد اُڑ کر قلوپطرہ کے حسین چہرے پر جا پڑتی ہے۔)

(وقفہ)

(خاموشی اور سکون۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادل پھٹ گئے ہیں اور بجلی بھی سرد پڑ چکی ہے۔ اولمپس ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا ہے۔ اس کے قدموں کے قریب چیر میاں بے ہوش پڑے ہے۔ قلوپطرہ کا اکڑا ہوا جسم نیل کے کنارے پر رونے والے کتے کی بلند اور مہیب آواز خاموشی کو توڑتی ہوئی نکل جاتی ہے —)

☆☆☆

یہ ڈراما افسانوی مجموعہ 'جگا' میں شامل ہے۔

مرغی

(یہ تمثیل خاص طور پر ماموں اکبر کے لیے لکھی گئی)

تعارف

'نگار' بابت ماہ مارچ 1940 میں ایک مضمون 'ہوسٹل کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر شائع ہوا تھا۔ مسٹر نظیر حیدر اپنے اس مضمون کا آغاز اس طرح کرتے ہیں: ''' مجھے یقین ہے کہ آپ ڈگری کلاس کے طلبا سے کبھی نہ کبھی ضرور ملے ہوں گے کیونکہ اس جنسِ کاسد کی کمی نہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ آپ دنیا کی ایک بڑی دلچسپ چیز کے مطالعہ سے محروم ہیں۔''

اب چونکہ دنیا کی اس ''بڑی دلچسپ چیز'' سے تعلقات پیدا کر کے ان کے خیالات سے محفوظ ہونے کی ہر شخص کو فرصت حاصل نہیں۔ اس لیے ایسے حاجت مندوں کے لیے یہ تمثیل قلم بند کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں میری ذاتی غرض پوشیدہ نہیں ہے۔ اسے تو محض رفاہِ عام کا کام سمجھ کر کیا گیا ہے۔ رہا سوال ثواب کا، اس سے میں دست بردار ہونے کا اعلان

کرتا ہوں۔

یہ ایک ہوسٹل کا قصہ ہے۔ اس ہوسٹل میں پچاس کمرے ہیں، بائیں طرف سے کمروں کے نمبر شروع ہوتے ہیں۔ ایک سے لے کر چوبیس نمبر تک مسلمانوں کی آبادی ہے۔ صرف کمرہ 16 میں رابعہ راؤ سنگھ ایک عیسائی لڑکا رہتا ہے۔ کمرہ 25 میں فتح سنگھ نامی ان گڑھ سکھ نوجوان رہتا ہے جو پنجاب سے، الٰہ آباد تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوا ہے۔ یوپی کا ایک بنیا ہندو سکھ بن چکا ہے وہ فتح سنگھ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ فتح سنگھ کا اس پر رعب طاری ہے اور اس سے بہت سی خدمات لیا کرتا ہے۔ باقی کمروں میں ہندو رہتے ہیں۔ سوائے محمود کے جو سوشلسٹ خیالات کا شخص ہے اور کمرہ 38 میں مقیم ہے۔

لڑکے کالجوں سے نکل کر آتے ہیں۔ نیا خون، مالی حالت مستحکم، کھانا پیٹ بھر کر ملتا ہے۔ اس لیے خدا کی اس مخلوق کو بہت دور دور کی سوجھتی ہے۔ اگر کوئی ملٹن ہے تو کوئی شیلی، کوئی سورفٹ اور کوئی ٹھیکرے، کوئی مسلم لیگی ہے تو کوئی مہا سبھائی، کوئی کانگرسی ہے تو کوئی پاکستانی، مگر جونہی وہ لوگ یونی ورسٹیوں سے نکلتے ہیں تو دال روٹی کے چکر میں سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہم صرف بیس یا پچیس منٹ کے لیے آپ کو ان بے فکروں میں لے چلتے ہیں۔

صرف اتنی بات اور عرض کردیں کہ اگر مقطع میں، یا مطلع میں، یا کسی اور مصرع پر ''سخن گسترانہ'' بات آپڑے تو۔

مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

منظرِ اوّل

کمرہ نمبر 3، وقت دس بجے شب۔ بادل کی گرج اور بارش کی بوچھاڑ۔

جمیل اور حیدر کمرہ میں موجود ہیں۔ تقریباً دو برس پہلے جمیل کمزوری اعصاب میں مبتلا ہوگیا تھا۔ نحیف و کمزور، صورت ایسی جیسے سلیم کی انارکلی، مزاج شاعرانہ، اس وقت بستر پر دراز چھالیہ کتر رہے ہیں۔ حیدر قوی ہیکل نوجوان، موٹی موٹی اُنگلیاں، بڑے بڑے کھردرے

ہاتھ، وہ کھڑکی کے پاس کھڑا پاکستان اسکیم کے نمائندوں کو مسلم طلبا کی طرف سے پیش کیے جانے والے ایڈریس کو بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر قوم و ملت کی خدمت کے جذبات خوف ناک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ کمرے میں دو الماریاں ہیں، ایک میں کتابیں اور رسائل، دوسری میں آئینہ، اُسترہ، پاؤڈر، غرض میک اَپ کا کل سامان۔ ایک طرف میز پر کتابیں، لغات، اوراق، پنسلیں، نبیں، دوات، رائٹنگ پیڈ، مس روز اور کانن کی تصویریں رکھی ہیں۔ ایک اور بانس کی تپائی پر پاندان اور ''خفیہ تصویروں کا البم رکھا ہے۔ یہ وہی تصویریں ہیں جن کی مشتہرین بے طرح تعریف کرنے کے بعد اشتہار کے نیچے ''ایک خاص نوٹس'' نمایاں حروف میں لکھ دیتے ہیں۔ ''طالب علم اس خفیہ البم کو ہرگز ہرگز طلب نہ کریں۔''

حیدر: (آئینے میں چہرہ دیکھتے ہوئے) میں کچھ کمزور سا ہو گیا ہوں۔

جمیل: نہیں تو — لاؤ اپنا بائسپ پھلاؤ تو ذرا۔ (حیدر بائسپ پھلاتا اور جمیل اس کا ڈنڈ ٹٹول کر اس کے پھلاؤ کو دیکھتا ہے) نہیں یار نہیں تم بالکل تندرست ہو۔ تم کمزور ہرگز نہیں ہو سکتے۔

حیدر: (مطمئن ہو کر) ابھی تک کوئی بھی نہیں آیا۔

جمیل: آتے ہی ہوں گے۔

حیدر: (نتھنے پھلا کر) تین منٹ گذر چکے ہیں — کام بہت جلدی کا ہے۔ (دروازہ کھلتا ہے اور بہت سے مسلمان لڑکے یکے بعد دیگرے اندر داخل ہوتے ہیں۔)

سب: (مختلف لہجوں میں) آداب عرض...... السلام علیکم — والیکم — بسم اللہ...... لاحول ...... قبلہ قبلہ...... نہیں نہیں...... آپ...... پہلے آپ...... ادھر...... کرسی...... اُدھر...... واہ...... آفریں...... نہیں نہیں...... بس بس...... دعا ہے...... میں ٹھیک ہوں...... پان سگریٹ......

(مختلف صورتیں، مختلف ڈیل ڈول، مختلف آوازیں، کچھ دیر تک ایک ہنگامہ سا برپا رہتا ہے......)

حیدر: (کھڑے ہو کر تحکمانہ انداز میں) آرڈر آرڈر۔ (خاموشی)

ایک: ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم کو بے وقت کیوں طلب کیا گیا ہے؟

دوسرا: ہم اپنے بستروں میں نہایت آرام کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

تیسرا: میں سیاست حاضرہ پر ایک مضمون قلم بند کر رہا تھا۔

حیدر: (سنجیدگی اور متانت سے) مجھ کو اس بات کا افسوس ہے لیکن دوستو! ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کس قوم کے افراد ہیں۔ ہمارے آبا و اجداد نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ یہ موقع آرام کا نہیں بلکہ عمل کا ہے......اسلام......

جمیل: (چلا کر) لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ میاموں نے شرکت کیوں نہیں کی؟

دوسرا: وہ شرماتا ہے۔

چوتھا: کیوں؟ کیا وہ لڑکی ہے؟

پہلا: وہ شی بوائے (She Boy) ہے۔

دوسرا: وہ بے چارا کمزور ہے۔

جمیل: لیکن وہ ''سبزہ بے گانہ'' کی طرح کیوں رہتا ہے۔

حاضرین: (سوائے محمود کے) سبحان اللہ! جمیل صاحب۔ سبزہ بے گانہ کا استعمال برمحل کیا ہے۔

چھٹا: مگر ایسے نوجوان ہمارے کس کام کے؟— ہدایت جاؤ، اس کو حاضر کرو۔ کان پکڑ کر لاؤ۔

جمیل: (اُچھل کر) اس کی ہتک ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ کیا یہ درست نہیں کہ وہ ہمارے ہوسٹل میں سب سے زیادہ کمسن لڑکا ہے، اور کیا یہ صحیح نہیں کہ وہ مسلمان لڑکوں میں سب سے زیادہ ذہین طالب علم ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ اس مرتبہ وہ جغرافیہ میں گولڈ میڈل لانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس کو جغرافیہ سے خاص شغف ہے۔ ہمیشہ اسی قسم کی کتابیں پڑھا کرتا ہے۔ ہم کو اُس پر اور اُس کی جغرافیہ دانی پر فخر ہونا چاہیے۔

محمود: مگر میرا دعویٰ ہے کہ اس کو کوڑی بھر عقل نہیں، کتابیں رٹ کر امتحان پاس کر لینا اور بات ہے، اور انسانیت کا ہونا اور بات۔

ہدایت: (جس کی آنکھیں ایسی ہیں جیسے ابھی اُبل کر باہر آ گریں گی اور جس کی مونچھیں تنی

ہوئی ہیں۔) تو میں جاؤں؟

جمیل: جاؤ— اور اس کو باعزت تمام بلا کر لاؤ۔ اُس کو اُن جنگلات کا واسطہ دے کر بلاؤ جو ہمالیہ پہاڑ کی چوٹیوں پر اُگے ہوئے ہیں۔ اُن مانسون ہواؤں کے نام پر بلاؤ جو بحرِ عرب اور خلیج بنگال سے اٹھ کر ہندوستان جنت نشان کو سرسبز بناتی ہیں۔ اس کو ان زمین دوز ریل گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ کی قسم دے کر بلاؤ جو لندن شہر کے نیچے ہی نیچے بھاگتی پھرتی ہیں اس کو ماہِ کامل کی کرنوں کا واسطہ دو جو بحر الکاہل کی لہروں میں تلاطم پیدا کر دیتی ہیں۔ اس کو...... (ہدایت کی روانگی)

حاضرین: (تالیاں بجا کر) واللہ کمال کر دیا آپ نے جغرافیہ کی رعایت سے آزاد بحر میں اس سے زیادہ موثر نظم......

حیدر: (چلا کر) آرڈر، آرڈر۔

محمود: (طنز سے) واہ کیا داد دی جائے جمیل صاحب! آپ کمبل لپیٹ کر بیٹھ جایئے کہیں۔ آپ کے دست و بازو کو نظر نہ لگ جائے۔

جمیل: (چڑ کر) سنو کارل مارکس! تم ہمیشہ مجھ سے جھگڑا کرتے ہو...... جب تم بولتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی غلاظت سے لبریز مٹکے پر سے ڈھکنا اٹھا دے۔

محمود: آپ کو میری ہتک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

جمیل: آغاز کس کی طرف سے ہوا۔

محمود: آپ نے وہ مہمل اور مبہم فقرات کیوں کہے؟

جمیل: یہ ادبِ جدید ہے...... یہی تعمیری ادب ہے جس پر ہماری آنے والی نسلیں فخر کریں گی۔ کیا جناب نے وہ نظم پڑھی ہے...... جو ہوتا میں راجا...... ساجن...... جو ہوتا میں راجا!

پہلا: میں نے پڑھی ہے۔

تیسرا: میاموں کے ہاں وہ پرچہ بھی پڑا ہے۔

دوسرا: جب میں ابھی ابھی آ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ وہی نظم پڑھ رہا ہے اور منہ پر

'بلڈ اگ' آئس کریم بھی لگا رہا تھا۔

پہلا: (قہقہہ لگا کر) ارے میاں! آئس کریم نہیں اسنو کریم کہو— کیوں جمیل صاحب!

چوتھا: میاموں کا علم وسیع ہے۔ وہ جنرل نالج کافی رکھتا ہے۔

تیسرا: اس نے حکمت کی کتابیں بھی پڑھنا شروع کر دی ہیں۔ بوعلی سینا......

جمیل: (بات کاٹ کر) کیا وہ نبض بھی دیکھ لیتا ہے؟

محمود: وہ تمھارا گلا تک دبا سکتا ہے۔

جمیل: (چیخ کر) محمود!!

پہلا: محمود تم خاموش رہو (جمیل سے) جمیل میں نے ہومیو پیتھی کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔

(میاموں ہدایت کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے۔ ناک چوڑی، ہونٹ موٹے، شیخی خور، بدمذاق، ناشکر گزار۔)

حیدر: (کرخت آواز میں) جلدی بیٹھو میاموں۔ تم اتنی دیر بعد آئے اور اب اس قدر آہستہ آہستہ چل رہے ہو۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ — شرم تم کو مگر نہیں آتی

میاموں: (بگڑ کر) میں جاتا ہوں۔

محمود: کعبہ کو؟

جمیل: (حیدر کی طرف ملامت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) حیدر! تم کو شرم آنی چاہیے وہ ہمارا ہی تو چھوٹا بھائی ہے۔ اگر اس کا مزاج کچھ تیز ہے تو تم میں سمائی ہونی چاہیے (شفقت سے میاموں کا ہاتھ تھام کر) آؤ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ میرے پاس چارپائی پر۔

حیدر: برادرانِ ملت! اب میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ نہایت خاموشی اور توجہ کے ساتھ میری بات سنیے۔

سب: ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

حیدر: دوستو آج اسلام کی ہتک ہو رہی ہے' آج موقع ہے کہ ہم اپنی عزت آپ کرنے کا گر سیکھیں۔ آج جب کہ سب طرف گھٹائیں چھا رہی ہیں......

پہلا: اور بارش بھی ہو رہی ہے۔

حیدر: (گرج کر) آپ خاموش رہیے...... میں جن گھٹاؤں کا ذکر کر رہا ہوں۔ وہ یہ گھٹائیں نہیں ہیں۔ ان سے مراد مصائب کی گھٹائیں ہیں جو ہماری قوم پر چھا رہی ہیں۔

پہلا: (سر جھکا کر) میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

جمیل: (آہستہ سے) سنو میاموں۔ کیا یہ درست ہے کہ تم نے علم طب کی کتابیں پڑھنا شروع کر دی ہیں۔

میاموں: لیکن آپ کو اس سے کیا غرض؟

جمیل: (دبک کر) وہ! یوں ہی، یوں ہی، میاموں بھائی (دانت نکال کر) لو میری نبض دیکھو ذرا۔

میاموں: (آنکھیں دکھا کر) یہ میرا پیشہ نہیں۔

جمیل: (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) نہیں توبہ توبہ، میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ پیشہ ور ہیں...... ہف (اپنا منہ اپنے ہاتھ سے فوراً بند کر لیتا ہے۔)

میاموں: (چیخ کر) جمیل——!!

(سب لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں)

حیدر: (خشمگیں نظروں سے میاموں کی طرف دیکھتے ہوئے) کیا بات ہے؟

جمیل: (ڈرتے ہوئے) کچھ نہیں، میں میاموں سے کہہ رہا تھا کہ وہ میری نبض کو محسوس کرے۔

حیدر: یہ نبض دکھلانے کا کیا موقع ہے؟

جمیل: (سر تسلیم خم کر کے) لیکن تم جانتے ہو میرے اعصاب......

حیدر: اُف۔ میں کہتا ہوں بھاڑ میں جھونک دو اعصاب کو——

جمیل: لیکن میاموں کر ہی کیا رہا تھا۔ ہاتھ تو اس کے خالی تھے۔

حاضرین میں سے بیش تر: بے شک بے شک میاموں کیا کر رہا ہے؟

چھٹا: بھلا میاموں جیسے نوجوان ملت کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟

ساتواں: میاموں کو اس بات پر مجبور کیا جانا چاہیے۔

میاموں: (منہ پھلا کر) میں جاتا ہوں۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

(چھٹا لڑکا اسے اجڈ پن سے دھکیل دیتا ہے اور وہ پھر چار پائی پر گر پڑتا ہے)

میاموں: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) حیدر صاحب دیکھ لیجیے۔

حاضرین: ہم تم کو مجبور کر سکتے ہیں۔ ہم کو اس بات کا حق حاصل ہے۔ تم کو چاہیے کہ تم جمیل بھائی کی نبض دیکھو۔ کیا تم اتنی سی خدمت ملت کے ایک سرگرم کارکن کی نہیں کر سکتے؟

میاموں: (رحم طلب آنکھوں سے حیدر کی طرف دیکھتے ہوئے) حیدر صاحب دیکھ لیجیے آپ دیکھ لیجیے۔

حیدر: (حاضرین کی آوازوں سے مرعوب ہو کر) اچھے میاموں تم بچوں کی سی باتیں کیوں کرتے ہو۔ جمیل کی نبض ضرور دیکھو۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

میاموں: لیکن مجھ کو نبض کی پہچان نہیں۔

حیدر: پھر بھی دیکھو تو۔

پہلا: (ناصحانہ انداز سے) یہ سب مشق کی باتیں ہیں۔ آہستہ آہستہ پہچان ہو جائے گی۔

(میاموں مجبوری کے عالم میں جمیل کی کلائی ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ چھٹا لڑکا انتہائی خفگی کے ساتھ جھپٹ کر پاندان میں سے پان کی گلوری منہ میں رکھ لیتا ہے اور میاموں کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا جگالی کرنے لگتا ہے۔)

پہلا: (اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے) و لے بخیر گذشت۔ (اِدھر اُدھر سب کو خاموش دیکھ کر) اچھا تو جلسہ برخاست ہونے والا ہے کیا؟

تیسرا: کیا تم افیون کھاتے ہو؟

پہلا: تمھارا مطلب؟

چوتھا: مطلب یہ کہ ابھی تو کارروائی شروع بھی نہیں ہوئی۔

پہلا: لیکن کیا اسلام میں ہر قسم کا نشہ حرام نہیں؟

ساتواں: (منہ پھاڑ کر) بے شک بے شک اب ہوئی کام کی بات۔

چوتھا: (پہلے سے) ہے تو—

پہلا: تو پھر اُس نے میرے لیے یہ الفاظ کیوں استعمال کیے۔

دوسرا: ارے بھائی جان جانے دو..........نہیں صاحب......

پانچواں: ....حرام ہے..........بے شک حرام ہے..........

چھٹا: توبہ..........مگر وگر کچھ نہیں.....نکل جاؤ..........

جمیل: ....شرم شرم..........بیٹھ جاؤ..........بس بس..........

ہدایت: .....افسوس..........صد..........

حیدر: (آئینہ میز پر پٹخ کر) آرڈر، آرڈر— آرڈر، آرڈر۔

جمیل: (منہ پھلا کر) آپ نے میرا آئینہ چکنا چور کر دیا۔

حیدر: (جھلا کر) خاموش (آستین چڑھاتے ہوئے) میں آپ لوگوں کو آخری مرتبہ اطلاع دیتا ہوں کہ آپ لوگ خاموش ہو جائیے۔ اُف، اتنی توہین—'

(سب مرعوب ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں)

حیدر: (مدھم مگر مضبوط آواز میں) جمیل!

جمیل: (خوف زدہ ہو کر) جی!

حیدر: آئینہ کے ٹکڑے باہر پھینک دو۔

(جمیل حکم کی تعمیل کرنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور نبض میاموں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔)

حیدر: دوستو! عزیز برادران ملت!! یہ ہندوستان وہی مقام ہے۔ جہاں ہمارے آبا و اجداد نے اپنی قوت اور بہادری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ گنگا کی ایک ایک لہر اس کی گواہ ہے۔ چپہ چپہ اس سرزمین کا ہمارے بزرگوں نے تلواریں مار مار کر لیا۔ یہ

چوٹی دار ہندو بھائی ہمارا پانی بھرتے تھے...... اور آج اے دوستو ہم کو دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ نہ صرف کل ہندوستان میں ہمارے خلاف ایک زبردست سازش ہو رہی ہے بلکہ خاص اس ہوسٹل میں...... مولانا نحیف! تم یہ سلوچنا کی تصویر کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟

مولانا نحیف: (خوف زدہ ہوکر) میں...... میں...... میں......

حیدر: خیر — اب محتاط رہو — ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا......؟

ہدایت: (چپکے سے میاموں کے قریب سرک کر) میاموں تم کو ایک خوش خبری سناؤں؟

میاموں: (جواب سیدھے رستے پر آ چکا تھا) فرمایئے۔

ہدایت: اب میں ان مونچھوں کو اڑا دوں گا۔ اب میں رونالڈ کالمن کی طرح مونچھیں رکھوں گا۔

میاموں: (ہمدردی حاصل کرنے کے لیے دلچسپی لیتے ہوئے) بہت عمدہ، بہت عمدہ۔

ہدایت: (ہاتھ بڑھا کر) دوسرے ہاتھ سے میری کلائی تھام لو۔

(میاموں غصہ دباتے ہوئے اس کی کلائی تھام لیتا ہے۔)

جمیل: (ہدایت سے) تم ابھی کیا خوش خبری سنا رہے تھے؟ ...... (جوشیلے انداز میں) آہ، لیکن ایک بہت منحوس خبر ہے۔ میں نے چترا اخبار میں وہ خبر پڑھی تھی۔

(سب لوگ جمیل کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں)

حیدر: (بگڑ کر) پھر وہی بات۔

سب لوگ: (دلچسپی لیتے ہوئے) ہاں ہاں جمیل بھائی کیا منحوس خبر ہے؟

حیدر: (گرم ہوکر) میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سب: حیدر! خدا کے لیے خاموش رہو۔ کیا معلوم وہ منحوس خبر کیا ہے۔ ممکن ہے ہم کو کچھ مدد مل سکے۔ یا ملت کے فائدہ کی کوئی بات نکل آئے، (جمیل سے) ہاں بھائی جمیل!

جمیل: (ہچکچاتے ہوئے) مجھے حیدر سے خوف معلوم ہوتا ہے (میاموں سے) تم میری

نبض تھامے رہو۔

سب: (حیدر سے) حیدر صاحب ہم امید کرتے ہیں کہ آپ انتہائی فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے اس بات کا اسپیشل آرڈر دے دیں گے۔

حیدر: (پھول کر) جمیل بتلاؤ...... ممکن ہے ملت کی بہبودی کی راہ پیدا ہو جائے......

سب: (انتہائی توجہ کے ساتھ دلاسہ دیتے ہوئے) ہاں بھائی جمیل ممکن ہے ملت کی بہبودی۔

جمیل: (تاریکی کی طرف تاکتے ہوئے) آہ اے دوست! کانن اب مس نہیں رہی۔ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ میں نے خود "چترا" اخبار—

حیدر: (برافروختہ ہو کر) بس حد ہو گئی۔ (گرج کر) اوہ اسلام کے نونہالو، یہ موقع جب کہ...... جب کہ...... جب کہ......

پہلا: (لقمہ دیتے ہوئے) جب کہ ہم پیٹ بھر کر قورمہ پلاؤ اڑا چکے ہیں اور ہم سب کو نیند کا خمار سا محسوس......

حیدر: شٹ اپ یو فول...... (جوش میں) اب جب کہ ہم پر مصائب کی گھٹائیں چھا رہی ہیں...... یہ کانن وانن کی باتیں؟...... اُف ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے...... چلو بھر پانی......

پہلا: یہاں دو دریا گنگا جمنا بھی ہیں—

حیدر: (ٹھٹکا کر اور پہلے لڑکے پر محض ایک قہر آلود نگاہ ڈالنے پر اکتفا کرتے ہوئے) ہا— آہ ہا............ اب اس ہوسٹل میں ان کافروں کی یہ ہمت؟......

سب: (ہمہ تن گوش بن کر) یعنی؟

حیدر: یعنی...... یعنی...... ایک مرغی...... (ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے)

سب لوگ: (جوش میں آ کر) یارو شہادت کا موقع آ گیا۔ کفن باندھ لو......

(ہدایت ایک بڑا سا کاغذ کا ٹکڑا کھونٹی سے لٹکا دیتا ہے۔ جس پر جلی حروف میں سرخ پنسل سے لکھا ہے: "اسلام خطرے میں۔")

حیدر: (چلا کر) دوستو! اب کھڑے ہو جاؤ۔

(یکا یک سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ بہت لے دے ہوتی ہے۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سب لوگ خطرہ محسوس کر کے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ کوئی ہاکی اٹھا لیتا ہے، کوئی اینٹ اٹھا لیتا ہے اور کوئی لوٹا پکڑ کر ڈٹ جاتا ہے۔ سب خشمگیں نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ مولانا نحیف، حیدر کا اشارہ پا کر دروازہ کھول کر خود الگ جا کھڑا ہوتا ہے...... نوکر دودھ کا گلاس لے کر اندر داخل ہوتا ہے)

نوکر: (سہم کر جمیل سے) حضور آپ کا دودھ۔

(جمیل ایک ہاتھ میں کرسی کا پایہ اور دوسرے ہاتھ کی کلائی میاموں کے ہاتھ میں دیے نہایت خاموشی اور رعب سے کھڑا رہتا ہے۔ نوکر خوف زدہ ہو کر حیدر کی طرف دیکھتا ہے۔ دروازے سے تیز ہوا آ رہی ہے۔ حیدر کے بال اڑ رہے ہیں اور وہ خود مجسم ''اسلام کا مستقبل'' بنا کھڑا ہے۔ نوکر قدم ناپتا ہوا آہستہ آہستہ واپس جاتا ہے۔ اتنے میں چھت پر سے ایک مکڑی ایک لڑکے کی گردن پر گرتی ہے۔ وہ گھبراہٹ میں اُچھل پڑتا ہے لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور نوکر انتہائی خوف کی حالت میں جست لگا کر دروازے سے باہر نکل جاتا ہے۔)

حیدر: (اسی خاموشی و سکون کے ساتھ خلا میں گھورتے ہوئے) ایک مرغی......

(نحیف دروازہ بند کرنے کے لیے بڑھتا ہے)

(ہٹلر کی طرح ہاتھ اٹھا کر) مت بند کرو۔ (سکوت)—

چلا کر بس چلو— دوستو— مارچ—

(کچھ لڑکے رستہ روک لیتے ہیں۔)

ہدایت: لیکن بھائی سیاست کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

سب لوگ: ہاں حیدر صاحب وہ مرغی کیا؟

حیدر: (گویا ہوش میں آ کر) اُودودھ۔ دروازہ بند کرو۔ سیاست کا یہ تقاضا نہیں ہے (دھیمی

اور پراثر آواز میں) دوستو! آج ایک مرغی لائی گئی ہے۔ پروفیسر رائیس کا چوکیدار وہ گھورکھا آج اس کو ذبح کر رہا ہے—!

سب: پھر؟

حیدر: (گردن بڑھا کر) تم لوگ سمجھے نہیں۔ کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ اس مرغی کو اسلامی طریقے پر ذبح کرے گا؟ (سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) نہیں دوستو نہیں— آہ اسلام کے نونہالو! میں نے خود اس کو اپنی آنکھوں سے مرغی کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔ وہ سامنے گلاب کے پیڑ کے نیچے چنبیلی کے جھرمٹ کے پاس مرغی بری طرح سے کڑکڑا رہی تھی......

ساتواں: (آستین چڑھا کر) اب؟

جمیل: (آگے بڑھ کر) ٹھہرو— یہ سب کافروں کی شرارت ہے۔ لیکن ہم اپنا ایک ایلچی بھیج کر معلوم کریں گے کہ اس حرکت سے ان کا مطلب کیا ہے؟

سب: بے شک بے شک، اسلام زندہ باد!

حیدر: (جوش میں آ کر) نعرۂ تکبیر!

سب: اللہ اکبر!

جمیل: مگر ایلچی کون ہوگا؟

سب: (ہم آواز ہو کر) حیدر!

حیدر: میں جان تک لڑا دوں گا— اور میرا نائب؟

ہدایت: میاموں۔

جمیل: نہیں نہیں ہرگز نہیں (میاموں سے) تم میری نبض تھامے رہو۔ (حاضرین سے) بہتر ہو اگر ہدایت کو نائب بنا دیا جائے کیوں کہ اس کی مونچھیں......

ہدایت: (کچھ پشیمان سا ہو کر) مگر میاموں کو میرے ساتھ میری کلائی تھامے ہوئے وہاں تک جانا ہوگا۔

سب: ناممکن، بالکل لغو بات۔

جمیل: (کاغذ کے پھولوں کا ہار لا کر حیدر کے گلے میں پہنا دیتا ہے) یہ پھولوں کا ہار میں مس نسیم کی تصویر کو پہنانے کے واسطے لایا تھا۔ لیکن ملت کے کام آئے اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

حیدر: (پر جوش آواز میں) نعرۂ تکبیر!

سب: اللہ اکبر!

(حیدر اور ہدایت اسلام زندہ باد گاتے ہوئے چل دیتے ہیں۔ اور باقی لڑکوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔)

منظر دوم

(کمرہ نمبر 42۔ بوقت دس بجے رات۔ بجلی کی چمک اور بارش کی بوچھار۔ جگت سنگھ اپنے کمرے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس لالہ لکیر چند دل کی حرکت ناپنے والا آلہ ہاتھ میں لیے بیٹھے ہیں۔ دوسری کرسی پر مہاشہ ادم دیو جی براجمان ہیں جن کے دادا کے دادا کے دادا اسی طرح ''دادا'' کو دو سو آٹھ کیجیے) کے دادا کے دادا چانکیہ کے رتھ بان تھے۔ اس لیے ادم دیو جی سیاست میں ہٹلر اور چرچل کے بھی کان کترنے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ کمرہ اچھا خاصہ سجا ہوا ہے۔ صرف ایک کھڑکی ہے جو سڑک کی طرف کھلتی ہے۔ روشن دان ہے لیکن بارش کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ فرش پر دری بچھی ہے۔ کرایہ کا فرنیچر ہے۔ ایک بڑی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود ہے۔ دروازے کے پاس کونے میں شو، چپل، فل بوٹ اور تیل کا چولھا یعنی اسٹو رکھا ہے۔ کھڑے کے پاس مراد آبادی پاندان اور لوٹا چمک رہا ہے۔ پاس ہی کالی دیوی کی مورتی ہے جس کے قریب خوشبو سلگ رہی ہے۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ہنومان جی کی تصویر ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ہنومان جی ہتھیلی پر پہاڑ رکھے اڑے جا رہے ہیں۔)

لکیر چند: بھائی جگت سنگھ۔

جگت سنگھ: کہو۔

لکیر چند: یار ایک منش کے ہردے کو ایک منٹ میں کتنی دفعہ دھڑکنا چاہیے؟

اوم دیو: (حافظے پر زور دے کر) نپولین بونا پارٹ کا دل ایک منٹ میں شرف تیس دفے دھڑکا کرتا تھا۔

لکیر چند: (دل تھام کر) اووہ — صرف تیس (30)............

جگت سنگھ: (سینہ تان کر) ارے نہیں — لکیر چند مت گھبراؤ — میں بتاتا ہوں دیکھو اگر تمھارا دل ایک منٹ میں ایک سو تیس دفے بھی دھڑکے تو اس کو کم سمجھو۔

لکیر چند: (اطمینان کا سانس لے کر) اچھا۔ تو تم...... (مشکوک ہوکر) نہیں تم مزاک کرتے ہو۔

جگت سنگھ: نہیں نہیں میں ٹھیک بتا رہا ہوں۔

لکیر چند: اوہ! تم کالی مائی کی کسم! ٹھیک بتلاؤ۔

جگت سنگھ: نہیں نہیں میں ٹھیک بتا رہا ہوں۔

لکیر چند: اوہ! تم کالی مائی کی کسم! ٹھیک بتلاؤ۔

جگت سنگھ: اسی سے لے کر چوراسی دفے تک دھڑکنا چاہیے۔

لکیر چند: یدی میں ذرا سا بھی دھما کا سن لوں تو میرا ہردے بہت تیجی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ گننا مشکل ہو جاتا ہے......اور......

اوم دیو: (جگت سنگھ سے) کیوں زناب! آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ نپولین کا ہردے ایک منٹ میں......

جگت سنگھ: (زوردار آواز میں) میں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔

اوم دیو: یہ راج نیتی کی باتیں ہیں تم کیا سمجھ سکتے ہو۔

جگت سنگھ: (سر بلند کر کے) میں بھی راج پوت ہوں۔

اوم دیو: راج پوت ہو تو یہ بھی راج نیتی ہے۔ کوئی لاٹھی چلانا نہیں ہے۔

جگت سنگھ: (بھنا کر) میں تمھارا سر توڑ دوں گا۔

اوم دیو: (گھبرا کر) یہی بری بات ہے تم میں — ارے بھائی جس کا کارج اُسی کو شا جھے......

جگت سنگھ: (تعجب سے) اس کا مطلب؟

اوم دیو: (حوصلہ پاکر) مے کہتا ہوں تم راج نیتی کی باتوں کو بالکل نہیں شمجھ شکتے۔ (اس کے مضبوط بازوؤں کو دیکھ کر) تم اتی بلوان ہو، یہ مے مانتا ہوں...... کچھ پتہ بھی ہے؟

جگت سنگھ: (کڑک کر) کچھ بکو گے بھی؟

لکیر چند: (سہم کر) اوو وہ اور میرا دل...... میرا ہارٹ...... دیکھو جگت بھائی دھیرے سے بولا کرو...... میرا دل پھر دھڑکنے لگا ہے...... دھڑکتے دھڑکتے یہ ایک دم رک جائے گا...... میں اپنے ماتا پتا کا ایک ہی پتر ہوں......'

اوم دیو: اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر، دھیرج کرو، دھیرج کرو، دھیرج کرو، تم بھی ابھی اس راج نیتی کو نہیں سمجھتے۔

جگت سنگھ: (اوم دیو کا گریبان پکڑ کر) او دیکھو اوم دیو مہاشہ! اگر تم نے مجھ کو یہ نہ بتلایا کہ راج نیتی سے تمھارا کیا مطلب ہے تو میں تم کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔

اوم دیو: (کانپ کر) دھیرج دھیرج۔ دیکھو تم ہم شب میں مہابلی کے نام سے مشہور ہو۔ ہم شرف ارہر کی دال کھاتے ہیں۔ پرنت تم مرگی، انڈا، گوست، شب ہجم کر جاتے ہو، مے پوچھتا ہوں کیا بیدوں میں کستریوں کے لیے یہ آرڈر نہیں ہے کہ وے اشتری، گائے اور براہمن کی رکشا کریں—؟

جگت سنگھ: (اس کا گریبان چھوڑ کر) تو ایسا بچن بیدوں میں ہے؟

اوم دیو: (حوصلہ پاکر) ہے کیوں نہیں، تبھی تو مے کہتا ہوں کہ تم راج نیتی کی باتوں کو بالکل نہیں جانتے۔

جگت سنگھ: (کھسیانہ ہو کر) دیکھو اوم دیو تم مجھ کو جھینپاتے ہو تبی مجھ کو کرودھ بھی آتا ہے۔

اوم دیو: (طنز سے) ہم کم جوروں پر کرودھ نہ آئے گا تو اور کش پر آئے گا۔

جگت سنگھ: (اکڑ کر) میں کسی سے بھے نہیں کھاتا۔

اوم دیو: (ہاتھ جھٹک کر اور منہ بنا کر) کشی شے بھے نہیں کھاتا— ادنہہ شامنے ملچھ لوگ وے وے کرتو یہ کرتے ہیں۔ پرنت تم کو سرم نہیں آتی۔ بش تبی تو میں کہتا ہوں کہ تم

کو راج............

جگت سنگھ: خاموش رہو بکومت۔ اب بتاؤ ملیچھوں نے کیا کیا؟

اوم دیو: (گردن بڑھا کر) کیا کیا؟ آج یہ لوگ ایک مرگی پکڑ کر لائے ہیں۔ اور اس کو ہمارے شامنے ہی گلاب کے پیڑ کے نیچے بیع کر رہے ہیں۔ مے نے کھد مرگی کے کرکرانے کی آواج شنی ہے۔

جگت سنگھ: (تن کر) کیا ان لوگوں کو ہمارے فیلنگز کا خیال نہیں؟

اوم دیو: پھیلنگز کا کھیال ملیچھ کیا کریں گے۔ وے جانتے ہیں کہ ہندوار ہر کی دال اور چاول کے شوا کچھ بھی نہیں کھاتے اور تم ایک جو مرگی انڈا کھانے والے ہو تو تم......

جگت سنگھ: او بے وقوف چوپ رو۔ (جوش میں آ کر) میں بھی راج پوت ہوں۔ ہم نے ملیچھوں کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں، ایسے کہ ایک دنے یاد بھی کریں۔ ہم آریہ ہیں۔ بھارت ورش پر ہمارا ہی ادھیکار ہونا چاہیے۔ کیا مجال جو تجھ ملیچھ اس پوتر بھومی پر ایک پل بھی ٹھہر سکیں، (ہاکی اٹھا کر) میں ابھی جا کر اُن کی خبر لیتا ہوں۔ (کڑک کر) بس اوم دیو جی مجھ کو آشیرباد دیجیے۔

(اوم دیو ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ جگت سنگھ ایک دھماکے کے ساتھ دروازہ کھول دیتا ہے...... سامنے حیدر سینہ تانے کھڑا ہے...... اور اس کی اوٹ میں ہدایت ''مصلحت'' بنا دبکا ہوا ہے۔ جگت سنگھ دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔)

حیدر: (اپنی دانست میں نہایت فصیح اللسانی سے) ہمارا دل اس صدمہ سے چور چور ہے کہ ہم کو اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ جنگ و جدل کرنے کے لیے کمر بستہ ہونا پڑا ہے۔ ہم نے ہر چند چاہا کہ آپ لوگ اپنے ضمیر اور حق کی صدا کو سنیں۔ لیکن چونکہ آپ کے ضمیر مردہ، آپ کے قلب بے جان اور آپ کی چشم ہائے آتش گیر پر کفر و خباثت کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ لہٰذا برادران ملت، نونہالانِ اسلام نے ان دو حقیر خادموں کو بحیثیت ایلچی آپ لوگوں کی سرکوبی یا کم از کم جواب طلبی کے لیے ارسال

کیا ہے۔ اگر آپ کو عبرت حاصل نہ ہوئی تو پھر تیغ حق کا سر کفر پر جگمگانا برحق، برمحل ہوگا۔ نیز یہ عین بہ رضائے اللہ وحدہ لا شریک و بہ رضائے رسول، نبی آخر الزماں یعنی آقائے دو جہاں حضرت......

لکیر چند: (سینے پر ہاتھ رکھ کر) اوہ! حیدر علی کھان! کھدا کے لیے دھیرے بولو۔

جگت سنگھ: (حیدر کی باتیں نہ سمجھتے ہوئے) ادم دیو جی!

ادم دیو: (جو منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے ہیں) جگت سنگھ جی اس وقت ہنومان چالیسا پڑھیے۔

حیدر: (ٹھٹک کر) ہدایت اللہ خاں! یہ کیا چیز ہوتی ہے۔

ہدایت: یہ ہنومان چالیسا کا فرلوگ پڑھتے ہیں تاکہ تمام بلائیں دور رہیں۔

حیدر: تو گویا ہم کو بلائیں سمجھتے ہیں۔

ہدایت: الحذر: یہ بہت نازک موقع ہے۔ مولانا نحیف کو ساتھ لے آتے تو بہتر رہتا۔

حیدر: کیا تم کو کوئی آیت یاد نہیں، میں، تم جانتے ہی ہو — میں خود عربی کی ایک سطر بھی نہیں پڑھ سکتا۔

ہدایت: ارے بھائی میں کہاں کا نمازی ہوں۔ پہلے میری دادی مجھ کر زبردستی پڑھواتی تھیں۔ مگر وہ بچپن کی باتیں اب یاد کہاں...... نہ میں نے کبھی روزہ رکھا نہ میں نے کبھی نماز پڑھی...... اُف میری دادی کہا کرتی تھی "بیٹے نماز نہیں پڑھتے۔ یاد رکھنا پچھتاؤ گے؟" لیکن میرا خیال تھا کہ جب کبھی ہم بوڑھے ہوں گے تو ایسا ہوگا۔ یہ وہم میں بھی نہ تھا کہ وہ گھڑی اتنی جلدی آن پہنچے گی۔

ادم دیو: (جگت سنگھ کو آنکھ مار کر آہستہ سے) دیکھا تم نے راج نیتی۔

(حیدر کشش و پیچ کے عالم میں ایک شکستہ کرسی پر بیٹھ جاتا ہے لیکن کرسی ایک بڑی آواز کے ساتھ ٹوٹ کر زمین پر جارہتی ہے۔ پنڈت ادم دیو جی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ہنومان چالیسا بھول جاتے ہیں۔)

ادم دیو: دیکھو ذی! مے پوچھتا ہوں، آپ لوگوں کو سرم نہیں آتی ہے۔ آپ کو کشی کے کمرے

میں گھسنے کا کیا ادھیکار ہے۔

حیدر: (حوصلہ پاک کر) خاموش!

اوم دیو: (جگت سنگھ کی اوٹ میں ہو کر) مہابلی شنکھ جی میں راج نیتی بتاؤں گا۔آپ آگے سے بولتے جایئے۔

جگت سنگھ: دیکھو حیدر علی خاں جی! آپ اگر خان ہیں تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ یہاں اس سے کام نہیں چلے گا۔

اوم دیو: (جگت سنگھ کی اچھی طرح ڈھال بنا کر) اونہہ۔ ان کی شورت اور شیرت دونوں کھراب ہیں۔ راکھشش کہیں کے۔

حیدر: (بدک کر) ہدایت اللہ خاں! یہ شورت اور شیرت کیا بلا ہیں؟

ہدایت: مطلب اس سے صورت اور سیرت ہے۔

حیدر: (گرم ہو کر) تو گویا اس نے ہماری ہی زبان کے دو الفاظ ہمارے ہی خلاف استعمال کیے۔اسی کو''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کہتے ہیں۔

ہدایت: بہت نازک موقع ہے۔ (ہاتھ بڑھا کر) میاموں ذرا میری نبض۔ (چونک کر) اوہ—اونہہ، خیر......

حیدر: ہدایت اللہ خاں! تم ہندی کا کوئی لفظ سوچو، تا کہ جواب دیا جا سکے۔

اوم دیو: (مسکرا کر جگت سنگھ سے) اسی کو راج—

ہدایت: (حافظے پر زور دے کر) آہ خوب یاد آیا۔آپ ''یدی'' کہیے۔''یدی'' بمعنی''اگر''

حیدر: (مٹھیاں کس کر اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر) یدی اگر......

لکیر چند: (سینہ دبا کر) اوہ! کھدا کے لیے حیدر علی کھاں......

حیدر: (لکیر چند سے) تم نے میری بات کیوں کاٹی؟

لکیر چند: (آلہ بڑھا کر) مگر یہ تو دل کی دھڑکن ناپنے کا اوجار ہے، قینچی نہیں۔

حیدر: (شیروانی اُتارتے ہوئے) ٹھہرو! میں تم کو بتاتا ہوں۔

(جگت سنگھ بھی آستین چڑھا کر وار کا انتظار کرتا ہے۔ اور حیدر آستین کو خوب اوپر

سنک چڑھا کر آئینے کے سامنے اپنے بائسپ کو دو تین مرتبہ پھلا کر دیکھتا ہے۔)

حیدر: (لکیر چند سے) دیکھا تم نے۔

لکیر چند: (خودداری کے جذبے کو دبا کر) جگت سنگھ حیدر علی کھان کو کہو کہ وہ اپنی آستین نیچے کر لے۔

حیدر: (بائسپ پھلا کر) نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال میری آستین نیچے کرتا ہے۔

لکیر چند: (منت سے) میں تم سے بہت کھاس بات کہنے والا ہوں مگر پہلے تم آستین نیچے کرلو۔

جگت سنگھ: (جو راج نیتی نہیں جانتا تھا) کہو بھائی لکیر چند کہو تم کیا کہنے والے تھے؟

لکیر چند: (جو راج نیتی کچھ نہ کچھ ضرور سمجھتا ہے) جگت سنگھ تم جانتے ہی ہو، حیدر علی کھاں کی ہارس پاور مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ ایک ٹرک اور سائیکل میں کیا مقابلہ؟

اوم دیو: (لکیر چند کو مشفقانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے) لکیر چند! اب تم بھی تھوڑی بہت راج نیتی......

جگت سنگھ: دیکھو حیدر کھاں! یہ بہت بری بات ہے۔ ایک تو تم ہمارے دلوں کو بری بری باتوں سے چوٹ پہنچاتے ہو اور دوسرے......

حیدر: (انتہائی جوش کی حالت میں پاؤں پھیلا کر اور ہاتھ ہوا میں بلند کر کے بڑی مہیب آواز میں چلاتا ہے) کفر کفر۔ اُف۔ او خدا تو ہم کو اتنی طاقت دے کہ ہم ان سفید جھوٹ بولنے والوں کا مقابلہ کر سکیں۔

لکیر چند: (آلہ سنبھالتے ہوئے) میں پیشاب کرنے جاتا ہوں۔

جگت سنگھ: (دلاسہ دیتے ہوئے) ٹھہرو ٹھہرو۔

لکیر چند: (بگڑ کر) نہیں ہرگز نہیں — حیدر کھان کو کہو کہ وہ آستین نیچے کرلے اور پھر شیروانی بھی پہن لے ورنہ —

حیدر: (گرج کر) ورنہ کیا؟

لکیر چند: ورنہ کیا؟ — ہم پیشاب کرنے چلے جائیں گے۔

ہدایت: واہ کیا دھمکی ہے؟

حیدر: (کچھ مشکوک ہو کر) ہدایت اللہ خاں! اگر لکیر چند پیشاب کرنے چلا جائے گا تو کیا ہوگا؟

ہدایت: (حافظے پر زور دے کر) اگر برآمدے سے باہر جائے گا تو بارش میں ضرور بھیگ جائے گا۔ ممکن ہے، سردی کھا جائے، زکام ہو جائے، یا نمونیا سے مر جائے۔

حیدر: (سوچ میں پڑ کر) ہم — تو کیا اس کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی؟

اوم دیو: (زور دار آواز میں) بے شک بھئے داری تمھاری ہوگی — (جگت سنگھ سے) اسے راج......

ہدایت: اوہ نہیں — ہم پر کیا ذمہ داری ہوگی۔

(کچھ ہندو لڑکے دھوتیاں سنبھالتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں)

ایک: آپ لوگوں نے کیا شور مچا رکھا ہے۔

دوسرا: نیند حرام کر دی۔

تیسرا: شرم کی بات ہے کچھ ایٹی کیٹ بھی ہونا چاہیے۔

چوتھا: حیدر صاحب! کیہیے آپ ہی اتنے زور سے چنگھاڑ رہے تھے۔

دوسرا: (چوتھے سے) ذرا نرمی سے بات کرو۔

ہدایت: (حیدر سے) ہم کافروں میں گھر گئے ہیں۔

حیدر: (سر بلند کر کے) پروا نہیں۔ آج ہم ان کافروں کو سیدھا رستہ بتا کر ہی رہیں گے۔

چوتھا: آخر آپ نے یہ کافر کافر کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔

حیدر: کیا تم ایلچیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟

چوتھا: (حیرت سے) ایلچی کیا ہوتا ہے؟

حیدر: ہدایت اللہ خاں اس کا ہندی لفظ بتاؤ۔

ہدایت: ہم......(سوچتے ہوئے) مجھے اس وقت یاد نہیں۔

حیدر: تو انگریزی کا کوئی لفظ بتلاؤ۔

ہدایت: (حافظے پر زور دیتے ہوئے) اے۔ ایم۔ ایم (سر کھجا کر) یاد نہیں آتا—
میسنجر سمجھ لیجیے—

چوتھا، دوسرا، پہلا، تیسرا: میسنجر؟

حیدر: (نتھنے پھلا کر) ہاں۔

چوتھا: کیا میسج ہے؟

حیدر: ہدایت اللہ خاں! اس نے کیا کہا؟

ہدایت: وہ پوچھتے ہیں کہ کیا پیغام ہے؟

تیسرا: اور کس نے بھیجا ہے؟

اوم دیو: بھگت جنو! میں بتلاتا ہوں۔ آج یہ ملیچھ لوگ ایک مرگی کہیں سے پکڑ لائے ہیں۔ اور ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں گلاب کے پیڑ کے نیچے اشکوبج کر رہے ہیں۔

سب: ہائیں— مہابلی جگت سنگھ تمھارے ہوتے ہوئے یہ اندھکار؟

حیدر: غلط بالکل غلط۔

اوم دیو: بھارت سپوتو! نر اور ناریو! یہ سمے بلیدان کا ہے۔ ان ملیچھوں نے ہمارا دھرم ناش کر دیا ہے۔ ہماری ہندو جاتی پر ان کے جلم بوہت بڑھ گئے ہیں۔ یدی آپ لوگوں نے اب بھی بھے کھا کر بلیدان کرنے سے سنکوچ کیا تو پھر بھارت ورس میں مسلم راجیہ شرو ہو جائے گا۔

حیدر: غلط بالکل غلط۔

دوسرا: ان کی بھی سنو۔

سب: ہاں بھائی صاحب آپ بھی کہیے۔

حیدر: یہ تو وہی بات ہوئی کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ پروفیسر رائیس کا گھورکھا چوکیدار کہیں سے ایک مرغی پکڑ لایا ہے اور اس کو گلاب کے پیڑ کے نیچے غیر اسلامی طریقے پر ذبح کر رہا ہے۔ اس لیے ہمارے جذبات کو ٹھیس لگی ہے۔
(سب خاموش رہتے ہیں)

اوم دیو: لیکن ہولی میں جب مسجد پر رنگ کی ایک چھینٹ گر جاتی ہے تو آپ ہندوؤں کا کھون بہا دیتے ہیں۔ وہ جاؤ نہیں؟

ہدایت: محرم کے جلوس میں جب کسی پیپل کی ایک پتی ہمارا جھنڈا چھو جانے سے گر پڑتی ہے تو کیا آپ معصوم مسلمانوں کا خون نہیں بہاتے؟

اوم دیو: آپ گائے کاٹ کر مندر میں پھینک دیتے ہیں۔

ہدایت: اور آپ بد جانور کاٹ کر مسجد میں پھینک دیتے ہیں۔

اوم دیو: (اکڑ کر) تو جو ہمارے دل میں آئے گی ہم کریں گے۔

ہدایت: (چونچ بھڑا کر) اور جو ہمارے دل میں آئے گی ہم کریں گے۔

اوم دیو: (جگت سنگھ کو اشارہ کر کے) ہم گھور کھے کی طرف داری کریں گے۔

ہدایت: (حیدر کو کہنی مار کر) ہم اس کی بوٹی بوٹی اڑا دیں گے۔

جگت سنگھ: (ہدایت سے) بکومت۔

حیدر: (آگے بڑھ کر جگت سنگھ سے) زبان بند کرا دو۔

اوم دیو: (لکیر چند سے آلہ چھین کر جھنڈے کی طرح ہوا میں بلند کرتے ہوئے) ہم اوم کا جھنڈا اونچا رکھنے کے لیے تن من، دھن سب کا بلیدان دے دیں گے۔ بولو مہابلی ہنومان جی کی۔

سب ہندو: (اچھل کر) جے۔

حیدر: (کڑک کر) نعرۂ تکبیر!

ہدایت: اللہ اکبر!

(حیدر شیر دانی کندھے پر ڈال کر ہدایت کا ہاتھ پکڑ بگولے کی طرح دروازے کی طرف جھپٹتا ہے۔ ہندو اپنی اپنی دھوتیاں سنبھالتے ہوئے رستہ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔)

منظر سوئم

کمرہ نمبر 25۔ بوقت سوا دس بجے شب۔ بجلی کی چمک اور بارش کی بوچھاڑ۔ فتح سنگھ بیٹھک لگا رہے ہیں۔ قد چھ فٹ چار انچ۔ رنگ کالے کوّے کی طرح۔ داڑھی بے تحاشہ اُگی ہوئی جیسے بئے کا گھونسلا۔ ایک آنکھ بھینگی۔ جسم گٹھا ہوا، جیسے گوشت اور ہڈی کا پہاڑ۔ پاس دوسرا بنیا سکھ کھڑا ہے۔ قد پانچ فٹ، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ فتح سنگھ کی ہر بیٹھک پر وہ سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہے۔ کمرے میں سینڈو اور گاما پہلوان کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ کسی حسین عورت کی تصویر نہیں ہے۔ سوائے دو بھونڈی اور بھدّی پہلوان عورتوں کی تصویروں کے۔ ایک کونے میں لوہے کا گولا۔ ہیمر، ڈمبل، چیسٹ اکسپینڈر اور پاس ہی کڑوے تیل کی ایک عدد بوتل۔ ایک طرف پلنگ، چند کرسیاں اور باقی ضروری سامان اور فرنیچر۔ ایک چھوٹی سی تپائی جس پر دو بکروں کا بھیجا گھی میں تلا ہوا رکھا ہے۔

فتح سنگھ: جیون سنگھ بیٹھک لگاؤ نا!

جیون سنگھ: (رونی صورت بنا کر) میرا دم پھول رہا ہے۔

فتح سنگھ: (بھاری آواز میں) میں نہیں سمجھتا کہ آخر یو پی میں سکھ ازم کا پرچار کیوں کیا جا رہا ہے...... کم بخت تم ایک سانس میں پان سو بیٹھک بھی نہیں لگا سکتے۔

جیون سنگھ: (دل میں کچھ سکھی جوش محسوس کر کے بیٹھک لگانا شروع کرتا ہے) ایک، دو، تین، چار...... دس، بیس۔

فتح سنگھ: کیوں بس ختم؟

جیون سنگھ: (بمنت) میں اب کچھ اور کروں گا۔

فتح سنگھ: اچھا ڈمبل کرو۔

جیون سنگھ: (خوش ہو کر) بہت اچھی بات۔ (اس کے دم میں دم آ جاتا ہے۔) فتح سنگھ! میں نے ایک بہت مزے کی بات سنی ہے۔

فتح سنگھ: (بیٹھک لگاتے ہوئے) وہ کیا؟

جیون سنگھ: کل، سنتے ہیں بہت لطف آ گیا۔

فتح سنگھ: کیسا لطف؟

جیون سنگھ: میں نے سنا ہے کہ جب آپ لوگ ہاکی کھیل رہے تھے...... جب آپ ہاکی کھیل رہے تھے......

فتح سنگھ: ہاں ہاں کہو۔

جیون سنگھ: (خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے) تو......تو......تو گیند ایک دم اُچھلی اچھلی اور اُچھل کر غائب ہوگئی۔

فتح سنگھ: (انجان بن کر) اچھا پھر؟

جیون سنگھ: بہت دیر تک لوگ اِدھر اُدھر ڈھونڈتے رہے— دس منٹ کے بعد وہ آپ کی داڑھی سے نکل آئی...... کیا یہ بات درست ہے؟

فتح سنگھ: (کھسیانہ سا ہو کر) اوہ...... ہاں۔ ہاں...... (ڈانٹ کر) اور تم باتیں کر رہے ہو۔ ڈمبل کرو۔

جیون سنگھ: (جھنجھلا کر) لیکن مجھ سے اتنا جھنجھٹ نہیں ہوتا فتح سنگھ: اب تو بارش بھی زیادہ ہو رہی ہے...... دس سے اوپر ٹائم ہو چکا ہے۔ نیند آ رہی ہے۔

فتح سنگھ: تو کیا تم کچھ انوکھے پیدا ہوئے ہو— میں بھی تمھارے ساتھ ہی ورزش کرتا ہوں۔

جیون سنگھ: آپ تو چوبیسوں گھنٹے یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔

فتح سنگھ: ٹورنمنٹ شروع ہونے والے ہیں۔ مجھ کو کشتی، باکسنگ، ہیمر تھرونگ، اور ہیوی ویٹ لفٹنگ میں پچھلے کل ریکارڈ توڑنا ہیں۔

جیون سنگھ: ہمارا دوسرا سال ہے۔ امتحان سر پر آ رہے ہیں۔ اس کی بھی خبر ہے۔ اس میں کون ریکارڈ توڑے گا— یہاں تو پاس ہونے کی امید تک نہیں۔

فتح سنگھ: (لاپروائی سے) یہ ریکارڈ راجہ راؤ سنگھ توڑے گا۔ اور جغرافیہ میں گولڈ میڈل میاموں لے جائے گا۔ چلو قصہ پاک ہوا۔

جیون سنگھ: لیکن جس شخص کو ٹورنمنٹ میں ریکارڈ ہی نہ توڑنا ہو وہ کسرت کیوں کرے۔

فتح سنگھ: اگر تم میرے سامنے فلسفیانہ باتیں کرو گے تو میں تمھاری ٹانگیں باندھ کر برآمدے میں لٹکا دوں گا۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ: کون؟ (جیون سنگھ سے) دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے)

حیدر: آداب عرض مسٹر فتح سنگھ! کہو بھائی ٹورنمنٹ کی تیاری ہو رہی ہے کیا؟

فتح سنگھ: (گرم جوشی سے) آداب عرض بھائی حیدر علی خاں۔ آؤ بیٹھو۔ کیا کیا جائے اب تو سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

ہدایت: (مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے) آداب عرض ہدایت بھائی۔ آپ دونوں صاحبان کرسیوں پر تشریف رکھیں......آپ کی کیا خدمت کی جائے۔

جیون سنگھ: جس کا دل چائے پینے کے لیے بے قرار ہے۔ فتح سنگھ بھائی چائے بناؤں۔

فتح سنگھ: (دانت پیستے ہوئے مگر بظاہر نرم آواز میں) ہاں ہاں بناؤ۔ ضرور تیار کرو۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ: جیون سنگھ دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے۔ راجہ راؤ سنگھ اندر داخل ہوتا ہے۔ رنگ گندمی، داڑھی مونچھ صفا چٹ، سیدھا سادا مسکراتا ہوا چہرہ)

راجہ راؤ: گڈ ایوننگ سردار۔

فتح سنگھ: (حسب معمول گرم جوشی سے) گڈ ایوننگ پوپ۔

جیون سنگھ: (حلیمی سے) چائے کا ایک پیالہ اور بڑھا دوں کیا؟

فتح سنگھ: (دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے، بظاہر، ہاں ہاں شاباش۔ (جیون سنگھ نہایت سعادت مندی کے ساتھ اسٹو جلانے میں مصروف ہو جاتا ہے۔)

راجہ راؤ: (فتح سنگھ سے) تم نے وہ ٹالسٹائی کا ناول پڑھ لیا کیا؟

فتح سنگھ: اوہ نہیں — میں پڑھنے کے لیے ٹائم نہ نکال سکا۔

راجہ راؤ: بھئی اس کو ضرور پڑھو۔ ٹالسٹائی دنیا کے زبردست ترین مصنفوں میں شمار ہوتا ہے۔

فتح سنگھ: (تولیہ سے بدن کی چکنائی پونچھتے ہوئے) ہاں ہاں بھائی اس نے کینیڈا کا نام دنیا بھر میں مشہور کر دیا ہے۔

راجہ راؤ: کینیڈا نہیں روس......روس۔

فتح سنگھ: اور روس۔ روس۔ بے شک۔ ایم سوری۔ (اپنی قابلیت کا مزید ثبوت دینے کے لیے) ٹالسٹائی پر مہاتما گاندھی کی تعلیم کا خاص اثر ہوا ہے۔ اس کی تصانیف میں اس کی خاص جھلک نظر آتی ہے۔

راجہ راؤ: (جھنجھلا کر) اوڈیم اٹ............تم اُلٹی بات کہہ رہے ہو۔ ٹالسٹائی کے فلسفہ کی مہاتما گاندھی کی تعلیم میں خاص جھلک نظر آتی ہے۔

فتح سنگھ: (کھسیانہ ہو کر) او ہو ہو ہو — اُف میرا ذہن بھی......(بھنّا کر) جیون سنگھ!!

جیون سنگھ: (عاجزی سے) جی!

فتح سنگھ: (کچھ بہانہ نہ پا کر) تم......تم......اچھا چائے بنا رہے ہو؟ ہاں بس ٹھیک بالکل ٹھیک (مصنوعی قہقہہ لگا کر) جیون سنگھ بچارا بہت خدمت کرتا ہے کر سیوا کھا میوا۔

حیدر: (کہنی مار کر ہدایت سے) اب بہت ڈپلومیسی کے ساتھ اپنے یہاں آنے کا مدعا بیان کرنا چاہیے۔

ہدایت: بہتر ہو اگر تم کہو۔ کیوں کہ تمھاری بات کا اُسے خاص احترام ہے۔

حیدر: (کھانس کر ذرا بلند آواز میں) مسٹر فتح سنگھ آج میں ایک خاص کام کی وجہ سے حاضر ہوا تھا۔

فتح سنگھ: (نہایت جوشیلے طریقے سے) کہیے، کہیے۔

حیدر: (ہچکچاتے ہوئے) ممکن ہے آپ............

فتح سنگھ: (ہمت افزا انداز میں) ارے صاحب بلا تکلف فرمائیے — جان تک حاضر ہے۔ جہاں آپ کا خون گرے میں پسینہ......

ہدایت: (بات کاٹ کر) سردار فتح سنگھ آپ کو شاید محاورے کا صحیح استعمال معلوم نہیں۔

فتح سنگھ: (مشکوک ہوکر) ارے بھئی زبان اردو ہمارے لیے ایک اجنبی زبان ہے، اس پر کمانڈ — اور پھر آپ میرا مطلب تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

حیدر: بے شک بے شک۔ اچھا اب سنیے۔

فتح سنگھ: (ہمہ تن گوش ہوکر) فرمایئے۔

(دروازے پر دستک)

فتح سنگھ: کون ہے بھائی؟ جیون سنگھ دروازہ کھولو۔

(جیون سنگھ دروازہ کھولتا ہے)

جگت سنگھ، اوم دیو: جے رام جی سردار کی فتح سنگھ۔

فتح سنگھ: جے رام کی — آؤ بھائیو! بیٹھو۔

جیون سنگھ: (نہایت عقیدت مندانہ انداز سے) سردار فتح سنگھ کیا چائے دو پیالے اور بڑھا دی جائے۔

فتح سنگھ: (دل ہی دل میں آگ بگولا ہو کر، بظاہر) اوہ! ہاں ہاں...... بے شک...... ضرور......

(اوم دیو جی چائے کا نام سن کر دانت نکال کر اظہار خوشنودی کرتا ہے۔)

فتح سنگھ: (جگت سنگھ سے مخاطب ہوکر) آج تو سردی بھی خوب ہے۔ چائے پینے میں بہت مزا آئے گا۔ (چینی کے اخراجات کا خیال آتے ہی جیون سنگھ کی طرف گھور کر دیکھتا ہے۔)

جگت سنگھ: جی ہاں — (سکوت) میں ذرا ایک خاص کام کی وجہ سے آیا تھا...... اگر آپ کچھ مدد دے سکیں۔

فتح سنگھ: (گرم جوشی سے) ہاں ہاں بندہ حاضر ہے۔ جہاں آپ کا خون گرے بندہ اپنا (مشکوک ہوکر) یعنی میرا مطلب ہے جہاں میرا پسینہ گرے وہاں آپ کا (پھر مشکوک ہوکر ہدایت کی طرف دیکھتا ہے) ہدایت صاحب محاورہ ٹھیک بیٹھتا نہیں۔

ہدایت: (حیدر کے کان میں) پہلے ہم کو اپنا قصہ بیان کرنا چاہیے (فتح سنگھ سے) جی ہاں جی ہاں — وہ محاورہ ٹھیک ہو جائے گا...... آہستہ آہستہ مشق کرنے سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فتح سنگھ: (لجاجت سے) ہدایت اللہ خاں! کیا بہتر نہ ہوگا۔ کہ آپ اردو محاورات کا صحیح استعمال سکھلا دیں۔

ہدایت: ضرور ضرور میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ کل ہی سے شروع کر دیجیے نا۔

فتح سنگھ: اور میں بھی آپ کی خدمت کے لیے ہر طرح سے تیار ہوں۔

حیدر: سردار فتح سنگھ! آپ نے پہلے ہمارا قصہ سننے کا وعدہ کیا ہے۔

فتح سنگھ: (کرسی حیدر کے قریب کھسکا کر) ہاں فرمائیے۔

جگت سنگھ: مگر میری بات تو ابھی پوری ہوئی نہیں۔

فتح سنگھ: (کرسی جگت سنگھ کے قریب کھسکا کر) ہاں ہاں فرمائیے۔

حیدر: (جگت سنگھ سے) تم بدتمیز ہو۔

جگت سنگھ: (حیدر سے) تم بدتمیز ہو۔

حیدر: (فتح سنگھ سے) ادھر دیکھیے۔

جگت سنگھ: (فتح سنگھ سے) ادھر دیکھیے۔

فتح سنگھ: (گھبرا کر) آپ لوگ کچھ فرمائیے بھی۔

جگت سنگھ، حیدر: دونوں ایک ساتھ آج ایک مرغی......

فتح سنگھ: (جھلا کر اُچھل کھڑا ہوتا ہے) آہا ایک مرغی، ایک مرغی، کہاں ہے مرغی؟ (فتح سنگھ کے سر کے بال کھل جاتے ہیں۔ راجہ راؤ سنگھ اس کی صورت دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔)

راجہ راؤ: (فتح سنگھ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر) پلیس، پلیس...... دوستو ہم یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں۔

فتح سنگھ: (وحشیانہ انداز میں) بکریاں، بکریاں۔ یسوع مسیح کی بکریاں......

راجہ راؤ: ڈیم اٹ۔ بکریاں نہیں بھیڑیں۔

فتح سنگھ: (چونک کر) بھیڑیں۔ اچھا بھیڑیں ہی سہی، یسوع مسیح کی بھیڑیں۔ لیکن اس کے کیا معنی؟ کل تم کہو گے کہ ہم سب کامن روم کی چھپکلیاں ہیں۔

جیون سنگھ: (سب کے آگے چائے کے پیالے رکھتے ہوئے) آپ لوگ خاموش ہو جائیے (فتح سنگھ سے) میں کل قصہ سناتا ہوں۔ پندرہ منٹ پہلے کی بات ہے کہ ایک مرغی ہوسٹل کے احاطہ میں آئی یا لائی گئی۔ مسلمان کہتے ہیں کہ گورکھا اس کو غیر اسلامی طریقے سے ذبح کر رہا ہے اور اس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ ملیچھ پکڑ کر لاتے ہیں اسے اور اب اُس کو حلال کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا احتمال ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ صحیح بات ہے کہ گورکھا اس کو غیر اسلامی طریقے پر ذبح کر رہا ہے تو اس کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ مسلمان اس میں ٹانگ اڑانے والے کون؟

فتح سنگھ: (شش و پنج میں پڑ کر) کیوں پوپ تمھارا کیا خیال ہے؟

راجہ راؤ: مرغی خواہ کسی بھی طریقے سے ذبح کیوں نہ کی جائے میں صرف اس کے پک کر تیار ہو جانے پر اپنی خدمات پیش کر سکتا ہوں۔

جیون سنگھ: چائے سرد ہوئی جا رہی ہے۔ آپ چائے نوش فرمائیے (فتح سنگھ کو چائے کا نام سن کر پھر چینی کا خرچ یاد آجاتا ہے اور اُس کا خون کھولنے لگتا ہے) اور آیئے سردار صاحب ہم دونوں ''ہم مذہب'' اس بات پر مشورہ کر لیں۔ (دونوں ذرا پرے چلے جاتے ہیں)

فتح سنگھ: (گرم ہو کر) تو نے چینی بہت خرچ کر دی۔

جیون سنگھ: (دلاسہ دیتے ہوئے) ارے میں آپ کو آج مرغی کھلاؤں گا۔ آپ آدھ پاؤ چینی کو روتے ہیں۔

فتح سنگھ: (خوش ہو کر) ارے بھائی وہ کیسے؟

جیون سنگھ: آپ ان دونوں پارٹیوں کے نمائندوں سے کہہ دیجیے کہ میرے دونوں سے

تعلقات بہت اچھے ہیں۔ اس لیے میں یا ہم دونوں غیر جانبدار گویا نیوٹرل رہیں گے۔

فتح سنگھ: معقول۔ اچھا پھر کیا ہوگا؟

جیون سنگھ: ہوگا کیا؟ جب وے دونوں لڑیں گے تم ہم اس ہنگامہ میں مرغی اڑا دیں گے۔

فتح سنگھ: (اُچھل کر) بہت خوب آخر تمھارا بنیا پن کام آ ہی گیا۔

(دونوں واپس جاتے ہیں)

فتح سنگھ: (متانت سے) مسٹر جگت سنگھ مہابلی! میرے حیدر علی خاں سے برادرانہ تعلقات ہیں۔ اس لیے میں ان کے خلاف کوئی کارروائی ہرگز ہرگز نہیں کرسکتا۔ (حیدر سے) مسٹر حیدر علی خاں آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے مہابلی جگت سنگھ سے کیسے مراسم ہیں۔ اس لیے میں ان کے خلاف کچھ کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ علاوہ ازیں (جیون سنگھ کی طرف اشارہ کر کے) ہماری آبادی کے پچاس فی صد حصہ کا پیش تر ہی سے غیر جانبدار رہنے کا ارادہ ہے۔ اس لیے...... کیوں پوپ؟

رابرٹ راؤ: میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ ہم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں۔

حیدر، جگت سنگھ: تو گویا مطلب یہ کہ آپ اگر ہماری طرف سے نہیں لڑیں گے۔ تو ہمارے خلاف بھی نہیں کریں گے۔

فتح سنگھ: (جیون سنگھ سے) کیوں جیون سنگھ یہی مطلب ہے نا ہمارا؟

جیون سنگھ: (آداب بجالا کر) جی ہاں! بالکل...... بالکل......

حیدر: (ایک دوسرے کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے) نعرۂ تکبیر!

جگت سنگھ: مہابلی ہنومان کی۔

اوم دیو: (ایک دوسرے کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے) جے!

ہدایت: اللہ اکبر!

(زمین پر اخبار کا ایک ٹکڑا پڑا ہے جس پر لکھا ہے۔ ’یورپ کے وہ کتب خانے جہاں پر کتوں اور ہندوستانیوں کو جانے کی اجازت نہیں‘ حیدر، جگت سنگھ، ہدایت، اوم

دیواس کو پاؤں تلے روندتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔)

راجہ راؤ: چائے کے لیے شکریہ سردار، شب بخیر۔

فتح سنگھ: (چہک کر) شب بخیر پوپ!

(راجہ راؤ سنگھ کی روانگی)

منظر چہارم

ہوسٹل کا درمیانی پارک۔ جہاں بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ چاروں طرف تاریکی ہے۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک جاتی ہے۔ بارش کا شور اور بادل کی گرج ٹھنڈی ہوا تیزی اور تندہی کے ساتھ چل رہی ہے۔ بائیں ہاتھ والے برآمدے میں ہندولڑکے جمع ہو رہے ہیں۔

مسلم کیمپ

حیدر: ہدایت اللہ خاں! کیا یہ سب لوگ تیار ہیں؟

ہدایت: جی ہاں!

حیدر: کیا سب لوگ سامان حرب وضرب سے لیس ہیں؟

ہدایت: میاموں کے سوا سب کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ چیز ہے۔ مثلاً کرسی یا کھاٹ کا پایہ، جھاڑو، لوٹا، چھتری، ہاکی، ڈنڈا وغیرہ۔

حیدر: اور میاموں؟

ہدایت: اس کے ایک ہاتھ میں میری کلائی ہوگی دوسرے میں جمیل کی۔

حیدر: بہت خوب — اچھا روانہ ہو جانا چاہیے۔

ہدایت: (اپنی ترکی ٹوپی ہوا میں لہرا کر) چلو۔ (میاموں سے) میاموں ادھر آؤ تم میری نبض تھامو۔ (سب کی روانگی)

میاموں: (ہدایت اور جمیل سے) آپ لوگ ساتھ ساتھ چلیے۔ میں دونوں کی کلائیاں کیوں کر تھام سکتا ہوں؟

(وہ دونوں تھوڑی دور ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ پھر دور دور ہو جاتے ہیں۔)

میاموں: دیکھئے آپ میری بات ہی نہیں سنتے۔

ایک لڑکا: نقار خانہ میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے؟

میاموں: (بگڑ کر) تمھارا اس سے مطلب؟

وہی لڑکا: بہت افسوس کی بات ہے کہ میں تو آپ کی طرف داری کروں اور آپ مجھی کو ڈانٹ رہے ہیں۔ اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تمھاری بات نہیں سنتے۔

میاموں: (محتاط ہو کر) بھئی معاف کرنا، اردو میں میری وکیبولری بہت کم ہے۔

دوسرا لڑکا: (جو ہومیو پیتھی پڑھ رہا ہے۔ 'وکیبولری' کو کسی قسم کا پھوڑا سمجھتے ہیں) پھر بھی احتیاط لازی ہے۔ تمھارا خون خراب ہے۔ آرسنک 200 ڈیلیوژن ہر ہفتہ یک بوند ہمراہ آب تازہ۔ خوشبودار اشیا از قسم لونگ، لہسن، پیاز، الا ئچی سے پرہیز کلی۔

جمیل: (گھبرا کر) میری نبض تیز چل رہی ہے۔

حیدر: (ہاتھ سے اشارہ کر کے) بس خاموشی سے ساتھ چلے آؤ۔ وہ دیکھو سامنے' وہ لوگ بھی چلے آ رہے ہیں۔

ہندو کیمپ

(بہت سے ہندو لڑکے دھوتیاں سنبھالے اور مسلمانوں کی طرح وہ بھی اسی قسم کے ہتھیاروں کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔)

لکیر چند: (آلہ کانوں سے لگا کر) مہابلی تم نے کیا بتایا۔ ایک منش کا ہردے ایک منٹ......

ایک لڑکا: (ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر) اس وقت خاموش رہو۔

لکیر چند: (غرّا کر) دیکھو میں تم سے نہیں پوچھ رہا ہوں؟

دوسرا: دیکھو بھارت سپوتو! یہ موقع جھگڑے کا نہیں۔

لکیر چند: کیوں مہابلی۔

جگت سنگھ: (ڈانٹ کر) ایک دفعہ اور بتاؤں گا۔ اگر تم نے پھر پوچھا تو تمھارا سر توڑ دوں گا۔

لکیر چند: (سہم کر) اچھی بات۔

جگت سنگھ: اسی سے لے کر چوراسی تک۔

لکیر چند: (اوم دیو سے) اوم دیو جی! آپ ایک طرف ہو جایئے۔ مہابلی کے پیچھے مجھ کو چلنے دیجیے۔

اوم دیو: تم میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔

لکیر چند: (اوم دیو کی اوٹ میں ہو کر) میرا ہردے بہت تیزی سے دھڑکنے لگا ہے۔ اب نوے رفتار ہو گئی...... اب سو...... اب ایک سو دس...... اُف...... ایک سو بیس...... او وہ......

جگت سنگھ: سب لوگ خاموش رہو۔ وہ دیکھو وے لوگ چلے آ رہے ہیں۔

اوم دیو: گلاب کے پیڑ کی طرف چلو۔

(مرغی کے پھڑ پھڑانے کی آواز آتی ہے۔ جس سے دونوں کیمپوں میں ہل چل پیدا ہو جاتی ہے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے کے نزدیک پہنچ رہی ہیں۔ آخر کار دونوں پارٹیاں بارش میں شرابور گلاب کے پیڑ کے قریب پہنچ جاتی ہیں۔)

حیدر: (لاٹھی ہوا میں بلند کر کے اور مہیب آواز میں چلّاتا ہے) نعرۂ تکبیر!

مسلم پارٹی: (چلّا کر) اللہ اکبر!

جگت سنگھ: (ہوا میں اُچھل کر) بولو مہابلی ہنومان جی کی۔

ہندو پارٹی: جے!

معاً اس قدر مہیب اور کرخت آوازیں سن کر بھورے رنگ کا ایک جنگلی بلا منہ میں ایک مرغی دابے گلاب کے پیڑ کے نیچے سے جست لگا کر باہر آتا ہے اور بے طرح بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ دونوں کیمپوں میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ مسلم کیمپ میں جمیل کی نبض ایک اسکندری کھاتی ہے اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ ہندو کیمپ میں لکیر چند کا دل کپڑا سینے والی مشین کی سی تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگتا ہے اور وہ اس حادثہ میں سور چت ہو کر لڑک جاتا ہے۔ دونوں پارٹیاں ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور اپنے اپنے بے ہوش سورماؤں کو لے کر اپنے اپنے

برآمدوں کی طرف چل دیتے ہیں۔

(وقفہ)

(فتح سنگھ ہاتھ میں ایک بڑا سالٹھ لے کر جیون سنگھ کے ساتھ میدان کارزار میں نمودار ہوتا ہے۔)

فتح سنگھ: (حیرت سے) سب لوگ کدھر گئے؟

جیون سنگھ: (بنگجر آئین کی شیشی نہایت اطمینان کے ساتھ جیب میں رکھتے ہوئے) نہ معلوم کہاں چل دیے سب لوگ۔ اور وہ مرغی۔

(گ

رکھا چوکیدار آتا ہے)

فتح سنگھ: کہو گورکھے! تم کہاں گھوم رہے ہو؟ کس کو ڈھونڈ رہے ہو؟

گورکھا: پروفیسر رائیس کی مرغی تلاش کر رہا ہوں۔ کھو گئی۔ جمعدار کہہ رہا تھا کہ اس کو بلی پکڑ کر اسی طرف لائی ہے۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں۔

(چوکیدار کی روانگی)

فتح سنگھ: (آہ بھر کر جیون سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ مار کر) جیون سنگھ۔

جیون سنگھ: (ہاتھ کی ضرب سے لرز کر) اگر تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہو یا میرے ہونے والے بچوں کے لیے کوئی وصیت کروانا چاہو، یا میری ہونے والی بیوی کے نام کوئی پیغام حاصل کرنا چاہو یا جو بھی خدمت لینا چاہو وہ دوسرا دھپ مارنے سے پہلے لے لو۔

(بجلی چمکتی ہے اور راجہ راؤ اپنے کمرے کے آگے کھڑا نظر آتا ہے)

فتح سنگھ: (پکار کر) سنو پوپ! تم جو کہہ رہے تھے کہ ہم سب یسوع مسیح کی بھیڑیں ہیں میں کہتا ہوں کہ اگر کل تم یہ کہنے لگو کہ ہم سب کامن روم کی چھپکلی......

(بجلی دوبارہ چمکتی ہے۔ اور راجہ راؤ زبان باہر نکال کر منہ چڑا، کمرے کے اندر گھس دروازہ بند کر لیتا ہے۔) (پردہ)

☆☆☆

یہ ڈراما افسانوی مجموعہ 'جنگا' میں شامل ہے۔

پیامبر

افراد

پیراس.................اسکندریہ کا حکمران

ہیلروفان.................پیراس کا دوست

پندورہ.................پیراس کی محبوبہ

درباری سپاہی، نوکر چاکر وغیرہ

....

قصہ........................ فرضی

مقام........................ قدیم شہر اسکندریہ

زمانہ

جب کھیتوں اور چراگاہوں میں گڈریے، کسان بانسریوں اور الغوزوں کی تانیں اڑایا کرتے، راتوں کو یونانی امرا کوچوں پر دراز مصری کنواریوں کے رقص کا لطف اٹھایا کرتے، پھر بربط اور دف کے ساتھ تروجہ کی لڑائی، یولی سس کے کارنامے، جیسن کی بہادری کے قصے دہرائے اور گائے جاتے تھے۔ جب تماشے کے منڈپ میں بے شمار تماشائی اکٹھے ہوتے۔ محفلیں جمتیں، دعوتیں اڑتیں، بحث مباحثے ہوتے — غرض یہ تھا وہ زمانہ۔

منظر اوّل

وقت.................صبح

کشادہ اور صاف ستھرے بازار میں خوب چہل پہل ہے۔ کنعانی، قرطاجنی اور یونانی تاجروں میں خرید وفروخت کا بازار گرم ہے...... یہودی لمبے لمبے چغے پہنے لوبان اور کئی اقسام کی خوشبوئیں بیچ رہے ہیں۔ بالوں کی کنڈلیاں چربی سے جمائے اور انھیں شتر مرغ کے

پروں سے سجائے حبشی لڑکیاں کھجور کے پتوں کے پنکھے بیچتی پھر رہی ہیں۔ ناچنے والیاں سرمہ کاجل لگائے چند بے فکروں کے حلقہ میں تھرک تھرک کر ناچ رہی ہیں۔ یونانی نوجوان جنھیں فنون جنگ کی مشق، کسرت، کشتی اور سیر و شکار کے سوا کچھ شغل نہیں۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اِدھر اُدھر سرگشت کر رہے ہیں۔ اور مصری دوشیزائیں جن کو افزائش حسن کے سوا کوئی کام نہیں ہے، گھونگے کی راکھ اور بھیڑ کے سینگ کا سفوف جسم پر مل کر اور پھر زیتون کے تیل سے غسل کر کے دریچوں سے جھانک رہی ہیں۔ اس وقت ایک خوش رو نوجوان گھوڑے پر سوار بازار میں داخل ہوتا ہے۔ اس کا سفید و تیز و تند گھوڑا طاؤس کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر، رکتا، جھجکتا، اور اتراتا ہوا چلتا ہے۔ ایک حسین رقاصہ لب سڑک پتھر کے کوچ کے سہارے کھڑی ہے۔ وہ نوجوان اس کے پاس آ کر ٹھہر جاتا ہے۔

نوجوان: حسینہ! کیا آپ بتلا سکتی ہیں کہ اس وقت عالی جاہ شاہ پیرامس سے ملاقات کس جگہ ہو سکتی ہے؟

رقاصہ: (مسکرا کر) معاف کیجیے گا۔ میں تو جناب کا ٹھاٹھ دیکھ کر سمجھے بیٹھی تھی کہ آپ ہمارے پاس تشریف لا رہے ہیں۔ کیوں کہ آپ جیسا کون سا خوب رو نوجوان ہوگا جو ہم سے ملاقات کرنے کا خواہش مند نہیں، اور جو ہمارا رقص دیکھنے کے لیے بے قرار نہیں، آپ تو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، مگر میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اسکندریہ میں کسی نے آپ سا حسن نہیں پایا۔ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟

نوجوان: (کچھ شرما کر) میں کافی دور سے آ رہا ہوں۔ عالی جاہ کے لیے ایک اہم پیام لایا ہوں۔

رقاصہ: اے حسین نوجوان! تم محبت کے سوا اور کیا پیام دے سکتے ہو۔ تم عشق کو حسن کی بے قراری کا پیام دینے تو نہیں آئے ہو؟

نوجوان: نہیں اے حسینہ! میں صرف اس قدر بتا سکتا ہوں کہ میں ایک ایسا پیام لیے جا رہا ہوں جس سے ممکن ہے تمام شہر پر حزن و ملال کے بادل چھا جائیں۔

رقاصہ: تو یقیناً دشمن بہت نزدیک آ چکے ہوں گے۔ مگر دیکھیے نا! یہاں تو بچاؤ کی کوئی تدبیر

ہی نہیں کی جا رہی (قریب آ کر اور نوجوان کا ہاتھ تھام کر) اس میں ایک بھید ہے۔ (اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ لہجہ میں) عالی جاہ جنگ میں جانے سے کتراتے ہیں، آپ ہی کہیے کہ بھلا جب عالی جاہ سالارِ جنگ لومڑی کی طرح دبک کر بیٹھا ہو تو پھر سلطنت تباہی سے کیوں کر بچ سکتی ہے؟

نوجوان: میں نے سنا ہے کہ عالی جاہ ایک بے مثل——

رقاصہ: آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ عالی جاہ سا شیر نر پردۂ دنیا پر نہیں لیکن (اور قریب ہو کر) افواہ ہے کہ ان کے دل پر ایک کافر جمال حسینہ............

نوجوان: (بات کاٹ کر) مجھے رستہ بتا دیجیے۔

رقاصہ: (دل فریب انداز سے) کچھ دیر غریب خانہ پر آرام فرمایئے۔

نوجوان: (ہاتھ چھڑا کر) میں ان باتوں کے سننے کا بھی عادی نہیں ہوں۔

رقاصہ: (ایک قدم ہٹ کر) اتنی خفگی؟

نوجوان: (بے چینی سے) اگر آپ ایک پردیسی کو رستہ نہ بتا سکتی ہوں تو اسے دق کرنے سے کیا حاصل؟

رقاصہ: (ادا سے) اچھا جی! تو ذرا ادھر دیکھیے۔

(نوجوان اس کی طرف دیکھتا ہے)

رقاصہ: (جیسے شرم کے مارے زمین میں گڑی جا رہی ہو) اجی ہماری طرف نہیں۔ (اشارہ کر کے) اُدھر دیکھئے۔

(نوجوان جھینپ جاتا ہے)

رقاصہ: سیدھے چلے جایئے۔ وہاں آپ دیوتا مرکری کا مجسمہ دیکھیں گے۔ مجسمہ کے جس ہاتھ میں نقرئی ڈنڈا ہو بس ادھر ہی گھوم جایئے۔ آگے پتھر کا ایک ابوالہول۔ اس ابوالہول کے داہنے پہلو پر کھڑے ہو کر دیکھیں گے تو دو سنہری برجیاں دکھائی دیں گی۔ بس وہیں پہنچ جایئے گا۔

نوجوان: (سر کو خم دے کر) شکریہ!

رقاصہ: (شوخی سے مسکرا کر) شکریہ ادا کرنا ہو تو بعد فرصت ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائیے گا۔ وہ جہاں شمع دانوں پر موم جما نظر آتا ہے۔

(نوجوان شاید دل میں اسکندریہ کی بے باک دوشیزاؤں کو کوستا ہوا، مگر بہ ظاہر کھسیانا سا ہو کر گھوڑے کو ایڑ دیتا ہے اور ہوا ہو جاتا ہے۔)

منظر دوم

شاہی محل کا دالان.....................وقت: صبح سے کچھ بعد

جگہ بہ جگہ خوب صورت پھول کھلے ہوئے ہیں۔ انگور کی بیلیں بل کھاتی ہوئی تانبے کے ابوالہول پر چڑھ آتی ہیں۔ اور انگوروں کے گچھے ابوالہول کی پیشانی پر لٹکے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے دولہا کے سہرا باندھ دیا ہو۔ ایک طرف ہرقلیز کا دیو قامت مجسمہ ہے جس کے پاؤں سبز کائی سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ پاس ہی چھوٹے سے تالاب میں مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جب سطح آب سے ابھرتی ہیں تو تیز دھوپ میں چمک کر عجب منظر پیدا کرتی ہیں۔ دروازہ کے آگے پتھر کی میز پڑی ہے جس پر انگور بکھرے ہوئے، سرکہ پھیلا ہوا اور شراب کی صراحی اُلٹی ہوئی ہے۔ پاس ہی کئی فوجی افسران خاموش بیٹھے ہیں۔ گویا سب کسی گہرے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اتنے میں بطروفان داخل ہوتا ہے پھر وہ مختصر سی سیڑھیاں طے کر کے سب کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر ایک شخص اٹھتا ہے۔

وہ شخص: اے بطروفان! عالی جاہ آمادہ نہیں ہوتے۔ ہزار سر پٹکا مگر سب بے سود۔

بطروفان: (ماتھے پر بل ڈال کر اور اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر خاموش رہتا ہے)

وہ شخص: ہم نے عرض کی کہ حضور کی قوم، حضور کی سلطنت، حضور کی آزادی سب خطرہ میں ہیں۔ جو غلام ہیں وہ حکم ران اور جو حکم ران ہیں وہ غلام ہو جائیں گے۔ ہماری عورتوں کی بے حرمتی ہوگی، ہماری عزت، ہماری دولت، ہماری شوکت، ہماری

تہذیب وتمدن سب پر پانی پھر جائے گا۔ آنے والی نسلیں ہم پر لعنت بھیجیں گی—
مگر وہ خاموش رہے—

بیلروفان: تم نے سب کو کہا۔ مگر جو بات کہی جانی چاہیے تھی وہ پھر بھی نہ کہی۔

(یہ کہہ کر بیلروفان دروازہ کی طرف لپکتا ہے اور جھپٹ کر دروازہ کھول دیتا ہے۔ حاضرین چیخ کر اُسے روکنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ مگر آگے نوجوان شاہ پیرامس کھڑا نظر آتا ہے۔ بلند قامت وجیہہ اور غیر معمولی طور پر جوان— کچھ دیر کے لیے موت کی سی خاموشی طاری ہوجاتی ہے۔)

ایک شخص: (آگے بڑھ کر) عالی جاہ!......

(پیرامس ہنٹر اس کے منہ پر مارتا ہے اور وہ اپنا منہ پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔)

پیرامس: (بیلروفان کی طرف بڑھتے ہوئے) کیوں؟ وہ کون سا بھید ہے جو تجھے معلوم ہے اور دوسروں کو نہیں، وہ کیا بات تھی جو کہی جانی چاہیے تھی اور نہیں کہی گئی۔

(بیلروفان دو قدم بڑھ کر ایک سپاہی کی طرح سیدھا کھڑا ہوجاتا ہے۔)

بیلروفان: (مضبوط آواز میں) حضور ملک کی آزادی، اپنی عزت اور قوم کی ناموس پر آپ پنددرہ کی محبت کو ترجیح دے رہے ہیں۔

(معاً ایک سپاہی کا داخلہ)

سپاہی: (آداب بجا لاکر) جہاں پناہ! ایک پیام بر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

پیرامس: آنے دو۔

(وہی خوب رو جوان آکر آداب بجا لاتا ہے)

پیرامس: (خندہ پیشانی سے) اے حسین نوجوان! تو کون ہے؟ ہم کو شک ہے کہ ہم نے تجھے پہلے کبھی کہیں دیکھا ہے۔

نوجوان: میرے عالی جاہ! حضور نے بندہ کو ضرور دیکھا ہوگا۔ آپ کا یہ خادم......

(کھانس کر خاموش ہوجاتا ہے)

پیراس: (گردن اٹھا کر حاضرین سے) ہاں!......ہم......تنہائی چاہتے ہیں۔

(سب کی روانگی)

نوجوان: (ادب سے مسکرا کر) عالی جاہ! یہ غلام پندورہ کا نزدیکی رشتہ دار ہے۔ حضور رات کو جب ہمارے گاؤں میں آیا کرتے تھے تو ممکن ہے اس وقت حضور کی نظر بندہ پر پڑ گئی ہو۔

پیراس: (خوش ہو کر) تو تم پندورہ کے پاس سے آ رہے ہو۔ ہم سے اُس نے کبھی تمھارا ذکر بھی نہیں کیا۔ آؤ، آگے آؤ ہمارے عزیز نوجوان، ہمارے پاس بیٹھو، یہاں بیٹھو، جس طرح جی چاہے بیٹھو۔۔۔ اب بولو، کہو ہماری پندورہ نے کیا کہا ہے۔ وہی بات کہو، وہی الفاظ کہو جو پندورہ کے منہ سے نکلے تھے۔

نوجوان: (افسردگی سے) اے جہاں پناہ! میں کچھ اچھی خبر نہیں لایا۔ یہ بہت ہی منحوس خبر ہے۔

پیراس: (نوجوان کا ہاتھ تھام) ہمارے ہوش گم ہو رہے ہیں۔ ہم نہیں جانتے تم کیا کہنے والے ہو۔ مگر کہو۔۔۔ ہم سنیں گے۔۔۔

نوجوان: (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میرے آقا! اگر خادم کی جان بخشی ہو جائے تو......

پیراس: کہو اے نوجوان، تمھاری جان محفوظ ہے۔ تم پندورہ کے بھیجے ہوئے ہو۔

نوجوان: (رو کر) رات پندورہ دریائے نیل میں ڈوب گئی اس نے خودکشی کر لی۔

پیراس: (حیرت اور تاسف سے) خودکشی......؟ (الفاظ گلے میں اٹک جاتے ہیں۔)

(پیراس نوجوان کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور کوچ پر دھڑام سے گر پڑتا ہے اور اپنا منہ بازوؤں میں چھپا لیتا ہے۔ بہت دیر بعد سر اٹھاتا ہے اور سوجی ہوئی آنکھوں سے چلچلاتی ہوئی دھوپ میں نظریں گاڑ دیتا ہے۔)

پیراس: تو تم ہماری موت کا پیغام لے کر آئے تھے۔

نوجوان: آقا! پندورہ کی موت کا۔

پیراس: (لبوں پر خشک مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے) پندورہ کی موت!! اگر ہم یہ ماننے

سے انکار کردیں تو؟

نوجوان: (آگے بڑھ کر لپٹا ہوا کپڑا پیش کرتا ہے۔) یہ پندورہ کے ہاتھ کی تحریر ہے۔

پیرامس: اُف! یہ تو اسی کا خط ہے۔ ہم اس کی تحریر خوب اچھی طرح سے پہچانتے ہیں (پڑھ کر) آہ! یہ واقعی حقیقت ہے۔ لیکن کس قدر تلخ۔ مگر پندورہ اگر ہم کو جنگ میں شامل ہونے سے کچھ تامل تھا تو اس کی وجہ بزدلی نہیں تھی۔ بلکہ تیری محبت تھی۔ ہم محبت کی ایک ایسی بستی بسانا چاہتے تھے — لیکن اب سب کچھ فضول۔

(نوجوان سے) پیامبر!

نوجوان: میرے آقا!

پیرامس: ہم زیادہ عرصہ تک نہ جی سکیں گے۔ او پندورہ! اگر تجھے ہماری جنگ میں شمولیت جان سے بھی عزیز تھی۔ تو ہم کو ویسے ہی کہہ دینا تھا۔ تو نے بے شک کہا تھا لیکن ہم نہ جانتے تھے کہ تو اس قدر بے قرار ہے۔ ورنہ ہم اس وقت تجھے گول مول جواب نہ دیتے۔ او پندورہ! ہم تیرے پاس جلد پہنچیں گے۔ مگر تیری آخری آرزو پورا کرنے کی خاطر اور تیری روح کو تسکین پہنچانے کے لیے تلوار اٹھائیں گے اور دشمن کے چھکے چھڑا دیں گے۔ (جوش میں آکر) پیامبر!

نوجوان: میرے آقا!

پیرامس: ہماری تلوار۔

نوجوان: (تلوار آگے بڑھاتے ہوئے) یہ حاضر ہے۔

پیرامس تلوار نکال کر میان توڑ ڈالتا ہے۔ بھویں سکڑ جاتی ہیں۔ جسم کانپنے لگتا ہے۔ یکایک وہ چوبی ہتھوڑی لے کر سر دھانا نقارے کی طرف بڑھتا ہے۔)

پیرامس: (نقارہ پر چوٹ لگا کر) پندورہ! (پے در پے چوٹیں) پندورہ پندورہ!! پندورہ!!

(پیرامس بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ لوگ داخل ہوتے ہیں۔)

سب: کیا ہوا؟ کیا ہوا؟

نوجوان: (پرسکون لہجہ میں بے ہوش پیرامس پر نظریں گاڑتے ہوئے) صرف اعلانِ جنگ۔

(پھر نوجوان پیامبر تیر وکمان اٹھاتا ہے۔ اور نقارہ سے بندھی ہوئی ڈوری کا نشانہ باندھ کر تیر چھوڑ دیتا ہے۔ نقارہ ڈوری کی گرفت سے آزاد ہو کر، سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا جابجا ٹھوکریں کھاتا، ٹکراتا اور آواز پیدا کرتا ہوا نیچے جا گرتا ہے۔)

منظر سوم

دریائے نیل کا کنارہ

وقت.................شام

(شاہی لشکر ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ سپاہی ٹولیوں میں بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ جگہ بہ جگہ ریت میں نیزے گڑے ہوئے ہیں اور اُن کے اوپر ڈھالیں لٹک رہی ہیں۔ کئی جگہ کلہاڑے اور تیر ریت میں دھنسے پڑے ہیں۔ غروب ہونے والے سورج کی کرنیں دریائے نیل کے پانی پر رقص کر رہی ہیں۔ دریا میں ہچکولے لینے والے بیڑوں کے بادبانوں میں سے ہو کر گذرنے والی ہوا کی سرسراہٹ تیزی سے پرواز کرنے والی ابابیلوں کی چیخوں اور ملاحوں کے گیتوں نے عجب سماں باندھ رکھا ہے۔ شاہی خیمہ کے سامنے بھاری میز رکھی ہے۔ اس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے جا رہے ہیں۔ ایک طرف پیراس بیٹھا ہے۔ کہنی عصاء شاہی پر ٹیکے دور افق میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ پشت کی طرف بیلروفان کھڑا ہے۔)

پیراس: (افسردگی سے) لڑائی کا بگل پھونک دیا گیا۔ ہتھیاروں کی جھنکار پیدا ہوئی تیروں کی بارش ہوئی۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ پھر طبلِ ظفر پر چوٹ پڑی۔ واپسی کے فرمان جاری ہوئے اور اب اسکندریہ کے امرا پیشوائی کے لیے حاضر ہو رہے ہیں۔ کیوں بیلروفان؟

بیلروفان: ہاں میرے عزیز دوست۔

پیرامس: بیلروفان! کیا تم سمجھتے ہو کہ ہمیں فتح حاصل ہوئی ہے؟

بیلروفان: میرے سرتاج دوست یہ ایک شان دار فتح ہے۔

پیرامس: ہم نے ایسی شکست کبھی نہیں کھائی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جیت کر بھی ہار گئے ہیں اور جب تم اپنے عالی جاہ کا ماتم مناتے اسکندریہ واپس جاؤ گے تو تم بھی ہماری تائید کرو گے۔

بیلروفان: ایسی بات منہ سے مت نکالیے۔ آپ سے سب کی امیدیں وابستہ ہیں۔

پیرامس: نہیں بیلروفان تم کو ہماری ان امیدوں کا ذرا بھی خیال نہیں جو پندورہ کے ساتھ دریائے نیل کے گہرے پانی میں غرق ہو چکی ہیں۔ یہی دریا اب پندورہ کا مدفن بن چکا ہے۔ جس کی لہروں کے سازوں، اور پندورہ کے نغموں کے درمیان ہم کشتی کھیتے اور ان مسحور کن پریم بھرے گیتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے (رک کر) کبھی انہی لہروں پر قلو پطرہ اور انتونی تاروں بھری راتوں میں رنگ رلیاں منایا کرتے تھے — ان کی داستانِ محبت تو ہر ماہی گیر کی نوک زبان ہے۔ اب تک ملاح ان کی محبت کے گیت گایا کرتے ہیں......

بیلروفان: حضور امرا دعوت میں شریک ہونے کے لیے آ رہے ہیں۔

(امرا کا خاموشی سے داخل ہونا اور آداب بجالا کر بیٹھ جانا۔)

پیرامس: (کھڑا ہو کر) اس فتح کے لیے ہم دیوتاؤں کے مشکور ہیں۔

(بیٹھ جاتا ہے)

ایک دوسرا: (دوسرے کے کان بھی) عالی جاہ نے تقریر تو خوب کی۔

دوسرا: سب عالی جاہ کی اداسی کا سبب جانتے ہیں مگر کچھ نہیں کر سکتے۔

تیسرا: اس لڑکی نے بھی ملک و قوم کی خاطر جان دے دی۔ آفرین!

دوسرا: آج تو بہت ہی افسردہ ہیں۔

پہلا: دیکھو عالی جاہ کس قدر کھوئے ہوئے ہیں، سر جھکا ہوا ہے۔ نظر زمین پر، پیالہ ہاتھ میں۔ آنکھیں پھٹی پھٹی دکھائی دیتی ہیں۔

بیلر وفان: عالی جاہ! آپ پیتے نہیں؟ کیا حضور پندورہ کی یاد میں کھوئے ہوئے ہیں۔
پیراس: (چونک کر) پندورہ! آہ!!

(ایک سپاہی کا داخلہ)

سپاہی: جہاں پناہ! پیام بر حاضر خدمت ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔
بیلر وفان: لیجیے عالی جاہ! ہم پیام بر کو بھول ہی چکے تھے۔ اسے بھی دعوت میں شامل کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو کچھ تسکین ہو — (سپاہی سے) بلا لاؤ۔

(سپاہی کی روانگی)

(نوجوان اپنے گھوڑے کی لگا میں پکڑے ہوئے آتا ہے اور آداب بجا لاتا ہے۔)

پیراس: آؤ پیام بر! ہم تمھیں بھول ہی چکے تھے، آؤ شامل ہو جاؤ۔
نوجوان: (مؤدبانہ انداز سے) شکریہ میرے آقا! میں...... میں اس وقت......
(کھانستا ہے اور خاموش ہو جاتا ہے)
پیراس: بیلر وفان!
بیلر وفان: (امرا سے) آیئے صاحبان! عالی جاہ اس وقت تنہائی چاہتے ہیں۔
نوجوان: (آگے بڑھ کر) یہ پیام حضور کے نام ہے۔
پیراس: (بلند آواز سے) ''عالی جاہ! رات کو دریائے نیل پر پندورہ اپنی ناؤ میں اپنے کھویا کا انتظار کرے گی......''

آپ کی پندورہ!

(نوجوان جلدی سے سر پر سے ٹوپی اتار لیتا ہے۔ اور اس کے لانبے بال اس کے گلابی رخساروں پر اپنا سایہ ڈال لیتے ہیں۔)

پیراس: (نظر اٹھا کر) پیامبر! پیامبر! (چلا کر) نہیں پندورہ! پندورہ!!
پیراس جھپٹ کر پندورہ کو پکڑ لینا چاہتا ہے مگر وہ شریر چھوکری اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

یہ ڈرامہ پہلے افسانوی مجموعہ 'جگنو' میں شامل ہے۔

پامالِ محبت

احمد: میں اندر آ سکتا ہوں؟

زینت: (نظر اٹھا کر) آ سکتے ہیں؟— آپ تو اندر آ چکے ہیں۔

احمد: (دو قدم پیچھے ہٹ کر) کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟

زینت: (کام میں منہمک) آپ اندر داخل ہو کر پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

احمد: (جرأت سے کام لے کر) گویا میں اندر آ سکتا ہوں۔

زینت: (چپ)

(احمد ہاتھ میں ہیٹ لیے حسنِ یار سے مرعوب لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ لیکن زینت کتاب پر پنسل سے نشان لگانے میں مگن رہتی ہے۔)

احمد: (دانت نکال کر) غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ ہم کئی مرتبہ مل چکے ہیں۔

زینت: غالباً کیا مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔

احمد: ہم تین چار پکچریں بھی ساتھ دیکھ چکے ہیں۔

زینت: ہاں۔ہاں۔

احمد: ....اور ناچیز نے چند ناچیز تحفے بھی ناچیز...... میرا مطلب ہے...... آپ کی

خدمت میں......

زینت: بے شک ناچیز کے ناچیز تحفے بھی مل چکے ہیں لیکن ان کے تذکرے کا کیا محل ہے جب کہ میں ان کا شکریہ ادا کر چکی ہوں۔

احمد: جی جی...... یونہیں...... میں نے سوچا کہ شاید آپ بھول چکی ہوں گی۔ مدت کے بعد نیاز حاصل ہوا ہے آپ کا۔

زینت: مدت کیا۔ ابھی پرسوں ہی کی بات ہے کہ مسلسل تین منٹ تک چوراہے پر کھڑے ہو کر آپ سے بات چیت کرنی پڑی ہے۔

(پھر وہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔)

احمد: (قدرے سکوت کے بعد) آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔

زینت: ہاں لیکن شاعروں سے نہیں۔

احمد: خوب! خوب!!

زینت: (جماہی لے کر) میرے دادا جان شاعر تھے۔ گل تخلص کرتے تھے۔

احمد: (چونک کر) گل؟ گل! اچھا، گل!!

زینت: (ابرو پر بل ڈال کر) کیا آپ ان کے نام سے واقف ہیں؟

احمد: (سر تسلیم خم کر کے) نام کیا ہے، کلام سے بھی واقف ہوں...... واللہ کس قدر خوشی ہوئی......آپ کے پردادا گل۔ واہ وا!!......

زینت: (ٹوک کر) جی پردادا نہیں دادا تھے۔

احمد: یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے......خوب شاعر ہیں۔

زینت: تھے کہئے۔ وفات پا گئے ہیں اب تو۔

احمد: تھے کہہ لیجئے......وہ تو مکان و زمان کی قید میں آ ہی نہیں سکتے۔ خود والد بزرگوار نے ان کا کلام سنا ہے۔ لکھنؤ میں محفلیں جما کرتی تھیں ان کی......

زینت: توبہ کیجئے۔ انہوں نے تو عمر بھر لکھنؤ کا منہ تک نہیں دیکھا تھا۔ ارے صاحب آپ کو ضرور کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

احمد: نہیں صاحب! غلط فہمی کا سوال ہی کیا ہے۔ ارے وہی اپنے گل بھک پور والے ہی تو تھے نا؟

زینت: وہ بھک پور میں کبھی نہیں رہے تھے۔ وہ تو علی پور کے رہنے والے تھے۔ گل علی پوری......

احمد: جی علی پور...... ہوں' علی پور جو گنگا کے کنارے واقع ہے۔

زینت: گنگا کے کنارے نہیں دریائے چناب کے کنارے پر۔

احمد: چناب...... آہا چناب جو مشرقی پنجاب میں ہے۔

زینت: جی نہیں وہ مغربی پنجاب میں ہے......

احمد: اچھا اچھا خوب یاد دلایا۔ مغربی پنجاب جو ہند یونین......

زینت: (بگڑ کر) جی نہیں وہ پاکستان میں ہے اور معاف کیجئے۔ اب اور کچھ مت کہیے۔

(وقفہ)

احمد: (منہ بڑھا کر) جانِ من!

زینت: (بے خیالی میں) ہوں؟

احمد: (منہ اور آگے بڑھا کر) جانِ من!!

زینت: (متوجہ ہو کر) 'گلاب جامن' کیا؟

احمد: (گھبرا کر) گلاب جان نہیں' جانِ من!!

زینت: (گھوم کر اردگرد دیکھتے ہوئے) جانِ من کون؟

احمد: (کام بگڑتا دیکھ کر) میں معافی مانگنا چاہتا ہوں۔

زینت: (متعجب ہو کر) کس سے؟

احمد: (بہ صد انکسار) آپ سے۔

زینت: اوہ! اچھا' ہاں ہاں شوق سے۔

احمد: لیکن میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ معافی کس بات کی چاہتا ہوں۔

زینت: شوق سے۔

احمد: میں نے 'جانِ من' کہا۔

زینت: بے شک۔

احمد: تو میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔

زینت: معاف کیا — اگر اس سے آپ کا کام چل سکتا ہو تو —

(وقفہ)

احمد: (سینے پر ہاتھ رکھ کر) میرا دل دھڑک رہا ہے۔

زینت: دل تو سب کا دھڑکتا ہے۔

احمد: لیکن میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

زینت: کیوں کیا آپ دوڑ لگا کر آئے ہیں؟

احمد: (گھبرا کر) نہیں تو (گھبراہٹ میں قریب پڑی ہوئی تپائی کو دھکا لگتا ہے اور تصویر والا چوکھٹا فرش پر گر پڑتا ہے اور اس کا شیشہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔)

احمد: (جھک کر) اُف (شیشے کے ٹکڑے چننے لگتا ہے۔)

زینت: (اشارے سے) نہیں رہنے دیجئے آپ جو کرنا تھا کر چکے۔ ٹکڑے تو نوکر بھی چن سکتا ہے۔

احمد: آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔

زینت: ہاں تو آپ فرما رہے تھے کہ آپ کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ تعجب! آپ نے دوڑ بھی نہیں لگائی ہو گی کیوں کہ ڈیڑھ گھنٹے سے تو میں نے آپ کو ڈرائنگ روم میں منتظر رکھا۔

احمد: زینت صاحبہ! واقعی آپ بہت ذہین ہیں۔

زینت: (سر کو حرکت دے کر) شکریہ! اگرچہ مجھے اس حقیقت کا پہلے بھی علم تھا۔

زینت: (بہ لجاجت) سلسلۂ کلام منقطع کرتی ہوں۔

احمد: آپ کو اللہ پاک کی قسم۔

زینت: اچھا تو میں کیا کہہ رہی تھی۔

احمد: (خوش ہوکر) آپ کہہ رہی تھیں کہ میں سلسلۂ کلام منقطع کرتی ہوں...... نہ تو یہ......
آپ فرما رہی تھیں کہ میں نے تمہیں ڈیڑھ گھنٹے تک ڈرائنگ روم میں منتظر رکھا۔

زینت: ہاں تو اب اور کیا کہوں۔

احمد: (پرمعنی آغاز میں) ذرا غور فرمایئے کہ آخر آپ نے مجھے بلایا کیوں؟
(گردن بڑھا کر) اس میں ضرور کوئی راز ہے۔

زینت: میں نے بلایا تھا اس لیے کہ بہ صورت دیگر آپ قیامت تک ڈرائنگ روم میں میرا انتظار کرتے رہتے۔

احمد: (خوش ہوکر) خوب سمجھیں۔

زینت: (پریشان ہوکر) میں تو کچھ بھی نہیں سمجھی۔

احمد: (چہک کر) آپ یہی سمجھیں کہ اگر آپ مجھے نہ بلاتیں تو قیامت کیا میں رات بھر آپ کا انتظار کرسکتا تھا۔

زینت: خوب فرمایا۔

احمد: شکریہ۔

زینت: (صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) آپ پھر کھڑے ہوگئے ہیں، تشریف رکھیے نا!

احمد: شکریہ۔ (بیٹھ جاتا ہے)

(وقفہ)

احمد: (دفعتاً) مجھے غلام بنا لیجئے۔

زینت: (بھولے پن سے) غلام کیسے بنایا جاتا ہے؟

احمد: آپ محض ایک نگاہِ غلط انداز سے غلام بنا سکتی ہیں۔

زینت: اچھا تو غلام بن کر آپ کیا کریں گے؟

احمد: میں آپ کے جوتے صاف کروں گا۔

زینت: لیکن نوکر جو ہے۔

احمد: نہیں — مجھے اپنے قدموں میں جگہ دیجئے۔

زینت: لیکن کیا صوفہ آرام دہ نہیں ہے؟

احمد: آپ کے قدموں تلے بہشت ہے۔

زینت: (پاؤں سرکا کر) اچھا! (بڑے غور سے دیکھتی ہے) لیکن مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

احمد: آپ میری نظروں سے دیکھئے۔

زینت: لیکن کیا آپ میری نظروں سے نہیں دیکھ سکتے۔

احمد: نہیں — میں میں ہوں۔

زینت: تو پھر میں میں نہیں کیا؟

احمد: بے شک، معاف کیجئے۔

(وقفہ۔ اس دوران میں احمد ناخنوں سے صوفے کے بازو کو کھرچتا رہتا ہے یہاں تک کہ بخئے ادھڑ جاتے ہیں۔)

زینت: (پیشانی پر بل ڈال کر) آپ نے صوفے کے بخئے ادھیڑ ڈالے ہیں)

احمد: (چونک کر) اوہو۔ معاف کیجئے۔ میں میں......

زینت: (اشارے سے) نہیں اب اسے انگلیوں سے سینے کی کوشش مت کیجئے۔

(احمد کی لرزتی ہوئی انگلیاں رک جاتی ہیں۔)

زینت: (قدرے تامل کے بعد) آپ کرتے کیا ہیں؟

احمد: (متانت سے) میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔

زینت: ہائے اللہ! میرا مطلب ہے آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟

احمد: (زیر لب۔ کیسا طفلانہ سوال ہے) جی منہ سے کھاتا ہوں۔

زینت: اُف! میں پوچھتی ہوں کہ آپ منہ سے کھانے کے لیے کہاں سے لاتے ہیں؟

احمد: (سہم کر) یہ ٹیڑھا سوال ہے ذرا — چھوٹے موٹے کئی کام کرتا ہوں۔

زینت: مثلاً۔

احمد: ریڈیو کے لیے فیچر لکھتا ہوں۔

زینت: اور وہ فیچر نشر بھی ہوتے ہیں یا آپ لکھ لکھ کر گھر ہی میں جمع کیے جاتے ہیں۔

احمد: جی نشر بھی ہوتے ہیں۔

زینت: میں نے سنے نہیں کبھی......

احمد: سنا کیجیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(وقفہ)

احمد: (دانت دکھا کر) میں ایک گستاخی کرنا چاہتا ہوں۔

زینت: کیجیے۔

احمد: کیا آپ کو غلام سے محبت ہے۔

زینت: غلام کون؟

احمد: یعنی یہ فقیر۔

زینت: فقیر کہاں ہے؟

احمد: (سر تسلیم خم کر کے) یعنی بندہ — میں — کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟

زینت: نہیں۔

احمد: دنیا میں اور کسی سے محبت ہے؟

زینت: نہیں۔

احمد: امکان ہے؟

زینت: نہیں۔

احمد: احتمال؟

زینت: نہیں

(وقفہ۔ اس دوران میں احمد بے توجہی سے میز پر پڑے ہوئے چوبی بت کے سر کو گھماتا ہے۔ گردن کی لکڑی کمزور ہے اس لیے سر قدرے گھوم جاتا ہے)

زینت: ارے آپ نے گردن توڑ ڈالی...... کیسا حسین بت تھا۔ پر خیر چھوڑیئے کسی کاریگر

سے مرمت کروائی جائے گی (تامل کے بعد) کیوں جی مالی حالت تو بڑی قابل رحم ہے آپ کی۔

احمد: بے شک، لیکن آپ کو کیوں کر معلوم ہوا؟

زینت: ظاہر ہے۔

احمد: (مانگے کے خوش نما لباس پر نگاہ ڈالتے ہوئے) وہ کیسے؟

زینت: آپ کے اس عاشقانہ شغل سے۔

احمد: کھانے کو ملے تو پھر عشق کی ضرورت بھی کیا ہے؟

زینت: گویا روٹی کا غم بھلاتے ہیں عشق کر کے۔

احمد: دولت آنی جانی ہے...... دیکھئے اس وقت جیب میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔

زینت: تو پھر بس کا ٹکٹ لیے بغیر اب گھر کیسے پہنچیں گے آپ؟

احمد: پیدل......تو کیا اب میں گھر جا رہا ہوں؟

زینت: بے شک۔

(احمد سر پر پاؤں رکھ کر لوٹنے لگتا ہے۔ زینت نوکر کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دباتی ہے۔)

زینت: (جذباتی لہجے میں) اب کب تشریف لائیے گا؟

احمد: (ریشہ خطمی ہو کر) جب حکم ہو۔

زینت: (بہ منت) جب بھی جی چاہے۔ ایک بار تو ضرور تشریف لائیے۔

احمد: (حیرت اور مسرت سے آنکھیں جھپکتے ہوئے) کیوں نہیں! کیوں نہیں!!

زینت: (حنائی انگلی اٹھا کر مزید تاکید کرتے ہوئے) ضرور۔

احمد: (دونوں کان ہلا کر...... نہ تو بہ سر ہلا کر) ضرور۔ ضرور۔

زینت: مبلغ آٹھ روپے چار آنے جیب میں ڈال کر لائیے گا، آج آپ نے تصویر کا شیشہ توڑ ڈالا۔ اس کی قیمت بارہ آنے دو روپے۔ صوفے کے بخئے ادھیڑ ڈالے

اس کی مرمت کے لیے دو روپے بارہ آنے۔ لکڑی کے بت کا چہرہ دائیں سے بائیں طرف گھمایا اس کی مرمت کے لیے بار آنے دو روپے۔ یعنی کل مبلغ آٹھ روپے چار آنے (نوکر سے) باقر! احمد صاحب کو راستہ دکھاؤ۔

(باقر راستہ دکھاتا ہے اور احمد دیکھتا ہے۔)

☆☆☆

یہ ڈرامہ 'آجکل' اکتوبر 1948 میں شائع ہوا تھا۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے

پھانس

رفعت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی چہرے پر پوڈر کی ہلکی تہ جما رہی ہے معاً دروازہ بڑے دھماکے سے کھلتا ہے اور اس کا شوہر شوکت خاں جسے وہ بہ باطن شامت خاں سمجھتی ہے داخل ہوتا ہے۔

رفعت: (سینے پر ہاتھ رکھ کر دروازے کی جانب گھوم کر دیکھتے ہوئے) یا اللہ!

شوکت: (چیں بہ جبیں ہو کر) یا اللہ کیا؟

رفعت: (دھڑکتے ہوئے سینے کو تھامنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) کمرے میں داخل ہونے کا انداز تو خوب ہے آپ کا۔

شوکت: (منہ بنا کر لیکن سر تسلیم خم کرتے ہوئے) شکریہ۔ (قدرے سکوت)

شوکت: (بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے) ذرا منہ ملاحظہ فرمایئے۔

رفعت: کس کا — آپ کا یا اپنا؟

شوکت: جی اپنا۔

رفعت: کیوں — کیا ہے؟

شوکت: کُپا ہو رہا ہے پھول کر۔

رفعت: آپ کی بلا سے۔

شوکت: یہ بے رخی؟ نہ جانے کس قدر منت و سماجت کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے چھٹی لی اور پھر بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں اور......

رفعت: احسان ہے آپ کا— لیکن احسان ایک ہو تو اس کا ذکر بھی کیجیے لیکن یہاں تو میں آپ کے احسانوں تلے دبی پڑی ہوں......

شوکت: آخر ان اکھڑی باتوں سے تمھارا مقصد کیا ہے؟

رفعت: بس رہنے دیجیے اب۔

شوکت: (بھڑک کر) خدا کی قسم اپنا سر پھوڑ لوں گا کسی روز۔ آخر یہ بھی کوئی تک ہے۔

رفعت: (ناپسندیدہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھتی ہے لیکن چپ رہتی ہے۔)

شوکت: یہ بلی کی سی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب کیا دیکھ رہی ہو۔ غضب خدا کا صبح دو گھنٹے تک میرا مغز چاٹتی رہیں کہ شام کو پکچر دیکھنے چلیں گے اور جب میں کام کاج کا حرج کر کے آ پہنچا ہوں تو بی صاحبہ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں...... کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجھ سے کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

رفعت: (بگڑ کر) کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ اس قدر دھماکے سے دروازہ کھولنے میں کیا مصلحت تھی آپ کی؟

شوکت: لیجیے صاحب! کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا۔ سنو بی بی اگر جھگڑا کرنا لازمی ہو تو اس کے لیے بھی بہانہ ذرا معقول ہونا چاہیے۔

رفعت: (ہاتھ کو جنبش دے کر) بس رہنے دیجیے صاحب آج آپ کی زبان سے معقول اور نامعقول قسم کے الفاظ سن کر سخت تعجب ہو رہا ہے مجھے۔

شوکت: تم کہنا یہ چاہتی ہو کہ مجھے معقولیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے...... ایں؟

رفعت: (بے پروائی سے آئینے میں دیکھتے ہوئے) جو جی چاہے سو سمجھ لیجیے۔

شوکت: (بیوی کو گھورتے ہوئے) رفعت! کان دھر کے سن لو، تمھارا میرے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا گالی سے کم نہیں ہے۔

رفعت: (معاً آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تو آپ بھی کان دھر کے سن لیجئے کہ میں کوئی گائے یا بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس طرف چاہا ہانک دیا، میں پڑھی لکھی مہذب خاتون ہوں۔

شوکت: (طنز سے) پڑھائی لکھائی اور مہذب ہونے کے دعوے کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ ارے یہ چیزیں آپ کے انداز گفتگو ہی سے ظاہر ہو رہی ہیں۔

رفعت: چھ برس سے آپ ہی سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہے — ورنہ ہمارا خاندان تو......

شوکت: (دونوں ہاتھ اٹھا کر) بس بس خاندان کا قصہ مت چھیڑو میں بھر پایا...... تمھارے خاندان کے ایک ہی فرد سے پالا پڑا ہے...... میری توبہ!

رفعت: (سچ مچ خفا ہو کر) بات کا بتنگڑ بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے......

شوکت: اچھا جی؟ آپ کی فرماں برداری کرنا، آپ کی ناز برداری کی خاطر کام کاج چھوڑ کر بھاگے بھاگے گھر آنا، آپ کی گھر کیاں سہنا دوستوں سے زن مرید کا خطاب پانا یہ سب کچھ بات کا بتنگڑ بنانا ہے۔

رفعت: (دانت پیس کر) لیکن اس قدر دھاکے......

شوکت: میں بتاؤں؟ دروازہ پر ایک چپڑاسی بٹھایئے تاکہ جب میاں گھر پہنچیں تو اندر داخل ہونے سے پہلے ایک پرزہ کاغذ پر نام لکھ کر آپ کی خدمت میں روانہ کریں اور اس طرح اپنے ہی گھر میں داخل ہونے سے پہلے حضور کی اجازت کے طلب گار ہوں......

رفعت: (بھرائی ہوئی آواز میں) ہائے اللہ......

شوکت: (چڑ کر) کچھ تو پھوٹیے منہ سے۔

رفعت: (تقریباً روتے ہوئے بلند آواز میں) میں پوچھتی ہوں کہ اس طرح دروازہ توڑ کر اندر آنے کی ضرورت کیا تھی۔

شوکت: (اتنی ہی بلند آواز میں) میں پوچھتا ہوں کہ اگر میں نے دروازہ ذرا دھاکے سے

کھول بھی دیا تو کون سی قیامت آ گئی۔

رفعت: واہ! ہوا ہی کچھ نہیں میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اور آپ کی دانست میں کچھ ہوا ہی نہیں ــــ ابھی تک میرا سینہ لرزاں ہے' دم میں دم نہیں سماتا۔

شوکت: یہ بھی ایک ہی کہی۔ پٹھان باپ کی بیٹی ہو۔ شرم کرو، ذرا سے دھماکے سے کلیجہ منہ کو آ گیا، چھتیاں لرزنے لگیں' واہ! کیسی بنیا ٹائپ عورت سے واسطہ پڑا ہے۔

رفعت: یہ دیکھئے آپ پھر تہذیب کی حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ اگر میرے چھوٹے منہ سے جناب کی شان میں ایک آدھ کلمہ نکل گیا تو پھر مفت میں تلملائیں گے آپ۔

شوکت: تمھیں قرآن پاک کی قسم۔ اب ہمارا بہانا مت کرو۔ واہ رے خدا کی شان......تو سوچو ہے کھا کے بی بلی حج کو چلیں...... اگر کوئی کسر نہ رہ گئی ہو تو وہ بھی نکال لو۔ میری شان کی فکر مت کرو۔

رفعت: آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اب بھی بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں......آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو جائز بات پر بھی کوئی نہ ٹوکے۔

شوکت: اوہ! اچھا تو آپ کی ساری گفتگو میں کوئی جائز بات بھی تھی......

رفعت: (رومال سے آنکھوں کے گوشوں سے آنسو پونچھتے ہوئے) بڑھ بڑھ کے دعوے کرتے ہیں آپ' بس اتنی ہی بات کہہ دی کہ کمرے میں ذرا آہستہ سے داخل ہوا کریں تو جان کو آ گئے آپ۔

شوکت: یہ تو بہت ہی لچر مطالبہ ہے۔

رفعت: (پھر گرم ہو کر) مجھے لفظ لچر پر سخت اعتراض ہے۔

شوکت: (نرم پڑ کر) خیر میں لفظ لچر واپس لیتا ہوں' حقیقت یہ ہے کہ میں اس جھگڑے کو طول نہیں دینا چاہتا ــــ لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ تم پٹھان زادی ہو کر یوں چڑیاں کے مانند سہمی سہمی کیوں رہتی ہو شاید تم اس حقیقت سے قطعاً بے خبر ہو کہ پٹھانوں کی قوم دنیا کی بہادر ترین قوموں میں سے ہے۔ چنان چہ تمھیں کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تم پٹھان کی بیٹی ہو، پٹھان کی بیوی ہو...... اور ...... اور ......

پٹھان بچے کی ماں ہو......از میرا مطلب ہے...... ماں بنوگی......کبھی نہ کبھی۔
(فخر سے ٹائی کی گرہ کو درست کرتا ہے۔)

رفعت: (بے زار ہو کر) پٹھان پٹھان کی رٹ سے میرے کان پک گئے ہیں۔ آخر اس واقعے کا مٹھن ولی سے کیا تعلق ہے۔ اگر کوئی بغیر اطلاع کیے معا دھماکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں گھس پڑے تو عورت کیا مرد کا لحہ بھر کے لیے گھبرا جانا قدرتی امر ہے......

شوکت: (اپنا پلڑا ہلکا پڑتا دیکھ کر) یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔

رفعت: آپ بھی تو حجت کر رہے ہیں جو بات سراسر عقل پر مبنی ہے اسے آپ......

شوکت: میں حجت کر رہا ہوں؟

رفعت: حجت نہیں تو اور کیا ہے؟

شوکت: اسی برتے پر مہذب ہونے کا دعویٰ کرتی ہو......

رفعت: جی میں نے ہی دنیا بھر کی تہذیب اور اخلاق کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہائے کاش! میں پیدا ہوتے مر جاتی تو اچھا تھا۔ شادی ہوئے چھ برس گذر چکے ہیں لیکن ایک دن بھی سکھ کا نہیں دیکھا۔

شوکت: سکھ کا دن دیکھنا نصیب کیسے ہوتا۔ سارا دن کولھو میں جتی رہتی ہو۔

رفعت: کسی سمجھ دار عورت کے لیے تمھارے ہمراہ رہنا کولھو میں جتے رہنے سے کم نہیں ہے۔

شوکت: نہ جانے تمھیں اپنی بابت اس قدر غلط فہمی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟

رفعت: کیوں مجھ میں کمی کس شے کی ہے؟

شوکت: کمی ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے والدین ذرا صبر سے کام لیتے تو تم سے کہیں بہتر بیوی مل سکتی تھی مجھے۔

رفعت: (تنگ آکر) خیر اتنا مجھ سے بھی سن لیجئے کہ اگر میرے والدین اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یوں ہی کسی راہ گیر کو پکڑ کر مجھے بیاہ دیتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے

کسی صورت میں بھی کم نہ ہوتا۔

شوکت: (آنکھیں دکھا کر) چپ رہو...... منہ پھٹ کہیں کی۔

رفعت: بس اب گالیوں پر اتر آئے۔

شوکت: تمھاری ایسی حوریں بہت دیکھی ہیں میں نے......

رفعت: (دل میں بری طرح جل کر) بھینس کے آگے بین والی مثال صادق آتی ہے آپ پر۔ ورنہ میری سہیلیوں میں سے بیش تر کا خیال تھا کہ میں کیا بہ لحاظ صورت اور کیا بہ لحاظ سیرت ہزاروں میں ایک ہوں وہ کہتی تھیں کہ اس قدر حسین لڑکی کا شریف اور پاک باز رہنا تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہاں جو میری قدر ہو رہی ہے اس پر فرشتے بھی آنسو بہاتے ہوں گے۔ (ہلکی ہلکی سسکیاں بھرنے لگتی ہے)

شوکت: (دل پر جبر کر کے) یہ مفت کا رونا دھونا چھوڑو۔ میں تمھیں شریف اور پاک باز سمجھتا ہوں' لیکن تمھاری کھوپڑی میں ذرا بھیجا کم ہے۔

رفعت: (تکان زدہ ہو کر آرام کرسی پر دھم سے گر پڑتی ہے اور پھر مری ہوئی آواز میں) خدا کرے آپ کو اب بھی کوئی اپنی پسند کی بیوی مل جائے...... کاش وہ حوریں جن کے نام کا آپ کلمہ پڑھتے ہیں اب بھی آئیں اور آپ کو رجھالیں......

شوکت: طنز کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا' میں تو محض تمھاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں......

رفعت: غلط فہمی کیسی؟

شوکت: یہی کہ تم اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتی ہو حالاں کہ یہ قطعاً ایک حقیقت ہے کہ ہمیں بہت اچھے اچھے رشتے آئے تھے...... رشتے تو الگ رہے' ان لڑکیوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی جو میرے نام کا......

رفعت: (اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے) کلمہ پڑھتی تھیں۔ (چند لمحوں کے لیے وہ شوہر کی جانب چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے۔)

شوکت: کیا دیکھ رہی ہو؟

رفعت: یہی کہ آپ کیسے حسین ہیں۔ جس کو چے سے نکل جاتے ہوں گے کنواری لڑکیاں بال بکھرائے ننگے پاؤں آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہوں گی......

شوکت: (ہونٹ کاٹ کر) تم سچ مچ بڑی ڈھیٹ ہو......

رفعت: ڈھیٹ ہی تو ہوں ورنہ اس گھر سے کبھی کا منہ کالا کر گئی ہوتی۔

شوکت: اب میں تم سے کیا کہوں؟

رفعت: (قدرے ہمت سے) کہیے ضرور کہیے کہ میں موسم بہار کی وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا......

شوکت: یہ ایک حقیقت ہے رفعت! یہ ایک حقیقت ہے۔

رفعت: (کرسی سے اٹھ کر شوہر کے قریب جاتے ہوئے) حقیقت کیا ہے میں بھی تو سنوں......

شوکت: یہی کہ موسم بہار تو نہیں البتہ موسم برشگال کی ایک شام کا ذکر ہے کہ میں بائیسکوپ دیکھنے کے لیے گیا مجھ سے چند سیٹیں پرے ایک نہایت حسین لڑکی بیٹھی تھی وہ اس قدر حسین تھی کہ بس......

رفعت: (ماتھے پر بل ڈال کر روٹھے ہوئے انداز سے پرے چلی جاتی ہے)

شوکت: (ایک پر معنی آہ بھر کر) یہ آج سے آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میری مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں اور وہ لڑکی بھی بند کلی کے مانند تھی...... میں نے پہلے تو کاغذ کے دو چار ٹکڑے گول مول کر کے اس کی جانب پھینکے اور وہ جواب میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دی......

رفعت: (ناک سکوڑ کر) اونھ شرم بھی نہیں آتی۔

شوکت: (پر سوز آواز میں) شرم۔ بہت شرم کی ہے میں نے' لیکن آج اپنا جگر چیر کر تمھارے سامنے رکھ رہا ہوں۔

رفعت: (شانوں کو حرکت دے کر) مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

شوکت: دلچسپی کیسے ہو ظالم!......آہ کس محبت کے ساتھ اُس نے مجھے اپنے قریب بلایا تھا۔

جتنی دیر تک تماشا ہوتا رہا وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ دیے بیٹھی رہی...... اس کے بعد محبت ناموں کا سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ میری شادی تم سے ہوگئی اور وہ بے چاری......

رفعت: (گھوم کر بدلی ہوئی آواز میں) کیا کہا؟ آپ کاغذ کے ٹکڑے گول مول کر کے اس کی طرف پھینکتے رہے تھے......

شوکت: (سلسلۂ کلام منقطع ہو جانے پر بے زار سا ہو کر) ہاں

رفعت: اچھا۔ وہ لڑکی سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی لیکن نقاب الٹ دی تھی۔

شوکت: ہاں، لیکن......

رفعت: اور اس نے آپ کی جانب ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔

شوکت: کیا بکتی ہو؟

رفعت: شو ختم ہونے پر آپ ان لڑکیوں کے پیچھے ان کے ہوسٹل تک گئے تھے...... ہوسٹل کے چوکی دار کو رشوت دے کر آپ نے اس سے کہا تھا کہ یہ رقعہ اس لڑکی کو دو جو فلاں رنگ کا برقعہ پہنے ہوئے ہے۔

شوکت: ہاں...... اُف...... لیکن، لیکن —

رفعت: (تیزی سے) آپ نے کیسی کیسی چٹھیاں لکھیں، منتیں کیں، خوشامدیں کیں، لیکن اس لڑکی کی صورت دوبارہ دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔

(شوکت ایک قدم آگے بڑھ کر رک جاتا ہے اور رفعت کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگتا ہے اُدھر رفعت بھی شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے اور اس کے قریب پہنچ کر سر تسلیم خم کرتی ہے۔)

رفعت: (زیر لب مسکرا کر) بندی آداب عرض کرتی ہے۔

شوکت: (ہکا بکا) یعنی...... او...... کیا کیا معنی......؟

رفعت: مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی بندی آپ کی کنیز ہی تھی۔ خوب عاشق ہیں ہماری صورت تک نہیں پہچانتے، خیر میں نے تو آپ کو اچھی طرح دیکھا ہی نہیں تھا لیکن ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی مجھے اچھی طرح دیکھ نہیں پائے...... ورنہ چھ برس کی طویل مدت میں ضرور پہچان گئے ہوتے۔

شوکت: (دفعتاً رنگ بدل کر اور انگلی سے بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پرزور قہقہہ لگاتا ہے۔ تم تم...... ہاہاہا...... ہاہاہا......

(رفعت فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، کچھ وقفے کے بعد وہ کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں لیے واپس آتی ہے۔)

رفعت: (بری طرح برہم ہوکر) یہ رہے آپ کے خطوط...... میں بھی سوچا کرتی تھی کہ آخر یہ جو بات بات پر ترنتے ہیں اس کی کچھ وجہ تو ضرور ہوگی......

(شوکت کے قہقہے بند ہوجاتے ہیں— اپنے ہاتھ کے خطوط پہچان کر وہ، کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ برآمدے میں اس کے بے چینی سے ٹہلنے کی آواز آتی ہے۔ دو چار مرتبہ وہ تھوکتا ہے پھر زور سے ناک صاف کرتا ہے۔ اور بالآخر رومال سے منہ پونچھتا ہوا دروازے کے قریب آکر رک جاتا ہے۔)

شوکت: (قطعاً غیر پٹھانی آواز میں ممیا کر) میں نے کہا دیر ہو رہی ہے شو شروع ہوجائے گا......

رفعت: (جلدی جلدی دوبارہ میک اپ کرتے ہوئے) جی میں آئی...... چلتے چلتے رفعت نے دیکھا کہ بالوں کی ایک لٹ اس کے رخسار پر پریشان ہو رہی ہے وہ اس کو پاکیزگی ذوق کی علامت نہیں سمجھتی تھی، لیکن اس وقت اس نے بالوں کی لٹ کو جوں کا توں رہنے دیا۔)

☆☆☆

یہ ڈراما سالنامہ 'آجکل' 15 راگست 1949 میں شائع ہوا تھا۔ کسی بھی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

سکّہ زن

کردار:

1۔ کریم

2۔ بیگم

3۔ شبیر

4۔ حامد

5۔ اسرار احمد۔ ہیڈ کانسٹبل

کریم: (گھبرائی ہوئی آواز میں) بیگم! بیگم!!...... اوہ تم یہاں ہو۔ میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ہماری پیاری بیگم باورچی خانے میں بیٹھی ہمارے لیے کوئی لذیذ شے......

بیگم: آپ ہانپ کیوں رہے ہیں۔ خیریت تو ہے نا؟

کریم: تم جانتی ہو مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔ بس تم دم بھر کو آنکھوں سے اوجھل ہوئیں اور میری نبض نے سکندری کھائی۔

بیگم: بس اب رہنے دیجیے۔ اس محبت کے قصے کو...... بڑے قدر دان ہیں آپ...... اتنی

بھی توفیق نہیں کہ ایک نوکر ہی رکھ دیں۔

کریم: جان من! تم سے گھر کا حال چھپا تو ہے نہیں......

بیگم: وہی کہتی ہوں نا! اب خیر سے آپ کی عمر بھی ہے پچپنس برس کی اور تیر یہ مارا ہے کہ بہ مشکل کالج کے لکچرار مقرر ہوئے ہیں۔ اور ابھی پہلی تنخواہ تک نہیں ملی۔

کریم: بیگم غضب کرتی ہو مہینہ پورا ہو تو تنخواہ ملے نا!

بیگم: مل بھی گئی تو کون سا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جائے گا......

کریم: بیگم! دیکھو اس قدر ظالم نہ بنو۔ سوچو تو میں نے ایک معمولی اسکول ماسٹر سے ترقی کر کے یہ ملازمت حاصل کر لی۔ کیا یہ کچھ کم ہے۔

بیگم: آپ کے لیے تو یہی بہت کچھ ہے۔ ہائے میری شادی تو کسی آئی سی ایس کے ساتھ ہو سکتی تھی......

کریم: آئی سی ایس کیوں کہتی ہو تمھیں تو کسی بادشاہ کی بیگم بننا چاہیے تھا۔

بیگم: اور نہیں تو کیا...... آخر مجھ میں کمی کس بات کی تھی۔ ہمارا گھرانا بہت بڑا گھرانا سمجھا جاتا تھا اور پھر ہمارے ہاں لڑکیوں تک کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی ہم جسے چاہتے پسند کر لیتے۔ مجھ سے تو شنو ہی اچھی رہی......

کریم: اب پھر لگیں رعب جمانے...... تو کس نے کہا تھا کہ مجھ سے شادی کرو......

بیگم: آپ ہی تو کہنیوں تک ہاتھ جوڑ جوڑ کر میری منتیں کیا کرتے تھے......

کریم: اخاہ اور تم نے جو خالہ کی زبانی والدین کو دھمکی دی تھی اگر میری شادی ''ان'' کے ساتھ نہ ہوئی تو کچھ کھا کے مر جاؤں گی...... اب شرماتی کیوں ہو؟

بیگم: ہر آن میری خوشامد کیا کرتے تھے آ گئی بھرّے میں......

کریم: اچھا جناب میں نے آپ کی خوشامد کب کی تھی؟......

بیگم: لیجئے اور سنئے یاد نہیں کچھ بھی...... جب میں چھوٹی سی تھی اس وقت بھی آپ مجھ سے ایسی ویسی باتیں کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔

کریم: میں بھی تو چھوٹا سا تھا نا سمجھ!

بیگم: اور جب وہ پیڑ پر چڑھ کر میرے لیے توڑ توڑ کر پھینکا کرتے تھے..... گٹھلے اور کبھی بھی چھل جاتی تھیں.....

کریم: اور تم مزے سے نیچے کھڑی کھڑی جامنیں کھایا کرتی تھیں۔ چالاک کہیں کی..... میں سیدھا سادھا.....اور تم تھیں ایک گھاگ.....

بیگم: ہاں یہ بات تو میں بھی مانتی ہوں کہ میں آپ کی بہ نسبت زیادہ عقل مند تھی اور اب بھی ہوں.....

کریم: اور میں منگنی کے وقت دسویں پاس اور تم ایف اے لیکن اب میں ایم اے ہوں اور کالج میں لکچرار.....

بیگم: خیر جی اس بات کا پتہ تو تب چلتا جب آپ کی شادی کسی بے وقوف عورت سے ہو جاتی.....

کریم: ہاں صاحب اگر تم نہ ہوتیں تو مجھے کوئی اچک لے جاتے.....

بیگم: ہے تو یہی بات.....اس دن کی کہئے وہ جب ہم میلہ دیکھنے کے لیے گئے تھے.....

کریم: (کھسیانی آواز میں) بس چھوڑو جی .....تم میرے ہتھکنڈوں سے واقف نہیں تم نے تو مجھے بدھو سمجھ رکھا ہے.....اب کہو آج کیا کھلاؤ گی۔ آج میں کالج نہیں جاؤں گا۔ ایسی بارش میں وہاں ایک لڑکا بھی نہیں آئے گا دیکھو تو بادل کیسے زور سے کڑک رہا ہے.....اور ہاں رضا کہاں ہے.....اس قدر بارش میں۔

بیگم: آپ گھبراتے کیوں ہیں وہ کوئی دودھ پیتا بچہ تو ہے نہیں خیر سے تیرہ برس کا ہو چکا ہے۔ اور پھر آپ کی طرح نہیں کہ ذرا بارش ہوئی اور گھر میں دبک کر بیٹھ رہے۔

کریم: دیکھو بیگم اب میں.....

بیگم: حقیقت یہ ہے کہ رضا مجھ پر گیا ہے اور دیکھئے گا بڑا ہوگا تو کیا کیا کارنامے کر دکھائے گا.....

کریم: (بہ منت) صاحب آپ جیتے ہم ہارے.....اب خدا کے لیے کچھ کھانے کو دیجیے۔

بیگم: اچھا تو میں پڑوس سے آگ لے آؤں آپ یہیں باورچی خانے میں ٹھہریے.....

پیالے میں انڈے پھینٹے رکھے ہیں اور ادھر پتیلی میں دودھ پڑا ہے...... ذرا خیال رکھیے گا۔

کریم: بھئی جلدی سے واپس چلی آنا...... تم بھی ہو پرلے درجے کی باتونی۔

بیگم: ابھی آئی...... دروازہ بند کر لیجئے بوچھاڑ نہ پڑے۔

(وقفے کے بعد دروازے میں دستک)

کریم: کون ہے؟

آواز: کیا میں اندر آسکتا ہوں۔

کریم: آپ کون ہیں؟

آواز: میں مسافر ہوں۔ بارش میں گھر گیا ہوں۔ گھڑی کی گھڑی پناہ لینا چاہتا ہوں۔ کیا اندر آنے کی اجازت ہے۔

کریم: جی نہیں...... یہ باورچی خانہ ہے اس میں اتنی گنجائش نہیں اور میں اس باورچی خانے سے جا بھی نہیں سکتا۔

آواز: بندہ پرور کیا غضب کرتے ہیں۔ بارش تو دیکھئے اور پھر تیز و تند سرد ہوا...... کچھ تو رحم کھائیے بس گھڑی کی گھڑی...... ایسے موقعوں پر تو لوگ کتوں اور بلیوں کو بھی پناہ دے دیتے ہیں......

کریم: اجی حضرت میں تو اپنی اکلوتی بلی کو بھی باہر دھکیلنے والا ہوں...... لیکن خیر چلے آیئے...... لیجئے دروازہ کھول دیا میں نے۔

اجنبی: شکریہ بہت بہت شکریہ...... میرا نام شبیر حسین ہے۔ میں ٹھٹھیرا ہوں۔ میرے اس تھیلے میں چند ڈبے اور برتن ہیں۔ اگر ان پر زنگ لگ گیا تو یہ بکیں گے نہیں۔

کریم: آپ تھیلا ادھر کونے میں رکھ دیجیے۔ لیجیے یہ کرسی تشریف رکھیے۔

شبیر: شکریہ۔ میں اس وقت کسی بوڑھی خچر کی مانند تھکا ہوا ہوں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ مجھے اس قدر بھوک لگ رہی ہے کہ میں اس وقت چار آدمیوں کا کھانا کھا سکتا ہوں۔

کریم: آہ برادر یہاں تو اس وقت ایک کے کھانے تک کے لیے بھی نہیں ہے۔

شبیر: لیجیے ستم بالائے ستم...... ہم لوگ بھائی بھائی ہیں۔ لیکن خیر اس وقت یہی غنیمت ہے کہ اور کچھ نہیں تو آپ کو کم از کم مجھ سے ہمدردی تو ہے نا......

کریم: ہمارے ہاں صبح سے آگ ہی نہیں جلی۔ بیگم آگے لینے گئی ہیں۔ لکڑیاں گیلی ہیں ماچس ندارد اور پھر جو کچھ پکے گا وہ بھی اس قدر کم ہے کہ......

شبیر: خیر خیر کوئی مضائقہ نہیں...... یہ ذرا میں بیڑی پی لوں۔ کہیے۔ آپ کو اس پر کچھ اعتراض تو نہیں۔

کریم: شوق فرمایئے صاحب! مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔

شبیر: آہ ہا...... ہاں تو وہ آپ کی بلی کدھر ہے؟

کریم: بلی؟ بلی تو دو چار چوہے کھا کر بارش میں چہل قدمی کر رہی ہے۔

شبیر: میرے خیال میں وہ شکم سیر بلی مجھ سے بہتر ہے۔ اگرچہ میں آپ کے باورچی خانے میں بارش سے محفوظ، کرسی پر بیٹھا ہوں۔

کریم: صاحب اس بات کا فیصلہ کرنا تو بہت مشکل ہے کہ آپ دونوں میں سے کون بہتر ہے۔

شبیر: جناب پہلے میرا خیال تھا کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی ہم ہندوستانی مہمان نوازی میں کسی سے کم نہیں بلکہ دوسروں سے چار قدم بڑھ کر ہی ہیں۔ لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے اپنی رائے میں کچھ ترمیم کرنی چاہیے۔

کریم: بھئی شاید نعمت خانے میں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ پڑا ہو لیکن اگر میری بیگم کو معلوم ہوگیا تو ایک مصیبت ہی آجائے گی......

شبیر: تو کیا آپ کی بیوی کسی کنگال خاندان کی عورت ہے......

کریم: زبان کو لگام دیجیے حضرت۔ وہ تو ایک بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن جب سے بے چاری کی شادی مجھ سے ہوئی ہے مجبوراً......

شبیر: تو یوں کہیے کہ آپ ہی نکھٹو ہیں۔

کریم: جی نہیں لکھنؤ نہیں ہوں...... کالج میں لکچرار ہوں...... صرف ذرا۔

شبیر: آپ شاید اپنی بیوی سے ڈرتے بہت ہیں۔

کریم: نہیں صاحب ڈرنے ورنے کی کوئی بات نہیں۔ دراصل معاملہ کچھ بے ڈھب سا ہے...... کیوں جناب آپ بھی تو شادی شدہ ہوں گے آخر......

شبیر: جی نہیں میں تو ابھی کنوارا ہی ہوں......

کریم: خدا کا ہزار ہزار شکر کیجئے۔

شبیر: تو کیا بیوی ایسی ہی کوئی بلا ہے کہ......

کریم: بس کچھ نہ پوچھئے۔

شبیر: آپ کی بیگم کس وقت آئیں گی۔ کہیں مجھے دھکے دے کر باہر نہ نکال دیں۔

کریم: جی نہیں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ وہ بہت آزاد خیال ہیں۔ پردے کی پابند بھی نہیں اور پھر وہ سب مردوں کو...... سوائے میرے...... بے وقوف سمجھتی ہیں......

شبیر: اچھا تو وہ کب تک آجائیں گی۔

کریم: وہ بڑی باتونی ہیں مجھے امید نہیں کہ جلد واپس لوٹ آئیں۔

شبیر: اگر ہم ان کے آنے سے پہلے پہلے بازار سے کچھ لے آئیں تو اپنا مزے میں کھائیں...... یہ دیکھیے روپیہ ہے میرے پاس...... (روپیہ انگلیوں پر نچا کر بجاتا ہے)

کریم: ارے صاحب یہ روپیہ بڑا چمک دار ہے۔

شبیر: ابھی چمک دار کیوں نہ ہو۔ میں نے پچھلے ہفتے ہی تو اس قسم کے اسی روپے بنائے تھے۔

کریم: (حیرت ناک لہجے میں) آپ نے خود...... اسّی روپے بنائے تھے اپنے ہاتھ سے...... اور اگر کہیں آپ گرفتار ہو جائیں تو؟

شبیر: جی نہیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں۔ میں اسے بنانے کا صحیح نسخہ جانتا ہوں اس لیے اس روپے پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

کریم: ذرا دکھایئے تو...... (میز پر پٹخ کر بجاتا ہے)

شبیر: ارے صاحب خوب ٹھونک بجا کر دیکھیے۔ اگر پھر بھی یقین نہ آئے تو کسی دکان دار کو دکھایئے۔

کریم: بہتر میں جاتا ہوں۔ اور آپ کے کھانے کے لیے کچھ لے آتا ہوں۔ بس ایک منٹ میں آیا میں...... اوہ...... چپ...... بیگم آ رہی ہیں۔

بیگم: کہیے آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟

کریم: نہیں تو...... یہ صاحب...... بے چارے......

بیگم: بے چارے......؟ اچھا ان صاحب کو کہہ رہے ہیں آپ...... بے چارے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔

شبیر: آداب بجالاتا ہوں بانو!...... میں ٹھٹھیرا ہوں......

بیگم: اچھا تو ٹھٹھیرے صاحب ہمیں اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

شبیر: جی میں اس خیال سے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں تو بارش سے بچنے کے لیے اندر چلا آیا...... (بادل کی گرج سنائی دیتی ہے)

بیگم: ایسے موقع پر جب کہ ہر طرف طوفان سا بپا ہے بھلے آدمی گلی کوچوں میں مارے مارے نہیں پھرتے......

کریم: ہاں بیگم تم ٹھیک کہتی ہو......

بیگم: اچھا تو جناب کدھر دھاوا بولنے والے ہیں۔

کریم: میں ذرا محلے کی دکان سے...... ان صاحب کے لیے کچھ کھانے کے لیے......

بیگم: اچھا تو اب آپ لکچرار سے ترقی کر کے ٹھٹھیرے کے نوکر بن گئے ہیں۔

کریم: بیگم آپ یوں ہی بگڑ رہی ہیں...... انھوں نے مجھے ایک روپیہ دیا تھا......

بیگم: واقعی؟ اوہو تو ٹھٹھیرے صاحب تو بڑے فیاض ہیں۔

شبیر: بانو! اصل بات یہ ہے کہ مجھے بہت سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کی جیب پر بار پڑے۔ اس لیے...... اور بانو یہ درست ہے کہ

میں پیشے کے لحاظ سے کٹھیرا لیکن میں یہ کام خود نہیں کرتا بلکہ میرے نوکر ہی یہ سب کام کرتے ہیں...... میں ایک سفید پوش بھلا آدمی ہوں......

کریم: اور بیگم یہ خود تو صرف چند خاص خاص کام ہی کرتے ہیں۔

بیگم: ......خیر میں چائے بنائے دیتی ہوں...... ذرا کوئلے دھک جائیں......

شبیر: (گنگناتا ہے) ڈولی میں ہو جا سوار سکھی ری ڈولی پہ ہو جا سوار۔

کریم: لیکن بھائی صاحب مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ آپ اس کٹھیرے کے پیشے کو ترک کیوں نہیں کر دیتے آپ تو کروڑ پتی بن سکتے ہیں۔

شبیر: ناممکن...... ہر لحہ پولس کا خوف...... پکڑے جانے کی دہشت......

بیگم: تو آخر یہ پولس کو چکمے دینے والا کون سا کام شروع کر رکھا ہے۔ آپ نے......

شبیر: جی میرا مطلب ہے کہ اگر میں زیادہ روپے بناؤں تو مجھے پولیس کو چکمہ دینا ہی پڑے۔

بیگم: لیکن روپے کا پولیس سے کیا تعلق؟

کریم: اوہو بیگم تم اصل بات ابھی تک نہیں سمجھ سکیں...... یہ دیکھو یہ روپیہ انھیں کا بنایا ہوا ہے......

بیگم: (دہشت زدہ آواز) ہائے میرے اللہ!!

کریم: لو حامد بیٹا بھی آ گئے......لو بیٹا یہ روپیہ لو......اور نکڑ پر سے شامی کباب اور نان لے آؤ......

حامد: ابا جی...... کتنے شامی لاؤں۔

کریم: دو دو پیسے فی کباب کے حساب سے آٹھ آنے کے......سولہ لے آؤ اور بھئی چار یا پانچ آنے کے نان باقی پیسے واپس...... جاؤ بیٹا۔

بیگم: روکو...... ہائے بھاگ گیا...... آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے حرام کے روپے سے کھانے کی چیزیں منگوا رہے ہیں۔

شبیر: بانو! حرام اور حلال کا جھگڑا تو عرصہ ہوا میں نے چکا دیا تھا۔

بیگم: ہائے یہ صبح ہی صبح نیا بکھیڑا شروع ہو گیا، اُف پانی اُبل گیا......(وقفہ — بارش کی آواز اور بجلی کی کڑک)

بیگم: حامد بے چارے کو بارش میں بھیج دیا۔

کریم: ابھی تو شیخی بگھار رہی تھیں کہ میرا بیٹا بڑا بہادر ہے اور اب اتنے میں پریشان ہو گئیں...... چار۔ قدم پر تو دکان ہے اور پھر وہ تو پہلے ہی سے بھیگا ہوا تھا......لو وہ چلا آتا ہے لے آئے بیٹا۔

حامد: جی ہاں...... یہ لیجئے ......اور یہ پیسے۔

کریم: کیوں بیٹا۔ دکان درانے روپیہ دیکھ کر کچھ کہا تو نہیں؟

حامد: جی نہیں۔

کریم: اس نے روپیہ بجا کر دیکھا تھا۔

حامد: جی ہاں۔

شبیر: اجی میں نہ کہتا تھا کہ اپنے فن کا استاد ہوں۔

بیگم: شبیرے صاحب آپ کو ایسے حرام کے پیسے پر شرم آنی چاہیے۔ لیکن آپ ہیں کہ اس بات پر فخر کر رہے ہیں۔

شبیر: بانو آپ نے دوسری مرتبہ حلال اور حرام کا قصہ چھیڑا ہے لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ میں نے بڑے عرصے سے یہ جھگڑا ہی چکا دیا ہے۔

بیگم: بیٹا حامد تم چائے پیو گے نا۔

حامد: امی مجھے بھوک نہیں ہے۔

کریم: ہاں صاحب فرمایئے آپ نے حلال اور حرام کا جھگڑا کیسے چکا دیا ہے۔

شبیر: (کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے) سینئے آپ کا سوال یہ ہے کہ خود روپیہ گھڑنا حرام ہے یا حلال۔

حامد: حرام تو ہے......

شبیر: ٹھیرو بیٹا تم یہ بات نہیں سمجھے......

حامد: سمجھا کیوں نہیں آپ مجھے بالکل بچہ ہی نہ سمجھیے۔

شبیر: برخوردار جو بات میں کہہ رہا ہوں اسے تو تمھارے ابا بھی نہیں سمجھے۔

کریم: خبردار صاحب آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں......

شبیر: میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں ایم سوری......وری سوری۔

کریم: خیر کچھ مضائقہ نہیں......فرمایئے۔

شبیر: فرض کیا آپ ایک کتاب لکھ کر شائع کرتے ہیں۔

کریم: جی۔

شبیر: اب بتایئے کہ اس کے بیچنے سے جو منافع آپ کو ملے گا وہ حلال یا حرام۔

کریم: حلال صاحب! سولہ آنے حلال!

شبیر: اچھا اب آپ کو معلوم ہے کہ سرکار کو چاندی سات آنے فی تولہ کے حساب سے ملتی ہے۔

کریم: بے شک!

شبیر: اچھا اب ایک تولہ وزن کے اس روپے میں فرض کیجئے تین آنے کی چاندی صرف ہوتی ہو تو باقی سرکار کا منافع کچھیے۔

کریم: کیا یہ بات درست ہے......

شبیر: بندہ پرور، اب یہ بتایئے پانچ چھ آنے لاگت والے روپے کے سولہ آنے وصول کرنا حرام ہے یا حلال۔

کریم: حرام صاحب قطعی حرام......

شبیر: جی نہیں آپ غلطی پر ہیں......سرکار اس قدر منافع لینے میں حق بجانب ہے۔ کیوں کہ روپیہ بنانے کے دیگر اخراجات اور پھر سرکار کی خدمت کا حق بھی تو ملنا چاہیے۔ آپ......

کریم: آپ بات تو انصاف کی کہتے ہیں۔

شبیر: بس تو اگر وہی تجارت میں کروں تو اس میں عیب ہی کیا ہے۔

حامد: لیکن آپ سرکار نہیں۔

کریم: جی...... اور سرکار کے سوائے کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ روپے بنائے۔

شبیر: میرا خیال ہے کہ میں نے ہر بات کی تشریح کر دی ہے۔

کریم: بے شک آپ نے اپنے خیال کے مطابق تشریح کی ضرور ہے لیکن ہے یہ سب کچھ غلط۔

بیگم: دیکھئے ٹھہرے صاحب ہمارے میاں اتنے احمق نہیں ہیں جتنے آپ کو دکھائی دیتے ہیں۔

شبیر: بانو یہ بات سن کر میرے ٹوٹے ہوئے دل کی کچھ ڈھارس بندھ گئی ہے۔

حامد: حلال حلال ہے۔ حرام حرام۔

شبیر: دیکھو بیٹا! جاؤ تم کھیلو بڑوں کی باتوں میں دخل نہیں دیا کرتے۔

حامد: لیجئے صاحب میں جاتا ہوں ایسی باتیں سننے کو تو میرا دل ہی نہیں چاہتا۔

بیگم: جاؤ بیٹا! لیکن بارش میں مت گھومنا...... اُف بارش تھمنے ہی میں نہیں آتی۔

کریم: آیئے حضرت چائے تیار ہے۔ میز کے قریب کرسی کھسکا لیجیے...... خیر صاحب اپنے اپنے ضمیر کی بات ہے۔ آپ مزے کرتے ہیں۔ جتنا روپیہ چاہیں بنائیں۔

شبیر: میں ضرورت سے زیادہ روپیہ ہرگز نہیں بناتا۔

کریم: آپ ایک دن میں کس قدر روپے بنا سکتے ہیں...... لیجیے شکر کے کتنے چمچے۔

شبیر: ابھی میں بہت سا روپیہ بنا سکتا ہوں...... یہ شامی کباب کچھ ایسے بدمزہ تو نہیں۔

کریم: میرے خیال میں آپ کو اس کام کے لیے سامان حاصل کرنے میں سخت مشکل پیش آتی ہوگی۔

شبیر: جی بالکل نہیں...... میں ہر جگہ یہ سامان حاصل کر سکتا ہوں اس میں عام چیزیں ہی تو ڈالی جاتی ہیں۔

کریم: عام چیزیں؟

شبیر: جی بالکل عام چیزیں۔

کریم: تو پھر اور لوگ یہ کام شروع کیوں نہیں کر دیتے۔

شبیر: بس وہ لوگ آپ کی طرح سیدھے راستے سے بھٹک کر حلال اور حرام کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ اور اس وقت تک صراطِ مستقیم پر نہیں آتے جب تک کہ کوئی سمجھ دار شخص خضرِ راہ بن کر ان کی رہنمائی نہ کرے۔

بیگم: یعنی آپ کی قسم کا خضرِ راہ......

کریم: بھلا یہ کہیے کہ آپ یہ راز یعنی سکہ بنانے کی ترکیب ظاہر کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

شبیر: شاید اسے میں ظاہر کر دوں یا شاید نہ کروں۔ اس کا انحصار ہے چند باتوں پر۔

کریم: مثلاً

شبیر: مثلاً یہی کہ کیسے شخص پر یہ راز ظاہر کرنا ہوگا اور اس کے معاوضے میں مجھے کیا ملے گا؟

کریم: فرض کیا میں ہی یہ راز معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

شبیر: اب کھلے آپ...... خیر صاحب اگر آپ چاہیں تو آپ جیسے مہربان میزبان......

کریم: (جلدی سے) آپ اس کا لیں گے کیا؟

شبیر: جی وہ توس اور مکھن ادھر بڑھا دیجیے۔

کریم: لیجیے۔ لیکن میرا مطلب تھا کہ آپ اس راز کے لیے کیا لیں گے۔

شبیر: میں نے آپ کی بات سن لی تھی۔ لیکن اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ جس صورت میں آپ کے منہ میں نوالہ ٹھنسا ہوا تھا۔ آپ بولے ہی چلے جاتے تھے۔ ایسی بات کھانے کے آداب کے قدرے خلاف ہے۔ اور خود میرا منہ اس قدر ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا کہ اگر میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا بھی تو کامیاب نہ ہوتا...... اچھا تو آپ ترکیب کی قیمت معلوم کرنا چاہتے ہیں؟

کریم: جی۔

شبیر: ہوں...... اچھا...... بھلا آپ کیا دینا چاہتے ہیں۔

کریم: بس جس قدر مناسب سمجھوں گا دے دوں گا۔

شبیر: یعنی مطلب یہ ہے کہ بیگم کے حکم کے بغیر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

کریم: واہ میں اپنے گھر کا مالک ہوں۔

شبیر: اجی رہنے دیجیے...... گھر کی مالکہ تو بانو ہیں......

بیگم: دیکھئے حضرت آپ حد سے زیادہ بڑھے جا رہے ہیں۔ آخر آپ کا ان باتوں سے مطلب کیا ہے ہائے دوسروں کے ہاں صبح کے وقت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور یہاں......

کریم: سچ تو یہ ہے کہ میں بلا کسی معاوضے کے آپ سے وہ راز دریافت کر سکتا ہوں۔

شبیر: واہ رے میرے مٹی کے شیر...... یہ طنطنہ......

کریم: حضرت میں پولیس کو اس بات کی رپورٹ کر سکتا ہوں۔

شبیر: اخا...... تو حضرت اب اس بات پر تلے ہوئے ہیں۔

کریم: میرا خیال ہے کہ یہ میرا فرض بھی ہے۔

شبیر: اس طرح آپ کے ہاتھ کیا آئے گا؟

کریم: اس سے میرے ضمیر کو سکون حاصل ہو جائے گا۔

شبیر: اچھا تو آپ کے ضمیر کو پہلے ہی سے سکون کی ضرورت ہے......

بیگم: (چمک کر) سکون کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن وہ تمھیں جیل بھجوا سکتے ہیں۔

شبیر: آپ اس بات کا کیا ثبوت پیش کریں گے۔

کریم: شاید آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ حضور کے تھیلے میں سکے بنانے کا کل سامان موجود ہے۔

شبیر: آپ تو کوئی پرانے گھاگ معلوم ہوتے ہیں آہ خدایا!

کریم: کیوں کیسی رہی!

شبیر: آپ درست فرماتے ہیں...... تھیلا کدھر ہے...... ہاں وہ رہا کونے میں...... یہ دیکھئے اس میں لکڑی کا یہ ڈبہ...... لیجئے دور ہی سے ملاحظہ فرمایئے۔ بس اس میں

ثبوت بند ہے...... لیکن میں ابھی اس کا قصہ پاک کیے دیتا ہوں...... انگیٹھی کے دہکتے ہوئے کوئلوں میں بھسم کردوں گا اسے...... اور اگر آپ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو اس چھڑی سے آپ کا سر پھوڑ دوں گا۔

بیگم: خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے گا۔

شبیر: بہتر اور پھر اس طرح میری چھڑی کے خراب ہو جانے کا اندیشہ بھی تو ہے۔

(دروازے پر دستک کی آواز)

کریم: کون!

آواز: میں ہوں اسرار احمد...... آداب عرض پروفیسر صاحب...... بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند منٹ کے لیے اندر چلا آؤں۔

کریم: ضرور ضرور...... آہا کہیے کوتوال صاحب کیسے مزاج ہیں۔

اسرار احمد: شکریہ...... بانو! آداب عرض کرتا ہوں...... اور پروفیسر صاحب! ابھی میں ہیڈ کانسٹبل ہی ہوں...... کوتوال نہیں۔

بیگم: اللہ کے گھر میں کیا دیر ہے۔ ان شاء اللہ کوتوال بھی بن جایئے گا۔

اسرار: بانو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو سب کچھ ممکن ہے۔

کریم: حوالدار صاحب! کرسی لے کر انگیٹھی کے قریب بیٹھ جایئے۔

اسرار: شکریہ۔

بیگم: آج تو بارش اور آندھی نے حد ہی کر دی...... باہر نکلنے کا دن ہی نہیں۔

اسرار: درست ہے بانو...... آپ کے محلے میں للو پنساری کی دکان کا دروازہ ٹوٹا ہوا پایا گیا ہے میں اسی سلسلے میں ادھر آیا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی قسم کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔

بیگم: چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ للو کی بیوی ہمارے ہاں بھی آیا کرتی ہے بے چاری بڑی سیدھی سی عورت ہے۔

اسرار: ویسے تو اس جگہ کسی بڑی واردات کا احتمال ہی نہیں۔ کیوں کہ اول تو یہ شہر ہی

بدمعاشوں سے خالی ہے۔ اور دوسرے آپ کا محلہ تو بے حد نیک نام ہے......
یہاں تو کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جسے حل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنی
پڑے یا جسے سلجھانے کے لیے دماغ سوزی کرنے کی ضرورت ہو......

شبیر: تو حوالدار صاحب اس طرح آپ کی آمدنی میں تو یقیناً کمی ہو جاتی ہوگی۔

اسرار: جی...... ہاں...... نہیں لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری ترقی رک جاتی ہے اب دیکھئے مجھے جو کانسٹبل سے ہیڈ کانسٹبل بنایا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے فیروز پور کے ایک مشہور قتل میں اہم خدمات انجام دی تھیں۔

شبیر: درست ہے۔

بیگم: حوالدار صاحب میرے خیال میں اگر آپ کو اسی قسم کا کوئی اہم کیس اور ہاتھ لگ جائے تو آپ کوتوال بن سکتے ہیں۔

اسرار: بانو آپ صحیح فرماتی ہیں۔ یہ عین ممکن ہے۔

شبیر: کیوں جناب آپ کو تو ترقی مل جائے گی لیکن اگر کوئی عام شخص یعنی بالکل عام شخص کسی قسم کا راز افشا کرے تو اسے کیا ملے گا؟

اسرار: ایسی حالتوں میں عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ حکومت ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہے۔ البتہ جس پارٹی کے خلاف وہ گواہی دے وہ پارٹی اور اس کے اڑوس پڑوس کے لوگ تو عمر بھر اس کا ناک میں دم کیے رہتے ہیں۔ بعض کیس ایسے ہوتے ہیں کہ گواہی دینے والا خود بھی بہت بدنام ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض لوگوں کی لڑکیاں اغوا کر لی جاتی ہیں۔ لیکن وہ لوگ عزت اور آبرو کی خاطر رپولس میں رپورٹ نہیں کرتے۔

شبیر: ...... اور جناب اگر کوئی چور کسی کے گھر میں چوری کا مال رکھے تو جب چور پکڑا جائے گا تو اس کے ساتھ جس شخص کے ہاں چوری کا مال پکڑا جائے گا اس کا کیا حشر ہوگا؟

اسرار: دیکھئے نا اس معاملے میں قانون پورا پورا انصاف کرتا ہے۔ مثلاً اگر چور کو چھ برس کی قید کی سزا ملے گی تو چور کا مال رکھنے والے کو بھی لگ بھگ دو سال کے لیے جیل

کی ہوا کھانی پڑے گی...... کہیے کیا آپ کی نظر میں کوئی کیس ہے؟

شبیر: جی نہیں...... میری نظر میں تو نہیں...... ہاں شاید پروفیسر صاحب کو اس سلسلے میں کچھ کہنا ہو۔

کریم: (گھبرائی ہوئی آواز میں) ارے واہ صاحب...... کہاں تان توڑی جناب نے...... آخر میرا اس قسم کے معاملات سے کیا واسطہ؟

بیگم: ان بے چاروں کو بھلا ان باتوں کی خبر کیا۔ گھر سے پاؤں تک تو نکالتے نہیں۔

اسرار: جی نہیں...... پروفیسر صاحب آپ سے کیا مطلب...... بانو! کیا بارش بند ہوگئی ہے؟

بیگم: جی نہیں، لیکن ہے بہت ہلکی۔

اسرار: خیر مجھے اجازت دیجئے۔ میرے ساتھی تو تھانے میں جا پہنچے ہوں گے۔ اچھا صاحب آداب عرض......آداب عرض بانو......
شبیر و کریم آداب عرض

(وقفہ)

شبیر: جان بچی لاکھوں پائے۔ ہاں پروفیسر صاحب آپ نے میرا راز بتا کر اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کیوں نہ کرلیا۔

کریم: ارے بھئی میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔

شبیر: بڑے عجیب شخص ہیں آپ...... خیر اب تو کم از کم مجھے اپنا بچاؤ کر ہی لینا چاہیے۔

کریم: خدا کے لیے ڈبے کو آگ کے حوالے نہ کرنا...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔

شبیر: تو بھی مجھے اس سے کیا؟

کریم: اچھا صاحب آپ یہ ڈبہ میرے حوالے کردیں میں آپ کو بیس روپے دے دوں گا۔

شبیر: آہا اب مینڈکی کو بھی زکام لگا۔ بیس روپے میں یہ راز معلوم کیجئے گا۔

کریم: اچھا بھئی تیس روپے سہی۔

شبیر: ارے صاحب توبہ کیجئے......اچھا میں بتاؤں...... پچاس روپے پر معاملہ طے ہوسکتا ہے۔

بیگم: جی! ان حضرت کے بھڑوں میں نہ آیئے۔

شبیر: پروفیسر صاحب اس ڈبے میں روپیہ بنانے کا کل مسالہ موجود ہے۔

کریم: اس سامان سے کس قدر روپیہ بن سکتا ہے۔

شبیر: آپ اس سے دوسو روپے بنا سکتے ہیں۔

کریم: خوب! خوب! میں آپ کو پچاس روپے ہی دے دوں گا۔ آپ روپیہ بنانے کی ترکیب پہلے بتا دیجئے۔

شبیر: نا صاحب! یہ چھوٹی بات ہے یہاں تو اس ہاتھ دے اور اُس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔

کریم: اچھا تو میں اندر سے ابھی روپیہ لاتا ہوں۔

شبیر: بہتر...... ہاں بانو جب تک پروفیسر صاحب روپیہ لائیں۔ مجھے کاغذ پنسل دیجیے تاکہ میں روپیہ بنانے کی ترکیب مفصل طور پر لکھ دوں۔

بیگم: یہ لیجیے پنسل اور کاغذ۔

شبیر: شکریہ۔

(وقفہ)

کریم: لیجیے یہ رہے روپے!

شبیر: لایئے میں گن لوں...... دس بیس، تیس، چالیس اور صاحب یہ پچاس۔ بس ٹھیک۔ لیجیے یہ کٹھالی ہے۔ آپ نے سناروں کے ہاں اس قسم کی کٹھالیاں ضرور دیکھی ہوں گی......

کریم: جی ہاں بہت......

شبیر: اچھا تو کٹھالی میں میں یہ لال لال مسالہ ڈالتا ہوں...... اسے آگ پر رکھے دیتا ہوں۔ جب یہ پگھل جائے گا تو اس میں چاندی ڈال دیں گے...... اچھا اب آپ باورچی خانے کے اس کونے کی طرف چلے جایئے...... میں بھی پیچھے ہٹ جاتا ہوں۔ کیوں پہلے عمل میں کٹھالی کے تڑخ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگرچہ شاذ و نادر

تی ایسا ہوتا ہے لیکن احتیاط لازمی ہے...... اور اب بس کٹھالی کی طرف دیکھتے رہیے......

(دفعتاً دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کا دھاکا)

کریم: (یکلخت مہیب آواز میں چلاّ کر) ارے کم بخت بھاگ نکلا پکڑو پکڑو...... (دروازے کو پیٹتا ہے) مردود باہر سے کنڈی چڑھا گیا ہے (اسی دوران میں کئی چیزوں کے الٹنے اور گر پڑنے کی آوازیں آتی ہیں) غضب ہوگیا...... بیگم...... پچاس روپے...... اچھا میں دوسرے دروازے سے باہر جاتا ہوں......

بیگم: (پرسکون آواز میں) بس اب رہنے دیجیے...... بہت تیر مار لیے کہیے تو آج نیم برشت انڈے تیار کیے جائیں......

کریم: بیگم! تم غضب کرتی ہو...... وہ پچاس روپے لے کر چلتا بنا...... اور تمھیں نیم برشت انڈوں کی پڑی ہے۔

بیگم: (مطمئن لہجے میں) اچھا اب کرسی پر بیٹھ جائیے...... لیجیے یہ بٹوا سنبھال رکھیے ہم کو دو سو پندرہ روپے کا منافع ہوا ہے۔

کریم: (حیرت ناک لہجے میں) بیگم یہ کیسے؟ یہ بٹوا کس کا ہے؟

بیگم: یہ بٹوا ٹھٹھیرے صاحب کا ہے۔ اس میں دو سو پچھتر روپے ہیں۔ پچاس وہ لے گئے۔ باقی منافع ہی منافع سمجھئے۔

کریم: بیگم! تم نے یہ جیب کترنے کا فن کہاں سے سیکھا اور اس کی جیب میں سے یہ بٹوا تم نے نکالا کیسے۔

بیگم: بٹوا کیسے نکالا...... یہ بات اپنے سیفٹی بلیڈ سے دریافت کیجیے۔

کریم: (خوش ہوکر) بیگم! قربان جاؤں...... خدا کی قسم آج تو مان گئے۔ تمھیں۔

بیگم: یہ تو میں کئی مرتبہ ثابت کر چکی ہوں کہ میں بچپن ہی سے آپ کی بہ نسبت زیادہ عقل مند واقع ہوئی ہوں۔

کریم: (بگڑ کر) ہاں صاحب اگر تم نہ ہوتیں تو مجھے واقعی کوّے اچک لے جاتے۔ اُف۔

اُف!......اچھا ہوا۔ وہ آملیٹ کی پلیٹ تو کھسکاؤ اس طرف۔

(ماخوذ)......

یہ ڈرامہ پہلی بار 'ادبی دنیا' جلد 25 نمبر 1 میں شائع ہوا تھا۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

مضامین

چار سو برس پہلے

محمد حسن عسکری کو چھوڑ کر عام طور پر آج کل یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اردو افسانہ نگاری ترقی پر ہے...... لیکن اربابِ ذوق نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہمارا فنِ تنقید بھی افسانے کے دوش بدوش ترقی کی منزلوں پر منزلیں مارے آگے بڑھا جا رہا ہے۔ شروع شروع میں تو نقادوں کے حواس بجا رہے لیکن بعد میں جب فنِ افسانہ نگاری اپنے جوبن پر آیا تو نقادوں اور مقدمہ نویسوں کے دماغ بھی چکر کھا گئے اور پینترے بدل بدل کر نت نئے معیار قائم کرتے چلے گئے اور اب تو فن تنقید عروج کے بلند ترین مقام پر نظر آتا ہے۔ مثلاً اب رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا جاتا ہے۔ ''صاحب! اس قسم کے افسانے سو سال بعد لکھے جائیں گے۔'' یا ''فلاں افسانہ اس صدی کا بہترین افسانہ ہے۔'' وغیرہ وغیرہ۔

مجھے نقاد بے چارا بالکل معصوم نظر آتا ہے۔ شرارت تو ان کی سمجھیے جو انھیں لکھنے پر مجبور کرتے ہیں جیسے کہ میرے عزیز دوست شاما نند گاگر نے ایک دوست کو دق کیا اور ان سے اس قسم کی باتیں کہلوائیں...... کسی کو کیا کہیں جب اپنا دامن ہی پاک نہیں۔ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا تو سرورق کے حاشیے پر چھاپنے کے لیے چند رائیں درکار تھیں۔ میرے پبلشرز نے کرشن چندر اور مولانا صلاح الدین کی رائیں تو حاصل کر لیں اور پھر شاید اُنھوں

نے یہ سوچا کہ سکھوں جیسی اہم اقلیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے مجھ سے کہا کہ بیدی تمھارا دوست ہے اس کی رائے تم حاصل کرو۔ میں بھی ان کے بھروں میں آ گیا۔ چنانچہ سائیکل اڑاتا باد برق کو پیچھے چھوڑتا ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہنچا۔ اور بیدی کو ایک ایسے کمرے میں جا دبوچا جس میں دروازہ ایک ہی تھا...... جاتے ہی رائے طلب کی۔ بیدی نے میرے طور بے طور دیکھے تو اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ دروازے میں میں کھڑا تھا۔ متعدد کھڑکیاں موجود تھیں لیکن ان پر مضبوط باریک جالی منڈھی تھی۔ ہر چند بیدی کو اپنے حقیر الجثہ ہونے پر بڑا ناز ہے لیکن یہاں تو یہ عالم تھا کہ اگر وہ مچھر بھی ہوتا تو جالی میں پھنس کر رہ جاتا...... چنانچہ اس نے رائے لکھ دی۔

یہی حرکت شاما نند گاگر نے اپنے مقدمہ نویس کے ساتھ کی ہوگی۔ یعنی ایسے کمرے میں گھیر لیا ہوگا جس میں صرف ایک ہی دروازہ ہوگا اور بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ ہوگی نہیں۔ پہلے تو نقاد بہت پھڑ پھڑائے ہوں گے۔ انھوں نے اس گھسیٹن سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی ہوگی لیکن کوئی بس نہ چلنے پر مقدمہ لکھ مارا۔ دو چار افسانوں کی بابت اناپ شناپ رائے لکھ دی اور باقی افسانوں کی بابت کہہ دیا کہ صاحب! یہ افسانے اس قسم کے ہیں کہ آج سے ایک سو برس بعد ہی لکھے جائیں گے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ سانپ مر گیا، لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ اس طرح سبھی لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔ افسانہ نگاروں کا بوجھ ہلکا کر دیا اور پڑھنے والے اس لیے کہ چلو جان چھوٹی۔ اب ان افسانوں کو ان کے پوتے پڑپوتے پڑھیں گے۔

ایک نوخیز افسانہ نگار دوسرے نئے افسانے کی بابت فرماتے ہیں کہ جناب یہ افسانہ اس صدی کا بہترین افسانہ ہے۔ اس صدی سے مراد 1901 تا 1999۔ خیریت گذری ورنہ وہ اسے برطانوی دورِ حکومت کا بہترین افسانہ بھی کہہ دیتے تو ان کا محمد حسن عسکری کیا بگاڑ سکتے تھے۔

اب تک جو کچھ میں نے تحریر کیا اسے تمہید تصور فرمائیے۔ اب اصل مدعا بیان کرتا ہوں۔ آنے والی اور موجودہ صدی کا ذکر تو ہو چکا صرف گذشتہ صدی کی کسر رہ گئی تھی۔ مژدہ! لیجیے وہ بھی پوری ہوئی — ہمارے ایک افسانہ نگار اچھا خاصہ لکھتے ہیں، اگر ان کی بابت میری رائے طلب کی جائے تو یہ ہیچمدان کج مج بیان بھی کچھ نہ کچھ کہہ سکتا ہے لیکن صاحب موصوف

کی کتاب کا اشتہار شائع ہوتا ہے تو تان اس بات پر آن کر ٹوٹتی ہے کہ اگر یہ افسانے ایک صدی پہلے لکھے جاتے تو کیا ہوتا؟

کیسی مزے کی بات ہے۔ واقعی ایک صدی پہلے کیا ہوتا؟ لیکن ایک صدی کی شرط بھی کیوں ہو۔ کچھ اس سے بھی بڑھ کر کہنا چاہیے۔ تنقید کے معیار کو اب کچھ اور بڑھانا چاہیے۔ مثلاً یہ افسانہ تین صدی پہلے یا تین صدی بعد میں لکھا جانا چاہیے تھا۔ یا یہ افسانہ گذشتہ موجودہ اور آئندہ صدی کا بہترین افسانہ ہے......

فرض کیجیے ہمارا ایک آدھ خالص ترقی پسند افسانہ آج سے چار سو برس پہلے یعنی شہنشاہ اکبر کے زمانے میں لکھا جاتا تو کیا ہوتا۔ ذرا اس بات پر غور کرنے کے لیے ہم ایک نہایت بے ضرر سا افسانہ ''لحاف'' لیتے ہیں۔ (مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے)

لگ بھگ 1574 کا ذکر ہے کہ شہنشاہِ ہندوستان جلال الدین اکبر دربار سے واپس آئے۔ دوپہر کا وقت' گرمی کی شدت' کھانا کھانے کے بعد قیلولے کے لیے پلنگ پر دراز ہوگئے۔ ہمیں کبھی خواب میں شاہی کمرہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہاں کا نقشہ کیا کھینچیں؟ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ خس کی ٹٹیاں لگی تھیں۔ غالیچے بچھے تھے۔ انواع واقسام کے شربت پلنگ کے قریب تپائی پر دھرے تھے۔ تر بتر خس میں لپٹی ہوئی صراحیاں ہوا میں لٹک رہی تھیں۔ پیچوان کی نے دانتوں میں دابے شہنشاہ گاہے گاہے کش لیتے اور دھواں ان کی گھنی مونچھوں میں سے اڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھے۔ گھٹنوں پر......کا افسانہ نمبر رکھا تھا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی، علی عباس حسینی وغیرہ کے افسانے پڑھ لینے کے بعد ان کی نظر سے ''لحاف'' کی پہلی چند سطریں ہی گذری تھیں کہ ان کے کان کھڑے ہوگئے۔ سنبھل کر ہو بیٹھے۔ چہیتی بیگم کو آواز دی۔ وہ پکار کر بولیں۔ ''بال دھوئے ہیں ذرا جھٹک کر حاضر ہوتی ہوں۔''

جب تک بیگم تشریف لائیں شہنشاہ آخری سطور تک پہنچ چکے تھے۔ ادھر وہ سامنے آئیں اُدھر افسانہ ختم بیگم نے دیکھا کہ شہنشاہ کی عجیب حالت ہے۔ ایک رنگ آتا ہے......اور جاتا کوئی بھی نہیں۔ یعنی ایک ہی رنگ نقش ہو کر رہ گیا۔

بیگم کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے...... اور اڑ کر کھڑکی کے سامنے سرو کی ٹہنی پر جا بیٹھے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے جہاں پناہ تھے کہ بس ٹکٹکی باندھے خلا میں گھور رہے تھے۔ پیچوان کی نے سانپ کی طرح بل کھا کر ایک طرف کو گر پڑی۔ قریب تھا کہ بیگم کی چیخ نکل جائے کہ جہاں پناہ کے لب ہلے لیکن سکتے کا یہ عالم تھا کہ حلق سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ بیگم بادشاہ کے قریب ہو بیٹھیں۔ بارے ان کی زلفِ عنبریں کی خوشبو سے حضور کے دل کو فرحت حاصل ہوئی اور مری ہوئی آواز میں بولے ''بیگم تم نے یہ افسانہ پڑھا؟''

بیگم نے ہاتھ بڑھا کر رسالہ لے لیا اور بولیں ''جہاں پناہ پڑھا تو ضرور......''

''یہ...... آخری سطر کا مطلب سمجھ میں آیا؟''

''نہیں عالی جاہ۔''

بادشاہ سلامت سر کھجانے لگے۔ بڑی دیر تک سوچ بچار میں غرق رہے۔ جب کچھ دم میں دم آیا تو پکار کر بولے۔ ''کوئی حاضر ہے؟''

اس وقت ایک خواجہ سرا باہر بیٹھا چھت کے پنکھے کی ریشمی ڈوری کھینچ رہا تھا۔ حکم ہوا کہ فوراً نورتنوں کو حاضر کیا جائے۔

بیگم نے شربت کا گلاس پلایا اور مور کی پنکھیا جھلنے لگیں۔ پھر بولیں۔ ''عالی جاہ! ڈی۔اے کالج لاہور کے ایک پروفیسر نے کہا تھا کہ یہ افسانہ آج سے چار سو برس بعد لکھنا چاہیے تھا۔''

شہنشاہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ ''اچھا؟ تو کیوں نہ اسے بلوا کر اس افسانے کی غایت دریافت کی جائے۔''

''لیکن حضور سنا ہے کہ وہ یہ کہتے ہی تڑپ کر زمین پر گرا اور ایڑیاں رگڑتا اللہ کو پیارا ہوا۔''

تھوڑی دیر بعد ابوالفضل، فیضی، ٹوڈرمل، تان سین وغیرہ نورتن حاضر خدمت ہوئے۔ عالی جاہ نے وہ افسانہ پڑھ کر سنایا۔ اور اس کا مطلب پوچھا۔ افسانہ سن کر ابوالفضل اور فیضی لگے بغلیں جھانکنے یعنی دراصل معاملہ پیچیدہ تھا۔ عالی جاہ نے حکم دیا کہ سب لوگ اپنے

اپنے گھر کو جائیں اور دوسرے روز اس کا حل دربار میں پیش کریں۔

وہ رات شہنشاہ نے آنکھوں میں کاٹی۔ ساری رات تارے گنتے رہے۔کل بتیس ہزار سات سو نو گن پائے تھے کہ صبح ہو گئی۔ دربار میں پہنچتے ہی عالی جاہ نے اپنا سوال دہرایا لیکن کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بادشاہ کو اور مہلت دینی پڑی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

آخر ایک دن بھرے دربار میں شہنشاہ کا تیموری خون جوش میں آیا۔ اور سنگھاسن سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی بے جا کلمہ ان کے منہ سے نکلے ابو الفضل ہاتھ باندھے سامنے آیا اور بولا۔ ''جان کی امان پاؤں تو ایک عرض کروں۔''

شہنشاہ نے جان بخشی کا وعدہ فرمایا۔ ابو الفضل نے کہا۔ ''حضور! میری عقل میں ایک بات آئی ہے۔ وہ یہ کہ کسی بڑے سردار کو بھیج کر یہ بات افسانہ نگار ہی سے دریافت کی جائے۔''

جہاں پناہ نے یہ بات سنی تو ان کا رنگ فق ہو گیا۔ انھیں زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ ابو الفضل کو نو رتنوں میں شامل کر کے انھوں نے کوئی بہت بڑی غلطی نہیں کی تھی۔

چنانچہ اسی وقت خانخاناں کو چنے ہوئے لڑاکے جانبازوں کے گروہ کے ساتھ روانہ کر دیا۔ عربی گھوڑوں پر سوار دنوں کی منزلیں ہفتوں میں طے کرتے ہوئے آخر کار منزل مقصود تک جا پہنچے۔ لیکن بادشاہ سلامت کا پیام ملنے پر ''لحاف'' کے خالق نے انواع و اقسام کے بہانوں سے انھیں ٹال دیا۔ خانخاناں نے سڑک سے ایک اینٹ اٹھائی اور ان کے مکان کی دیوار سے دے ماری اور واپس چلا آیا۔

شہنشاہ چشم براہ تھے۔ سب حال سنا تو دل کو افسوس ہوا۔ خانخاناں نے کہا کہ حضور میں بھی ان کی اینٹ سے اینٹ بجا آیا ہوں۔ اس پر شاہ کو طیش آیا۔ فرمایا ''خانخاناں تم نے صنفِ نازک کے ساتھ بہت زیادتی کی چنانچہ میں تمھیں معاف کرتا ہوں۔ اب تم فوراً حج کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' (خانخاناں کے حج پر روانہ ہونے کی دوسری تواریخی وجہ غلط ثابت ہوتی ہے۔)

اس کے بعد شہنشاہ ملول رہنے لگے۔ ایک روز تان سین نے کہا ''حضور! خادم کو اجازت دیں۔ انشاء اللہ کل حالات معلوم کر کے واپس آؤں گا۔''

شہنشاہ نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ یہ بھی کہا کہ اگر مصنفہ نے اس افسانے کی غایت صاف صاف بتا دی تو اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا جائے گا اور ان موتیوں میں سے ہر موتی کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہوگی۔ تان سین خراماں خراماں بمبئی پہنچا۔ ملاقات کیوں کر ہو؟ گرمیوں کا موسم۔ دوپہر کا وقت، آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ چنانچہ موقع و محل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے ملہار گانا شروع کیا۔

نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ مصنفہ نے نوکر کو بھیج کر اُسے اندر بلوا لیا اور کہا ''تم اچھا گاتے ہو۔ اسی طرح گاتے رہے تو ایک روز ماسٹر نثار کی طرح گانے لگو گے۔ اچھا ایک گانا اور سناؤ میں تمھیں فلم کمپنی میں نوکری دلوا دوں گی۔''

تان سین نے چغہ اُتار دیا۔ اس کی زرق برق پوشاک دیکھ کر مصنفہ حیران رہ گئیں۔ بولیں۔ ''آپ کون ہیں؟''

تان سین نے حقیقت بیان کی اور کہا۔ ''اب میں اصل حالات دریافت کیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ ورنہ ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا دورِ حکومت بجائے بہادر شاہ کے اکبر پر ہی ختم ہو جائے گا۔''

مصنفہ بھی ہوشیار تھیں۔ بولیں۔ ''شہنشاہ جلال الدین اکبر ہندوستان کے بادشاہ اور ہمارے محبوب حکمران ہیں۔ ان پر تو وہی مثل صادق آتی ہے کہ کیا پدی اور پدی کا شوربا۔''

تان سین آداب بجا لایا۔ مصنفہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے بندی کا افسانہ پڑھ کر ذرہ نوازی کا ثبوت دیا ورنہ کجا یہ افسانہ کجا ان کی فہم و فراست۔''

یہ کہہ کر مصنفہ نے PEPS کی چند ٹکیاں تان سین کے ہاتھ پر رکھ دیں اور وہ انھیں کھا کر بہت خوش ہوا۔

''درحقیقت بات یہ ہے کہ افسانے کا راز بتلانے میں بھی ایک مصلحت ہے۔ اس طرح خدانخواستہ شہنشاہ کی ہتک ہی تو ہوگی۔ ان کا ذہن جامِ جہاں نما ہے۔ ان سے کیا بات

پوشیدہ رہ سکتی ہے۔ کون سا مسئلہ ہے جسے وہ حل نہ کر سکیں؟''

اگلے زمانے کے بادشاہ اور ان کے مصاحبین بھی سیدھے سادے لوگ ہوتے تھے۔ چنانچہ تان سین ''دریں چہ شک'' کہہ کر واپس چلا آیا۔

بادشاہ نے جب یہ بات سنی تو ان کی مکمل تسلی ہوگئی یعنی مصنفہ لاکھ لاکھ روپے والے موتیوں کے لالچ میں آنے والی نہیں۔

اس کے بعد بادشاہ سلامت حد سے پرے اُداس رہنے لگے۔ تریاہٹ، راج ہٹ اور بالک ہٹ وغیرہ ہٹیں تو مشہور رہی ہیں۔ اگر کوئی تسکین دینے کی کوشش کرتا تو وہ کندھوں کو حرکت دے کر کہتے ''ہنک ہنک'' مجھے بتاؤ کہ یہ افسانہ لکھنے سے اس کا مقصد کیا تھا؟''

مالوے میں علی قلی خاں نے بغاوت کردی۔ رفتہ رفتہ دوسرے صوبوں سے ابتری اور صوبہ داروں کی خودسری کی خبریں آنے لگیں۔ لیکن شہنشاہ اپنی ہی فکر میں گھسے جارہے تھے۔ پھر وہی کچھ ہوا جو ایسے موقعوں پر عموماً ہوا کرتا تھا یعنی بیربل کی شامت۔ اکبر نے بیربل سے کہا۔ ''دیکھو بیربل اگر تم نے تین دن کے اندر اندر یہ راز دریافت نہ کیا تو تمھیں موت کے گھاٹ اُتار دوں گا۔''

راجہ بیربل منہ لٹکائے گھر پہنچے غم سے ایسے نڈھال ہوئے کہ خوراک پہلے کی نسبت چار گنا بڑھ گئی۔ جو دیکھتا آہ سرد بھرتا۔ ہاتھ ملتا۔

بیربل کی ایک بیٹی تھی۔ طرح دار، حسین، اگرچہ ادھیڑ عمر لیکن شباب قائم تھا اور اس پر طرّہ یہ کہ ازدواجی زندگی کی کٹر مخالف۔

پہلے پہل تو بیربل کی بیٹی نے کچھ خیال نہ کیا، لیکن تیسرے روز جب کہ بیربل مارے خوف کے قریب المرگ ہوگئے تو وہ پتا جی کے پاس پہنچی' دم دلاسہ دیا۔ اصل ماجرا پوچھا۔ بیربل نے کچا چٹھا کہہ سنایا۔ ''نیک بخت'' بولی۔ ''تو اس میں مشکل ہی کیا ہے؟'' بیربل مارے خوشی کے آپے سے باہر ہوگئے بیٹی نے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ بیربل کو پر لگ گئے اڑ کر شہنشاہ کے حضور پہنچا۔

عالی جاہ کا حال بے حال تھا۔ منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ بیربل باقاعدہ جان کی

امان پا کر بادشاہ کے مبارک کان تک اپنا منہ لے گئے۔

شہنشاہ میز پر مکّا مار کر گرجے ''بس اتنی سی بات تھی؟ لاحول ولا قوۃ...... استغفر اللہ!''

دوسرے دن بادشاہ سلامت لشکرِ جرار لے کر بغاوتیں فرو کرنے کے لیے چل کھڑے ہوئے...... مجھ ناچیز کی رائے میں بیربل کی بیٹی بھی اپنے وقت سے چار سو برس پہلے ہی پیدا ہوگئی تھی۔

☆☆☆

یہ مزاحیہ مضمون 'ساقی، ظرافت نمبر' اپریل 1946 میں شائع ہوا تھا کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

فلمی انٹرویو

(ایک مکالمہ)

میں وہ سہانی شام کبھی نہیں بھول سکوں گا جب سرتاج ہوٹل کی خواب ناک فضا میں چائے پارٹی کے بعد ہم سینما کے چند مشاقوں کی بعض فلمی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے بمبئی کے مشہور عالم (جنتری نہیں) ہستی یعنی پروڈیوسر ڈائرکٹر جناب ل۔ب گلگل، یا شاید گلگت یا غالباً گرگٹ نے ایک دل دہلا دینے والا مگر دل چسپ انٹرویو دیا تھا— سر دست میں انھیں ل۔ب گرگٹ کے نام ہی سے یاد فرماؤں گا۔ جی تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ انٹرویو کی شام کبھی نہیں بھول سکتا...... یہ کوئی رسمی بات نہیں ہے فی الحقیقت متعدد شعوری، لاشعوری بلکہ بدشعوری کوششوں کے باوجود وہ شام میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکی۔

اس روز یہ پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا کہ گرگٹ صاحب اپنی اعزازی پارٹی کے بعد فلم کے شیدائیوں کے انٹ شنٹ سوالوں کے برجستہ بلکہ ہوسکا تو منہ توڑ جوابات عنایت فرمائیں گے۔

جناب ل۔ب گرگٹ بوڑھے نہ جوان، موٹے نہ پتلے، لمبے نہ ٹھگنے قسم کے

انسان...... ہاں ہاں انسان ہی تو تھے۔ چہرے کے خدو خال یعنی پیشانی' ناک' ہونٹ' کان وغیرہ بھی چھوٹے نہ بڑے، البتہ مونچھیں ضرورت سے زیادہ لمبی تھیں' معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے یہ حرکت سراسر شرارتاً کی تھی ورنہ ایک شریف انسان کے لیے چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی کافی ہیں۔صورت کا بھی کچھ یہی حال تھی یعنی صورت سے نہ شرافت کا اظہار ہوتا تھا اور نہ ذہانت کا۔

سگریٹ بیڑی وغیرہ جلانے کے بعد حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا: جناب کوئی اور بات کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، کیا اجازت ہے؟

مسٹر گرگٹ، نہیں

اس پر سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔

ل۔ب گرگٹ جی کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ پیدا ہوئی جو پھر معدوم نہیں ہوسکی۔ بولے: آہا کیا میں نے غلط کہا؟ کیا مجھے اثبات میں جواب دینا چاہیے تھا۔ اچھا تو میں 'ہاں' کہتا ہوں۔

حاضرین کی جان میں جان آئی۔

گرگٹ جی بولے: اسے 'سائی کولوجی' کہتے ہیں نے ان صاحب کا سوال سنے بغیر آپ کے چہروں کی کیفیت سے بھانپ لیا کہ میں نے غلط جواب دے دیا ہے۔ یاد رکھیے اس چیز کی فلم میں خاص ضرورت پڑتی ہے۔

پہلے شخص نے پھر کہنا شروع کیا: میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کے نام میں گرگٹ (گل گل یا گلگت) سے پہلے دو حروف ل۔ب کا کیا مطلب ہے؟

گرگٹ جی'' آپ دونوں حروف کی بابت الگ الگ دریافت کیجیے۔''

''بہتر — تو 'ل' سے کیا مراد ہے۔''

جواب ''لال''

سوال: ''اور ب کا مطلب؟''

جواب۔ ''بجھکو''

سوال۔ ''یعنی لال بُ بُ......''

گرگٹ جی۔ بس بس، یہیں پر ختم کر دیجیے اپنا فقرہ— تھینک یو۔

دوسرے صاحب کیوں جی فلم میں پہلی چیز کہانی ہے نا جس کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

شری گرگٹ جی نہیں یہ آخری چیز ہے اس کا خیال رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

تیسرے صاحب۔ فلمی کہانی بنائی کیسے جاتی ہے؟

شری گرگٹ (تامل کے بعد) دیکھئے آپ نے بڑا گہرا سوال کر دیا ہے...... اصل بات یہ ہے کہ فلمی کہانی بنائی نہیں بگاڑی جاتی ہے۔

چوتھے صاحب...... وہ کیسے؟ کہانی تو اس فن کے ماہرین ہی لکھتے ہوں گے اسے بگاڑنے کی ضرورت؟

شری گرگٹ۔ جس طرح زلفِ برہم ہی میں عاشق کا دل اٹکتا ہے اسی طرح فلمی کہانی بگاڑنے ہی سے سنورتی ہے۔

تیسرے صاحب۔ اچھا تو اس کام کے لیے خاص ماہرین کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہوں گی۔

شری گرگٹ۔ اس سوال کے جواب کے لیے زیادہ وقت درکار ہے لیکن فی الحال یہ کہنا کافی ہوگا کہ اسٹوڈیو کے دربان سے لے کر سیٹھ جی تک سب اس فن میں استاد ہوتے ہیں تاہم یہ کام سیٹھ جی بہ ذاتِ خود ہی کرتے ہیں۔

چوتھے صاحب۔ فلمی گیت کون لوگ لکھتے ہیں کسی اچھے شاعر کا نام تو سننے میں آیا نہیں کبھی۔

شری گرگٹ۔ فلمی گیت 'مہا کوئی' لکھا کرتے ہیں۔

پانچویں صاحب (چند فلمی گیتوں کے بول سنا کر) اس قسم کے گیت لکھنے کے لیے اچھی خاصی نا اہلیت کی ضرورت ہوتی ہوگی۔

شری گرگٹ (چہرے پر غور و تفکر کے آثار پیدا کر کے) جی نہیں زیادہ نا اہلیت کی ضرورت بھی نہیں ہے، بس ذرا انسان کا ہتھ چھٹ ہونا ضروری ہے پھر جہاں قلم پکڑا گیت

گھسیٹ ڈالا۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ چنانچہ انھیں ششدر ششدر حیراں حیراں پا کر شری گرگٹ نے ارشاد کیا: دیکھیے۔

یہ کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے میں نے تازہ فلم کے لیے بزعم خود — میرا مطلب ہے بقلم خود ایک گیت لکھا ہے چند بول سنئے:

ہیرو آ ؤ ری بجنی (مختصر لے)

بیٹھو ری بجنی "

سوچو ری بجنی "

چار دن کی چاندنی (اونچی لے)

پھر یہ بے رخی کیسی؟ (لفظ کیسی کو خوب لٹکا کر گایا جائے گا)

ہیرو کی زبانی دوسرا بول سنئے:

تم بھی راضی

ہم بھی راضی

کرے کیا قاضی

اب بتلاؤ بجنی

پھر یہ بے رخی کیسی؟ (لے حسب سابق) اب اسی چیز کو ڈوئیٹ یعنی دوگانا بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہیروئن ہیرو کو پرے دھکیل کر کہے۔

تم ہو کالے

لالے کے لالے

پھیلے کے پھیلے

پھر سوچو ساجن

تری ہمری پیت کیسی

حاضرین: (دانت دکھا کر) واہ وا واہ وا۔

شری گرگٹ (آنکھیں دکھا کر) دوستو! آج کل ہماری مشکلات بہت بڑھ گئی

ہیں۔ پہلے زمانے میں ہیرو ہیروئن کو دیکھتے ہی دھڑام سے فرش پر گر پڑتا تھا لیکن اب جذبہ عشق میں وہ شدت نہیں رہی۔ البتہ ہیرو پہلی ملاقات میں ہیروئن کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بغیر آنکھیں جھپکائے اسے گھور گھور کر دیکھتا رہتا ہے۔ گھریلوتسم کی شرمیلی ہیروئن مارے حیا کے زمین میں گڑ جاتی ہے۔ اسی اثنا میں آرکسٹرا بجنے لگتا ہے۔ ہیروئن کے شیریں لب ہلتے ہیں اور وہ تیز و بلند آواز میں یوں گاتی ہے:

ٹک ٹک دیکھتے ہو (یہاں وہ قدرے تامل کرتی ہے لیکن آرکسٹرا بجتا رہتا ہے)

(دوبارہ) ٹک ٹک دیکھتے ہو

(کمر ہلا کر) ضروری کوئی بات ہے۔ (اس مصرعے سے جس بھولے پن کا اظہار ہوتا ہے وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی)

(مکرر) ٹک ٹک دیکھتے ہو۔ ضرور کوئی بات ہے۔

(اب سوال کرتی ہے)

آخر کیا بات ہے؟

آخر کیا بات ہے؟

اس کے بعد ہیروئن تیز طرار ہرنی کے مانند اچھل کر خس و خاشاک کی طرح گرداب رقص میں کھو جاتی ہے اور فضا میں ضرور کوئی بات ہے اور آخر کیا بات ہے' کے بول گونجنے لگتے ہیں۔

چھٹا ہوا شخص (ہوا' حذف کر کے پڑھیے) ایک بات اور یاد آ گئی۔ ابھی ابھی آپ نے گیت کے بول سنائے تھے۔ ''بھیپسے کے بھپسے'' وغیرہ۔ آخر ہمارے ہیرو اس قدر موٹے، بھدے اور ہٹے کٹے کیوں ہوتے ہیں؟

شری گرگٹ۔ ان میں وٹامنز زیادہ ہوتے ہیں۔

سوال: پھر انھیں ہیرو کے پارٹ کے لیے کیوں چنا جاتا ہے؟

شری گرگٹ۔ عاشق کو مضبوط اور طاقت ور ہی ہونا چاہیے۔ یہ کام کسی کمزور انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک مثال یاد آ گئی۔ مشہور عاشق رانجھا سادھو کے بھیس میں اپنی شادی شدہ محبوبہ ہیر سیال کے سسرال میں بظاہر خیرات لیکن بہ باطن اس کے درشن کرنے کے لیے

اس کے گھر پہنچتا ہے تو محبوبہ کی نند سہتی اس سے کہتی ہے:

ہاتھی وانگ ٹنگاں، تیرا ڈھڈ کپا (سید وارث علی شاہ)

یعنی تیری ٹانگیں ہاتھی کے مانند اور پیٹ کپّے کی طرح ہے— اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے کے عاشق ڈنڈ پیل کرارے جواں ہوتے تھے۔

ساتویں حضرت! بات یہ ہے کہ صاحب کہ ہم سب فلمی دنیا سے قطعاً ناواقف ہیں اس لیے فنی باریکیاں سمجھ سے باہر ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں موٹی چیزوں مثلاً کہانی، پلاٹ، گیت، موسیقی وغیرہ کی بابت سرسری اور غیر فنی معلومات بہم پہنچایئے۔

شری گرگٹ۔ فن تو میری گھٹی میں پڑ چکا ہے، بہر کیف میں کوشش کروں گا کہ غیر فنی انداز میں فنی چیزیں بتا سکوں۔ کہانی کی بابت گفتگو ہو چکی ہے۔ آپ یہ بات یاد رکھیے کہ ہر فلم کا پلاٹ بنیادی طور پر ایک ہی ہوتا ہے اور اگر "کہانی نویس" ادھر اُدھر بھٹک بھی جائے تو پھر سیٹھ صاحب بہ نفس نفیس اس پر نظر ثانی کر کے اسے راہ راست پر لے آتے ہیں۔ گیتوں کے مواقع بھی یکسر ملتے جلتے ہوتے ہیں اس لیے اُنھیں بھی اسی انداز سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ایک گیت وہ ہوتا ہے جو ہیروئن فلم کے آغاز میں گلستان، ہندوستان، پاکستان، ریگستان، نخلستان یا قبرستان وغیرہ میں ناچ ناچ اور کود کود کر گاتی ہے۔ مثلاً

خرمستی کے دن آئے ری سجنی!

بعد میں اس کی سکھیاں مل جل کر آس دیتی ہیں— ہاں خرمستی کے دو تین دادرے ہوتے ہیں یعنی ناچ اور گانا مثلاً گھنگھروؤں کی چھم چھم کے ساتھ۔

اوئی رے۔

ہائے رے۔

بہیاں مرور گیو رے

چریاں ترور گیو رے

سکھیاں پر معنی نثر میں پوچھتی ہیں: اری کون؟

رقاصہ اس بات کا صاف صاف جواب دینے سے شرماتی ہے البتہ کولھے مٹکا مٹکا کر

کہتی ہے۔

اوئی رے

ہائے رے

تیسری قسم کے گانے المیہ ہوتے ہیں۔ ہیرو فلم کی طوالت اور ہیروئن کے گانوں سے پریشان ہو کر غائب ہو جاتا ہے، ہیروئن اس کا ہومیو پیتھک یعنی علاج بالمثل کرتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں وہ المیہ گیت گاتی ہے، کیوں کہ اس اصول کے تحت گانے کا مارا ہوا گانے ہی سے بچ سکتا ہے۔ مثلاً

بادل آئے	تم نہیں آئے
جیار لائے	تم نہیں آئے
گھاس لہرائے	تم نہیں آئے
مینڈک ٹرائے	تم نہیں آئے

اس گیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو ہیرو اور بھی دور چلا جاتا ہے یعنی مر جاتا ہے یا اسے واپس آنا پڑتا ہے۔

سب لوگ: آپ دھنیا ہیں مہاراج آپ دھنیا ہیں

شری گرگٹ: آداب عرض کرتا ہوں۔

آٹھواں شخص: (مؤدبانہ) اس موسیقی کی بابت زبان دراز کیجئے۔

شری گرگٹ (برجستہ) لیجئے۔

حاضرین ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔

شری گرگٹ: آپ میں سے بہت کم حضرات فلمی موسیقی کی فنی نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ فنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہتے اس لیے میں سرسری باتیں شدید انتصار کے ساتھ بیان کروں گا۔

فلمی موسیقی کا کلاسیکی موسیقی سے کوئی تعلق نہیں ہے جتنی دیر میں استاد فیاض خاں یا کوئی اور استاد صاحب بہ مشکل ایک تان لے سکتے ہیں اتنی دیر میں فلمی گانا ختم ہو جاتا ہے۔

پہلے استاد لوگ موسم بہار کا منظر یوں کھینچتے تھے۔

ہے سانوریا! پھولوں کی رُت آئی۔

لیکن یہ الفاظ پندرہ منٹ کے الاپ کے بعد ادا کرتے اور پھر انھیں الفاظ کو توڑتے' مروڑتے اور نچوڑتے اور پلٹ پلٹ کر اسی ایک بول پر ایسے شدید حملے کرتے کہ گانے اور سننے والے دونوں کی وحشت میں دم بدم اضافہ ہونے لگتا یہاں تک کہ یا تو سامعین جدھر اُن کے سینگ سماتے اُدھر اٹھ بھاگتے یا پھر ریڈ کراس والے استاد جی کو عالم نزع میں لے کر چمپت ہو جاتے۔ آج کل یہ بات نہیں ہے مثلاً۔ کسی باغ کے گوشے میں سے دفعتاً چند لڑکیوں کی ٹولی نکلتی ہے اور معاً بڑی تیزی سے پکار اٹھتی ہے۔

آئی آئی

ایک اور ٹولی باغ کے دوسرے گوشے سے نکل آتی ہے اور اس بول کو یوں پورا کرتی ہے۔

آئی بہار آئی

اب ملاحظہ فرمایئے کہ اس بول کے کل پانچ الفاظ میں سے آئی چار عدد اور بہار صرف ایک عدد یہ فن اس درجہ کمال تک پہنچ گیا کہ اب بڑی آسانی سے فلمی گیتوں کے مجرب نسخے تیار کیے جاسکتے ہیں مثلاً

ھوالشافی

عنوان: ایک بہار یہ گیت

گت: درگت

لفظ آئی: بیس یا بیسوں عدد

لفظ بہار: بوقت یا بشرط ضرورت

لفظ جیا: چار عدد لفظ بے قرار: آٹھ عدد علاوہ ازیں ہر قسم کا پورن سوراج۔ اگر لفظ 'ہائے' کا عام استعمال کریں تو سونے پر سہاگے والی مثل صادق آئے۔ ان سب اشیا کو کوٹ چھان کو چہار گنا شربت روح آرکسٹرا (روح افزا نہیں) میں گھول کر مریضوں کے

کانوں میں ٹپکائیں۔ انشاء اللہ روح قفس عنصری سے بالا بالا رہے گی۔

حاضرین (سر پیٹ کر) آپ پھر فنی باریکیوں میں پڑ گئے۔

شری گرگٹ (دانت پیس کر) آئی ایم سوری

حاضرین: بیان جاری رہے

شری گرگٹ۔ جی۔ آرکسٹرا میں بڑی خوبیاں ہیں۔ اس سے 'مہا کوی' کو بڑی مدد ملتی ہے جس جگہ 'مہا کوی' کا قلم لاچار ہو کر رہ جاتا ہے وہاں آرکسٹرا آڑے آتا ہے اور پھر 'مہا کوی' جو منہ میں آئے سو کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل بول ملاحظہ فرمایئے جو آرکسٹرا کی مدد سے لفظ 'ہو' پر کس خوبی سے ختم کر دیا گیا ہے۔

جو ہڑ کا کنارا ہو

آکاش تارا تارا ہو

سماں پیارا پیارا ہو

(آخری مصرعے کی جدت ملاحظہ ہو) ہو ہو' ہو ہو' ہو

اسی سے ملتی جلتی ایک اور مثال:

جیا مورا ڈولے

نیا پر تولے

پپیہا را بولے

پی۔ پی۔ پی

چنانچہ اس طرح سرتاج ہوٹل کی خواب ناک فضا میں جب گرگٹ صاحب کا انٹرویو ختم ہوا تو حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب لوگ بڑی سرعت اور تپاک سے رخصت ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے اپنے گھر پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

☆☆☆

یہ مضمون 'آجکل' اگست 1950 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جا رہا ہے۔

حضرت چھچھوندر چھچھوروی

اس کمترین بلکہ بدترین بندۂ بے دست و پا و بدنما کی بے بضاعتی و کم مائیگی عیاں بلکہ عریاں ہے پر بزرگان کا فرمان ہے کہ انسان دو ہاتھ اور دو ٹانگ سے نہیں، اپنے افعال و کردار سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر چند بندہ ہیچ مدان بہر رخ ننگ خانداں، دہقان نہ خان بلکہ شاید شتربان ہے لیکن والد بزرگوار، خدا انھیں جنت نصیب کرے (نہ کرے) شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے اپنا سارا وقت اسی کارِ خیر میں بسر کرتے اور بوقتِ فرصت فکرِ معاش بھی کرتے۔ اکثر فرمایا کرتے کہ زیرِ زمیں گنج ہائے بے بہا اور نہ جانے کیا صورتیں تھیں کہ پنہاں ہوگئیں۔

اس وقت اس مسکین نے ان کے ارشاد کو محض شاعرانہ تعلّی پر محمول کیا، پر ہائے! سمجھا نہ جانا کہ ایک روز ایسا بھی طلوع ہوگا کہ جب ان کے قولِ زریں کا نقطہ نقطہ آفتابِ عالم تاب کی روشنی میں تاباں ہوگا بلکہ جگمگا اٹھے گا اور مخلوقِ خدا کی آنکھیں خیرہ اور چکاچوند ہوں گی۔

تعریف ہو اس رب کی جس نے ...... الخ

خدا جھوٹ نہ بلوائے حقیر کو یوں یاد پڑتا ہے کہ اس خاک نشیں کے والد ماجد حضرت چھچھوندر چھچھوروی کی تعریف میں شب و روز رطب اللسان رہتے اور کہتے کہ حضرت چھچھوندر ایسا شاعر پیدا ہوا نہ ہوگا یوں تو شری احمد نباض نے ایسی ہی بات حضرت پرواز کے

بارے میں کہی ہے لیکن خدا لگتی بات یہ ہے کہ بات میں سے بات نکلتی ہے چنانچہ اگر بیسویں صدی میں یہ قول شری پرواز پر صادق آتا ہے تو انیسویں صدی میں یہی قول حضرت چھچھوندر چھچھوروی پر صادق آتا تھا لہٰذا دونوں اصحاب اپنے اپنے مقام پر سرخاب ہیں۔

اس سرتاپا تقصیر نے عمرِ عزیز کے مبلغ چالیس برس حضرت چھچھوندر کی تحقیق میں گزار دیے۔ قریب تھا کہ گنہگار مقصد حاصل کیے بغیر اللہ کو پیارا ہو لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا چنانچہ فقیر نے جی کی مراد اور جان کی امان پائی اس محنت شاقہ کے بعد ہاتھ بے اختیار خدا کی درگاہ کی جانب اٹھے اور رو کر یوں دعا مانگی:

میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا تو نہ ہوتا تو کیا ہوتا

قارئین میں سے جن کو خدا نے کوڑی بھر عقل بھی دی ہے ('ایڈیٹران' اس کیٹیگری میں شامل نہیں ہیں۔) انہوں نے عمر بھر میں ایک بار چھچھوندر چھچھوروی کا اسم گرامی ضرور سنا ہوگا۔

مجھے بہانگِ دہل یہ کہنے میں شرم محسوس نہیں ہوتی کہ موجودہ صدی کے بڑے بڑے شعرا نے شہنشاہِ سخن حضرت فدوی (Sorry) چھچھوندر چھچھوروی کی خوشہ چینی کی ہے جیسا کہ آگے چل کر خود بخود ظاہر ہو جائے گا میں نام نہیں لوں گا کہ:

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

اب اللہ کا نام لے کر حضور پرنور چھچھوندر کے چند مسلسل اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ ذری بحر پر نگاہ رہے۔

پرنم　پرنم　گم ہم گم ہم
جہنم　جہنم　ہنگم بے ہنگم
تم تم تم تم　ہم ہم ہم ہم
دل　شکستہ　دنیا　قائم
جگر　سوختہ　چرخ　دائم
بارش　بارش　شبنم　شبنم
چھچھوندر　پر غم　صنم　پر نم

داد دیجیے بس بجلیاں ہیں بجلیاں۔ جی چاہتا ہے کہ مندرجہ بالا اشعار کی بابت کچھ کہوں۔ وائے حسرتا! آگے بڑھیے۔

ہم تم پر کیا گذری　　تم ہم پر کیا گذری
بلبل پر کیا گذری　　گل گل پر کیا گذری
قلفل پر کیا گذری　　قل قل پر کیا گذری
ململ پر کیا گذری　　دلدل پر کیا گذری
گذرنے کو چھچھوندر بھی
گذر گئی پر کیا گذری

مرحبا! آمد کا زور ملاحظہ ہو۔ شعر پہ شعر ڈھلتا چلا جا رہا ہے۔ اب مندرجہ ذیل اشعار پڑھیے اور سر دھنیے۔ حضرت موصوف کو غالباً پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ ایک روز ہندی راشٹر بھاشا مانی جائے گی۔ چنانچہ ان اشعار میں ہندی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

تم ہم پر مرتے ہو؟ اجی جاؤ　　ہمیں پیار کرتے ہو؟ اجی جاؤ
رات اکیلے ہمرا جیا دھڑکا　　اب کیا دم بھرتے ہو؟ اجی جاؤ
تین دن سے کہاں مر گئے تھے　　اب یہ باتیں کرتے ہو؟ اجی جاؤ
سیدھے سیدھے جواب دو یہ کیا　　اگر مگر کیوں کرتے ہو؟ اجی جاؤ
اونہوں، اونہوں، اونہوں، اوئی رام!
اجی یہ کیا کرتے ہو؟ اجی جاؤ

واہ وا! کیا بے ساختگی ہے، کیا چاشنی ہے، کیا مٹھاس ہے کیا غضب ہے صاحب!

آپ فن شاعری کی ہر صنف میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک نہایت ہی دل گداز مثنوی بعنوان 'بحور عشق' تحریر فرمائی ہے۔ مجھ حقیر نے ایسی بلند پایہ مثنوی کسی زبان میں نہیں پڑھی۔ یہ ایک سوداگر بچہ کا قصہ ہے جس نے ایک پری رو کے عشق میں گرفتار ہو کر بے شمار مصائب کا سامنا کیا۔ ذیل میں اس واقعہ کا ذکر ہے جب کہ سوداگر بچہ کی معشوقہ سو کر جاگتی ہے اور اپنے باغ میں راتوں رات بڑھنے والے جادو[1] کے پیڑ کو دیکھ کر اظہار حیرت کرتی ہے۔

1. اسی پیڑ کے لیے پری رو نے سوداگر بچہ کو در در کی خاک چھنوائی۔

پہلے تو باغ تھا اک تختۂ گل　　اوئی باجی! یہ کیا ہے کھڑا ہوا
خواب میں دیکھا جو کسمسایا ہوا　　کھلی آنکھ تو اُف!! پایا کھڑا ہوا
بستا تھا پہلے یہ سپنوں میں میرے　　اب دیکھو کیا خوب ہے کھڑا ہوا
پہلے ننھا سا پودا تھا ہر دم لہراتا　　پھر اور بڑھ کر یہ اوئی اللہ ہوا

جادو ہے، ٹونا ہے یا سحر ہے
اوئی اللہ سے بڑھ کر الحمد للہ ہوا

(یادش بخیر! مندرجہ بالا اشعار میں لفظ کھڑا راجہ ہے۔)

سلاست، نازک بیانی اور لطیف اشاروں کا جو سمندر یہاں ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے اسے نسیم یا میر حسن کے وہاں تو دکھایئے ذرا۔ یہ الگ بات ہے کہ خود جنیوں نے اس عظیم شاعر کو قعرِ گمنامی میں گرا کے چھوڑا۔ ہائے افسوس! حالی نے یادگارِ غالب تو لکھ ماری لیکن اس میں حضرت چھچھوندر کی بابت محض دو فقرے لکھ کر رہ گئے (اور وہ بھی قلمی نسخے میں) وائے حسرتا! مولانا شبلی نعمانی نے مثالیں پیش کرنے کے لیے شعرائے ہند و فارس کے دیوان کے دیوان چھان مارے لیکن ذری اس درویش کفن بدوش کی جانب ایک نگاہ تک نہ ڈالی۔ بعض اوقات شک گزرنے لگتا ہے کہ اس عظیم الشان ہستی کے خلاف تاریخ ادب کی سب سے بڑی سازش کی گئی ہے۔ اگر اس حقیر فقیر ہیچمدان کج مج بیان نے کمر ہمت باندھ کر اس مہم کا بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو......تو......کیا ہوتا......؟"

چند اشعار میں معشوق کا 'سراپا' بیان کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اور بے خود ہو جایئے:

وہ یوں تو قاتل سر تا سر ہے　　پر آنکھیں اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو قیامت سر تا سر ہے　　پر رفتار اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو چمن سر تا سر ہے　　پر گال[1] اس کی؟ ہائے!
وہ یوں تو نغمہ سر تا سر ہے　　پر گفتار اس کی؟ ہائے!
یوں تو تل ہے کالا کلوٹا　　گال پہ اس کی؟ ہائے!
یوں تو زلف زہریلی ناگن　　رخ[2] پہ اس کی؟ ہائے!

1-2 گال اور رخ کو استاد نے بشرطِ ضرورت مذکر و مؤنث باندھا کرتے تھے۔

یوں بجلی جیارا ڈرائے چھچھوندر

پر آنکھ میں اس کی؟ ہائے

اس پائے کا سراپا فارسی میں شاذ و نادر ہی دکھائی دیتا ہے اردو کا تو ذکر ہی فضول ہے۔

اگر چہ انیسویں صدی کے شاعر تھے لیکن بعض اعتبار سے بیسویں صدی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ انھیں پڑھ کر بڑے بڑے زہریلے فلمی مہاکویوں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔

دل اک نازک بستی ہے　　یہ بستے بستے بستی ہے

اس کو کیوں تم لوٹ چلے، ہائے!

نازک موتی دیا تھا تم کو　　لگا کر دل سے رکھتے دل کو

اس کو کیوں تم توڑ چلے ہائے!

جب تم ہم پر مہربان ہوئے　　ہم تم پر پھر قربان ہوئے

منہ کو کیوں تم موڑ چلے، ہائے!

جی جی ہم کہتے تھے جی!　　جیٔ جی تم کہتے تھے جی

جی ہا، کیوں جی؟ توڑ چلے ہائے!

کیا مجھ ناچیز کے داد دینے کی ضرورت بھی ہے؟ ذرا غور فرمایئے آخری بند میں فقط جی کی تکرار سے کیا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

اب ذرا شوکتِ بیان ملاحظہ ہو۔

یہ تیرا کلام! واہ وا　　وہ تیرا بام! واہ وا

یہ میری صراحیٔ تھو تھو　　وہ تیرا جام! واہ وا

بے بضاعتی عشق چھی چھی　　حسن کا مقام! واہ وا

مری بے چینی دل لعنت　　اٹل تیرا مقام! واہ وا

ایشو کو نمسکارٔ خوب　　اللہ کو سلام! واہ وا

ترے پاؤں میں او صنم　　ہو میرا مقام! واہ وا

مرا نام چھچھوندرُ اخ تھو

میری ترا نامُ واہ وا

واللہ کیا دندناہٹ ہے۔ مقطع میں معشوقہ کا نام میری ظاہر کر کے کیا چٹکی لی ہے۔

اب شاعر استغنا کا مظاہرہ کس طرح کرتا ہے:

دردِ دل کو دباتا چلا جا اس بے وفا سے نبھاتا چلا جا

آنا ہے تو آ ہی جا و گرنہ جانا ہے تو جا چلتا چلا جا

کھونا ہے گر تو کھودے مجھ کو گر پانا ہے تو نہ ڈر پاتا چلا جا

بے وفائی پہ اپنی شرمسار نہیں تو آ آنکھ سے آنکھ لڑاتا چلا جا

نہ سہی نہ سہی وصل نہ سہی لے تیر تو دل پہ چلاتا چلا جا

میسر نہیں گر وصالِ صنم چھچھوندر

حلوہ مانڈہ بے دھڑک اڑاتا چلا جا

الحمد للہ! کیا تیور ہیں۔ فی الحقیقت بغاوت کا بیج پچھلی صدی ہی میں بو گئے تھے۔

چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

میں اس پیٹ کو کیوں بھروں

یہ مٹکا تیرا ہے کہ میرا؟

(کیا طنز ہے)

میں کھیت میں گندم کیوں بوؤں

یہ کھیت تیرا ہے کہ میرا؟

(ذاتی ملکیت کے خلاف کس قدر زبردست مظاہرہ کیا ہے)

کیوں، آخر کیوں؟ منہ یہ دھوؤں

یہ نگوڑا (منہ) تیرا ہے کہ میرا

(واہ تصوف کا رنگ فق ہے)

کیوں میری میت اٹھائیں گے لوگ
لب سڑک مردہ یہ تیرا ہے کہ میرا
(یعنی مر کر بھی باغی رہے)

قارئین وزن کا خیال نہ کریں۔ جو غریب مر گیا بلکہ جسے مرے ہوئے ایک صدی گذر چکی ہو اس کے اشعار کا وزن جانچنا سراسر زیادتی ہے۔

مرحوم کی کون کون سی صفت بیان کی جائے۔ نیچر اور ویدک حکمت کے متعلق چند شعر ملاحظہ فرمایئے۔

چیلیں کوے اڑتے ہیں باد و بادل اڈتے ہیں
گھن گھن گرجتے ہیں چھنن چھنن برستے ہیں
دیدار کو ہم ترستے ہیں

مینڈک جوہڑ جوہڑ ہیں بھینسیں گوبر گوبر ہیں
صدائیں ٹرڑ ٹرڑ ہیں بولوں پر گرڑ ہیں
ٹیپ کا مصرعہ مٹا ہوا ہے

پیٹ میں کوئی گڑ بڑ ہے جلن اینٹھن جھرڑ ہے
ہوتی پڑڑ پڑڑ ہے غرض طبیعت کھرڑ ہے
تو اس کی دوا ہرڑ ہے

موسم برسات کا منظر چھوٹی بحر میں یوں بیاں کرتے ہیں۔

باول گرجیں گڑ گڑ گڑ گڑ
مینہاں برسے گھر گھر، گھر گھر
چڑیاں پھڑکیں پھڑ پھڑ، پھڑ پھڑ
سانپ سرکیں سر سر، سر سر
جیا چھچھوندر
مر مر، مر مر

دیکھئے مقطع میں قنوطیت پیدا ہوگئی۔ جوں جوں قبر کی جانب قدم بڑھتے گئے یہ کیفیت شدید ہوتی گئی۔

کیوں کمر کس کر باندھیے　　　کستے کستے کس جائے گی
کیوں بستی دل کی بسایئے　　　بستے بستے بس جائے گی
کیوں چندیا اپنی گھسایئے　　　گھستے گھستے گھس جائے گی
کیوں زندگی رو کر کاٹیے　　　کٹتے کٹتے کٹ جائے گی

کیوں چھچھوندر چھچھر چھچھوریے
چھچھرتے چھچھرتے چھچھر جائے گی

زندگی کے آخری دنوں میں شامی کباب تک ہضم نہیں کرسکتے تھے اور بقول اقبال کے ابلیس کے فقط اللہ ہو اللہ ہو بن کر رہ گئے تھے۔ ان تاریک دنوں کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمایئے۔

مرتے کھپتے اللہ اللہ　　　سوتے جگتے اللہ اللہ
کھاتے پیتے اللہ اللہ　　　روتے ہنستے اللہ اللہ
بیٹھتے اٹھتے اللہ اللہ　　　مرتے مرتے اللہ اللہ
آتے جاتے اللہ اللہ　　　لیتے دیتے اللہ اللہ
کچھوا کوا اللہ اللہ　　　چھچھوندر چوہا اللہ اللہ

آخر آپ 1837 میں راہئی ملک عدم ہوئے اور ان کے شاگرد حضرت خرگوش آسمانی نے تاریخ وفات نکالی (اور پھر چھپالی)

وقت کی کمی اور جگہ کی تنگی مانع آتی ہے ورنہ دفتر کے دفتر لکھ ڈالتا ہے۔ چنانچہ مشتے از خروارے کے بمصداق کلام چھچھوندر کے چند نمونوں پر اکتفا کرنا پڑا۔ حضرت موصوف پر ایک کتاب جو زیادہ سے زیادہ آٹھ سو (اور کم سے کم دو) صفحات پر محیط ہوگی اور مصنف 'طلسم ہوش خطا' کے نام سے معنون کی جائے گی' زیر ترتیب ہے۔ نظر ثانی کے لیے اصل مسودے کے چند اوراق پریشاں کر کے بابائے اردو حضرت تلاشِ حق کی خدمت میں ارسال کیے جاچکے ہیں۔

☆☆☆

یہ مضمون آج کل دسمبر 1951 میں شائع ہوا۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ پہلی بار کلیات میں شائع کیا جارہا ہے۔

ایڈیٹرلوگ

پہلے میرا خیال تھا کہ ایک 'ہدایت نامہ ایڈیٹران' لکھا جائے۔ آخر جب ہدایت نامہ خاوند، ہدایت نامہ بیوی، ہدایت نامہ والدین' وغیرہ لکھے جا چکے ہوں تو ہدایت نامہ ایڈیٹران لکھنے میں کیا قباحت ہو سکتی ہے؟ لیکن پھر کچھ یوں محسوس ہوا کہ بات ذرا سخن گسترانہ سی ہو جائے گی خود بھی ایڈیٹر رہ چکا ہوں، ایڈیٹروں سے واسطہ بھی زندگی بھر پڑتا ہے اس لیے ایسی شوخ ادائی سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہے چنانچہ مندرجہ بالا نہایت معتدل، مسکین اور غریب نواز عنوان قائم کر دیا۔ اب اس مضمون کو ہدایت کے خیال سے نہیں لکھا جا رہا بلکہ مقصود امر واقعہ کا اظہار کرنا ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ ایڈیٹر لوگ لیکھکوں کے خطوط کے حوالے دے کر اکثر چہلیں اور کلیلیں کیا کرتے ہیں۔ بے شک لیکھکوں کے نام صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں پھر بھی بے چارے لیکھک دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان بے مہار اونٹوں (ایڈیٹروں) کی ناک میں نکیل ڈالنے کی کسی کو جرأت نہیں ہوتی۔

اس قسم کی دم بازی کرنے والوں میں بڑے بڑے سنجیدہ صورت اور فرشتہ طینت بزرگ بھی شامل ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک مولانا صاحب تھے نہایت معقول، سنجیدہ اور

انسان دوست۔ تقسیم ہند سے پہلے بیڈن روڈ پر آپ کا دفتر تھا۔ میرا فلیٹ بھی اسی سڑک پر تھا۔ اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مولانا بھی مندرجہ بالا قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے اور بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں زبانی بھی ادیبوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک ادیب کے بارے میں مجھے بتایا کرتے تھے کہ جب وہ صاحب نئی کہانی لکھ چکتے ہیں تو آ کر مسودہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں: ''لیجئے مولانا! اب کے میں نے کومال کر دیا ہے۔''

اس وقت ان کی برش نما مونچھوں تلے دم بدم پھیلتی ہوئی مسکراہٹ سے شوخی بلکہ شرارت ٹپکتی تھی۔ یہ اشارہ ایک دو دھاری تلوار کا کام کرتا تھا۔ یعنی اپنی تحریر کو خود ہی کمال کا درجہ دینا اور پھر کمال کو کومال کہنا۔

یہ سب درست، لیکن پھر بھی میری ہمدردی تو ادیب کے ساتھ ہی رہے گی کم از کم اس وقت تک جب تک میں بھی کسی سرکاری رسالے کا ایڈیٹر نہیں بن جاتا۔

ہر بشر خاص و عام (آم نہیں ــــ یہ ہدایت اس لیے کہ وہ صاحب کومال ابھی زندہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں' وہ مرے نہیں) کو معلوم ہونا چاہیے کہ لفظ ایڈیٹر میں اس کا آخری حصہ یعنی 'ٹر' بہت اہم ہے۔ یوں تو ایڈیٹر میں بہت سے اوصاف ہونے لازمی ہیں جو کبھی ہوتے ہیں کبھی نہیں ہوتے۔ لیکن ہر ایڈیٹر میں 'ٹر' ضرور ہوتی ہے۔ یہ انکشاف طبع زاد نہیں ہے جو بزرگ اس کے موجد تھے یا ہیں ان کا نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ بہر کیف میں نے انھیں کی خوشہ چینی کی ہے۔ چاہیں تو اسے سرقہ یا چوری بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ــــ سینہ زوری نہیں۔

جیسا کہ ہم رسی کے بارے میں کہتے ہیں کہ رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔ اسی طرح ایڈیٹر کی 'ٹر' گل جائے سڑ جائے لیکن جاتی نہیں۔ گزرنے کو تو ہر کیفیت اس 'ٹر' پر گزرتی ہے لیکن یہ پھر قائم رہتی ہے۔ مر مر کے زندہ ہو جاتی ہے۔

محفوظ ترین 'ٹر' ایک سرکاری رسالے کے ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ مثلاً سرکاری ایڈیٹر مضمون کے لیے پرانے لیکھک سے یوں تقاضا کرے گا۔

''برادرم

تسلیم۔ اب تو افسانہ ملے دیر ہو گئی۔ ذرا جلد التفات فرمائیں۔

مخلص

"............

بڑے سائز کے کاغذ پر یہ چند الفاظ...... یہ دو فقرے، باقی سارا کاغذ خالی۔ خالی نہیں۔ اس میں ایڈیٹر کی 'تڑ' ہے۔ لیکن اس 'تڑ' کی بلائیں لے لینے کو جی چاہتا ہے کیونکہ ان کے وہاں سے لکھک کو معقول (یا نا معقول بہرحال) معاوضہ ملتا ہے۔ سرکاری ایڈیٹر اگرچہ مندرجہ بالا قسم کا گرگ باراں دیدہ نہ بھی ہو تو بھی اس کی چٹھی خاص حدود سے تجاوز نہیں کرنے پاتی۔ مثلاً ایک اور صاحب لکھتے ہیں:

محترمی تسلیم۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ خط کے ہمراہ...... کا ایک شمارہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ رسالہ آپ کو پسند آئے گا۔ ادارہ...... آپ کا ممنون ہوگا اگر آپ پہلی فرصت میں ہمارے لیے اپنی کوئی غیر مطبوعہ کہانی بھیجنے کی تکلیف گوارا کریں۔

براہ کرم خط کی رسید سے مطلع فرمائیں۔

زیادہ آداب

نیاز مند

....

آپ کو مندرجہ بالا خطوط بالکل معقول نظر آئیں گے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن غیر سرکاری ایڈیٹروں کی Approach ذرا مختلف ہوتی ہے۔

یہ ایڈیٹر ڈاکوؤں اور پولیس کی مدد لینے کے سوا باقی سب ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ علم و ادب کا واسطہ دیں گے، تحریک کو بڑھانے اور گرم تر کرنے کے لیے ابھاریں گے، پبلک کے گرتے ہوئے اخلاق کو بلند کرنے کی تلقین کریں گے۔ ادیب کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائیں گے۔ دیگر ادیبوں سے سفارشی خطوط لکھوا کر بھجوائیں گے، دھمکیاں دیں گے، صرف آپ کی خاطر سارا پرچہ سال دو سال تک رو کے رہیں گے، شاعری کریں گے، دور ہی دور سے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں گے، چھوٹی بڑی

بے تکلفیاں کریں گے۔ غرض کہاں تک گنوایا جائے......

اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ وہ یہ کہ سرکاری ایڈیٹر کو محض ایڈٹ کرنا پڑتا ہے یعنی جو ایڈیٹر کا کام ہے وہی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے ایڈیٹروں کو ایڈیٹنگ کم کرنی پڑتی ہے باقی کام بہت زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ پہلی قسم کے ایڈیٹروں کی تعداد بہت کم ہے جیسے آٹے میں نمک بلکہ انھیں ایڈیٹر کہنا ہی بے کار ہے۔ اصل ایڈیٹر تو دوسری قسم کے ہوتے ہیں۔ انھیں وہ وہ کام کرنے پر پڑتے ہیں جن سے خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے۔ کاغذ کتابت، بلاک، چھپائی، بیسیوں منٹے اور گویا ایک انار کو سو بیماریاں لگی ہوتی ہیں۔ بے چارے دن رات بڑی بڑی ٹیڑھی کھیریں پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی لیے میری ہمدردی ہمیشہ دوسری قسم کے ایڈیٹروں پر سایہ فگن رہتی ہے، بالخصوص ایسے ایڈیٹروں سے جو رسالے کے اخراجات کے سلسلہ میں کاغذ، کتابت، بلاک چھپائی، سلائی، سیاہی، نب، قلم — غرض ہر الم غلم چیز کا بجٹ بناتے ہیں لیکن لیکھک کے لیے معاوضے کی بات صاف بھول جاتے ہیں۔ مجھے ان کی اس بھول پر بہت پیار آتا ہے۔ کیوں کہ میں ان کی مجبوریوں کو خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن جب وہ میری مجبوریوں کا خیال نہ کرتے ہوئے میرے پیار اور ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مفت مضمون طلب کرتے ہیں تو مجھے ان کی اس طوطا چشمی پر بڑا دکھ ہوتا ہے۔

ان گشتی مراسلوں کو پڑھ کر میں خوش ہوتا ہوں جن میں چند پرستارانِ ادب و فدایانِ فنونِ لطیفہ و شریفہ ہمالہ ایسی عظیم اور بھاری ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اقدار نو کو جنم دینے، ابھارنے نیز نوجوانانِ وطن کی رگِ حمیت اور جذبۂ حریت کو ابھارنے کے لیے ادب کے اکھاڑے میں اتر آتے ہیں اور آپ کو آفتاب ادب سمجھ کر آپ سے از راہ مولا ایک عدد تازہ بتازہ طبع زاد مضمون کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس قسم کے اصحاب سے ذرا سی بے فکری رہتی ہے خواہ وہ قریب کے کسی قصبے کے رہنے والے بھی ہوں ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایک ڈیڑھ روپیہ خرچ کر کے بہ نفسِ نفیس آ دبوچیں گے۔ ان مالی مجبوریوں کا نہایت خوشگوار نتیجہ نکلتا ہے۔ پرستارانِ ادب محلے کے پنواڑی کی دکان کے ہیرے پھیرے میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور آفتابِ ادب اپنی ڈھیلی چارپائی پر پڑے پڑے غروب ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالاقسم کے ایڈیٹران کی خوش نوائیوں کا جوابی بول تو بس ایک 'چپ' ہے۔ لیکن جو ایڈیٹر لطیف حملے کرتے ہیں وہ ذرا مشکلات بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ خود بھی ادیب ہوتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ ادھر بھی ان کے قدر دان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بھائی بلونت سنگھ

یہ میں جانتا ہوں کہ آپ کسی کو خط نہیں لکھتے۔ لیکن اپنی فطرت کا کیا کروں۔ مجھے یہ ضد ہے کہ میں آپ سے کوئی نہ کوئی کہانی لے کر رہوں گا۔ ہو سکتا ہے جیت آپ کی ہو مگر مجھے اتنا اطمینان تو رہے گا— (آگے وہ دلِ ناتواں' والا مصرع ہے)

''گمراہ' کے افسانہ نمبر کے لیے کوئی کہانی دیجیے۔ پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں۔ آپ کا......''

'آپ' میرے دوست ہیں۔ میرے دل میں ان کے لیے پیار ہی پیار بھرا ہے۔ لیکن کلجگ میں دل کو کون دیکھتا ہے۔ تاہم صبر کرتا ہوں کہ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور میں اپنی عادت سے مجبور۔

ایک اور صاحب کا بیان سنئے:

''بھائی جان! اتنا ظلم تو نہ کیجیے گا۔ پرچہ رکا پڑا ہے اور جب تک آپ کا افسانہ نہیں ملے گا پرچہ پریس کو نہیں جائے گا۔'' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر چلا بھی جائے تو کیا پریس چھپائی وصول نہیں کرے گا— 'شجر' آپ کا پرچہ ہے۔'' بہت خوب! آنے دیجئے 'شجر کو، میں اسے سرماتھے پر جگہ دوں گا۔ اتنی سی بات ہے تو میں اسے سینے سے لگائے لگائے پھروں گا— آخر میں خفا ہو کر لکھتے ہیں:

''برادرم۔ تسلیم۔

اتنی بھی بے نیازی کس کام کی کہ ہمیں مجبوراً یہ لکھنا پڑے:

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب وہ دیدہ و دانستہ غلط کو صحیح وجہ سمجھ رہے ہیں۔ صاحب! بے نیاز ہوتے تو نیاز

میں مضامین بانٹا کرتے۔

ایک اور دوست جو خود بھی لکھتے ہیں بڑی پیاری شخصیت کے مالک ہیں ایڈیٹر بھی ہیں اور ایڈیٹروں والی متعدد قدیم یعنی مزمن بیماریوں کے مریض بھی۔ لکھتے ہیں:

''...... خدا کے لیے دوسرے شمارے کے لیے جلد از جلد اپنی کوئی چیز بھیجو ورنہ میں مر جاؤں گا اور میرے کفن دفن کا انتظام تمھارے ذمہ ہوگا۔ (بھائی میں آج کل آدم خور ہو رہا ہوں۔ مرتا کیا نہ کرتا) اگر تم کہانی نہیں بھیجو گے یعنی جب تک نہیں بھیجو گے اس وقت تک دوسرا شمارہ شایع نہیں ہوگا۔'' (اگر یہ خوش خبری صحیح ثابت ہو تو ایک رات بھوکا رہ کر بھی پانچ پیسے کے بتاشے ہنومان جی یعنی بجرنگ بلی کے مندر میں چڑھاؤں گا۔) ''یہ میرے مرنے مارنے پر اتر آنے کا ثبوت ہے۔'' (ہم تو پہلے ہی قبر کے اندر سے بول رہے ہیں۔ آپ ہی تکلف میں پڑے ہیں۔'')

ایک اور صاحب کا طریق کار یہ ہے کہ خط پہ خط داغتے جاتے ہیں۔ میری نہیں سنتے۔ میں ان کے خطوط بڑے پیار سے فائل میں رکھتا ہوں۔ ان کے انداز سے معصومیت ٹپکتی ہے۔ یوں بھی ایک خط میں دو تین الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتے اس لیے وقت ضائع نہیں ہوتا۔ ایک خط حاضر ہے:

''پیارے!
کہانی لاؤ
تمہارا......''

بمبئی سے ہندی کے ایک سمپادک (ایڈیٹر) صاحب نے بڑے لوچ دار لفظوں میں چٹھی لکھ کر مجھے آگاہ کیا کہ وہ ہندی کا ایک رسالہ نکالنے والے ہیں اس کے لیے میری کہانی کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے انھیں بور کرنے کی بجائے صرف یہ لکھا کہ وہ کہانی کا معاوضہ بتائیں۔ منظور ہوا تو کہانی بصیغۂ وی پی ارسال کر دی جائے گی — اس پر آپ نے ہڑبڑا کر واپسی ڈاک سے جواب بھیجا اور مندرجہ ذیل نکات میرے ذہن نشین کر دیئے: (1) رسالہ چھ ماہ یا ایک سال بعد نکلے گا (2) مضمون ٹائپ کیا ہوا ہونا چاہیے (3) ہر مضمون کی نقل اپنے

پاس رکھ لیں۔ (4) مضمون کی واپسی کے لیے ٹکٹ روانہ کریں (5) کسی مضمون کا اوّل تو معاوضہ نہیں دیا جاسکتا (6) اگر دیا گیا تو مضمون جانچ کر (7) بھگوان کے لیے وی پی کسی صورت میں بھی روانہ نہ کریں۔

ظاہر ہے کہ سمپادک صاحب سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کے رسالے میں لکھنا لیکھک کے لیے سات گھنائیوں والے چورن ہاضمہ کا کام دے گا۔ لیکن یہ بات لکھ کر میں نے ان کے کومل ہردے کو کشٹ دینا اُچت نہیں سمجھا اس لیے جواب دیا:

''پوجیہ سمپادک جی!

آپ نے جو نیم (اصول) بنائے ہیں وہ واقعی بڑے سندر ہیں آپ کا رسالہ بھی نیا ہی ہوگا۔ اگر نکلا تو اس کے لیے اس سے تو میں آپ کی سیوا میں شبھ کامنائیں ہی پیش کرسکتا ہوں۔ آپ ہی کا

............''

لوگ کہتے ہیں دل آنے کے ڈھنگ نیارے ہیں۔ میں کہتا ہوں مضمون ہتیانے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ ایک ایڈیٹر صاحب کے تیور ملاحظہ ہوں— ''............ کے دوسرے شمارے کے لیے کس طرح تم سے کہانی کے لیے کہوں، یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ واہگورو جی کو تم مانتے نہیں ہوگے ورنہ انھیں کی قسم دیتا۔ بیوی بچوں کی قسم دینا اور کھانا کور ذوقی ہوگی......اس صورت میں تم ہی بتاؤ کہ تمھیں کس طرح رام کیا جاسکتا ہے؟''

میلو ڈرامٹک اپروچ کے نمونے ملاحظہ ہوں— ''پیارے بھائی میں ضدی ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن اس چیز کا رہ رہ کر افسوس رہتا ہے کہ

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

دوسرا نمونہ:

''گرامی نامہ ملا۔ آنکھوں سے لگایا، بار بار پڑھا، خدا کا شکر ادا کیا......''

ایک ایڈیٹر صاحب کی ڈانٹ ملاحظہ ہو

''پیارے بلونت!

آخر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ خود ہی خط لکھ کر مطلع کیا کہ افسانہ دو چار روز تک مل جائے گا— اور کئی ہفتے گزر گئے۔ تار بھیجا۔

جواب ندارد'

ایک اور ایڈیٹر صاحب کا چھرتیلا پن ملاحظہ ہو۔

''جس طرح بھی ہو جلدی سے کچھ کیجیے۔ اب اتنے انتظار کے بعد کچھ تو ملنا ہی چاہیے اور میرے لیے اس سے بڑا کوئی انعام نہیں کہ آپ کا افسانہ افسانہ نمبر میں شامل ہو......

غرض جتنے ایڈیٹر اتنی ہی باتیں!

نہ جانے کیسے ایک بار ایک غیر ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب نے ایک کہانی بصیغۂ وی پی منگا لی۔ پسند نہیں آئی۔ لکھا مجھے ہو بہو آپ کی فلاں کہانی کی سی کہانی درکار ہے تال کیا، سوچا کہ ایسے کہانی سوجھے تو لکھ کر بھیج دوں۔ اسی اثنا میں ان کا ایک اور خط آیا......'' پیسے رکھ لیے کہانی بھی نہیں بھیجی۔ اچھا خدا آپ کا بھلا کرے'' میں نے جیسا کہ شریف آدمیوں کا قاعدہ ہے حسب توفیق شرمندگی کا احساس کیا، لیکن ان کی قلندرانہ شانِ بے نیازی سے دل پر وجد طاری ہو گیا۔ چنانچہ شد و مد سے طے کیا کہ ان کی من پسند کہانی ضرور بھیجیں گے۔ لیکن چوتھے ہی روز ان کا ایک اور خط آیا جس میں وہ قریب قریب کراہ اٹھے تھے: ''......تو سچ سچ ہمارے روپے ہضم کر جاؤ گے اور ڈکار بھی نہیں لو گے؟''

میں ڈکار تو کیا لیتا۔ بھیگی بلی بن کر روپے واپس کر دیے۔

ممکن ہے کہ ایک آدھ ایڈیٹر ایسے بھی نکل آئیں جو اعتراض کریں کہ صاحب آپ کے پاس تو سال سال بھر تک پیسے پڑے رہتے ہیں۔ آپ کہانی نہیں بھیجتے۔

تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اعتراض سولھوں آنے ٹھیک ہے۔ قائم کرنے والی دلیل سے میں فوراً قائل ہو جاتا ہوں...... لیکن اب میرا المیہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو ایڈیٹر پیشگی روپے بھیج دیتے ہیں میں ان کی شرافت کا اس حد تک قائل ہو جاتا ہوں کہ تہیا کر لیتا ہوں کہ انھیں شاہکار افسانہ بھیجوں گا۔ پھر جو افسانہ لکھتا ہوں وہ شاہکار دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے انھیں

ارسال نہیں کر پاتا۔ یہاں تک کہ ان کی بھیجی ہوئی رقم کی پائی پائی خرچ ہو جاتی ہے۔ ان کی عنایت کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ اور وہ پھر بھی تقاضے جاری رکھتے ہیں تو دل کو کھلنے لگتا ہے...... رفتہ رفتہ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے بیگار لینا چاہتے ہیں۔ بالآخر انھیں کچھ بھیجنا بالکل مفت کے برابر محسوس ہونے لگتا ہے۔

ایڈیٹروں کے حلیے، عادات و خصائل و دیگر اوصاف اگر چہ مزے دار ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ مشتے از خروارے کے مصداق ایک اچھے خاصے ایڈیٹر صاحب کی حرکت ملاحظہ ہو۔

پچھلے سال لاہور (پاکستان) کے ایک مشہور ادبی رسالے کے مشہور ایڈیٹر الٰہ آباد تشریف لائے۔ غریب خانے پر قیام کیا، طعام کیا ہر معقول و نا معقول کلام کیا— دبی دبی مسکراہٹیں، جھکی جھکی نظریں بڑے اہتمام سے رخصت ہو کر جب بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے بقول منٹو (مرحوم، مغفور بھی) وہاں سے ایک 'ہپ ٹلا' چٹھی لکھی جس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

''بلونت جی!

بخیر و عافیت لاہور پہنچ گیا ہوں۔ ممکن ہے اس اطلاع سے آپ کو خوشی ہوئی ہو......

جیسے میں بارگاہ الٰہی سے دریارِ غیر میں ان کے اللہ کو پیارے ہو جانے کی دعائیں مانگتا رہا ہوں......

یہ مزاحیہ مضمون 'آجکل' جنوری 1957 میں پہلی بار شائع ہوا۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

انٹرویو

کرشن چندر سے ایک انٹرویو

یہ انٹرویو 12/نومبر 1960 اتوار کو قریب گیارہ بجے دن کو لیا گیا۔ انٹرویو کے دوران صرف ہم تین آدمی بلونت سنگھ کے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں جمع ہوئے۔ بلونت سنگھ نے سوال نامہ پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ وہ سوال کرتے رہے اور کرشن چندر لمبے صوفے پر نیم دراز ہو کر سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ میں مختصر نوٹ لیتا رہا۔ ان نوٹس کو بعد میں بلونت سنگھ نے خود درست کیا۔ اس لیے سارے جوابات لفظ بہ لفظ ویسے ہی ہیں جیسے کرشن چندر نے دیے تھے۔ ہاں بعد کے بیس پچیس سوالوں کے جوابات کرشن چندر رک رک کر لکھواتے رہے۔ اس لیے زبان میں تھوڑی بہت تبدیلی کرنی پڑی اور کچھ طویل بیانات کو مختصر بھی کیا گیا۔ کرشن چندر نے بلونت سنگھ کو اس کی اجازت دے دی تھی۔

کرشن چندر کے بارے میں بلونت سنگھ کے تاثرات

"کرشن چندر سے میری ملاقات سترہ اٹھارہ سال پہلے دہلی میں ہوئی۔ ہم دونوں ایک کانفرنس کے سلسلے میں دہلی بلائے گئے تھے۔ اس وقت میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں بی اے کا طالب علم تھا۔ پھر بھی لوگ مجھے ایک ادیب کی حیثیت سے جاننے لگے تھے...... کرشن چندر ان

دنوں اپنی شہرت کی بلندی پر تھے اور وہ میری کچھ کہانیوں کی بھی بہت تعریف کر چکے تھے۔ میرے دل میں ان کے لیے گہری محبت اور احترام کا جذبہ تھا۔

کانفرنس کے بعد میں نے انھیں کارونیشن ہوٹل فتح پوری میں بلایا، جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کرشن چندر نے میری محبت کی قدر کی، اور کئی دعوتوں کو ٹھکرا کر میرے پاس چلے آئے۔ ہم نے کھانا ایک ساتھ ہی کھایا۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ ہم لوگ ہوٹل کی چھت پر تاروں کی چھاؤں میں بیٹھے ڈیڑھ دو گھنٹے تک کئی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ ان دنوں ان کی دو تین بہت ہی اچھی کہانیاں چھپی تھیں۔ میں نے یہاں تک کہا کہ:

''میرے خیال میں آپ اپنی بہترین کہانیاں لکھ چکے ہیں۔ اور مجھے امید نہیں کہ آپ اس سے بہتر کچھ اور پیش کر سکیں گے۔''

اس پر کرشن چندر نے بڑی نرمی سے کہا کہ میں کوشش کروں گا کہ اور اچھی کہانیاں لکھ سکوں:

مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے کہ میری یہ پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی، اور آج ہم کرشن چندر کو پہلے سے بھی زیادہ بلندی پر دیکھ رہے ہیں۔

اب کرشن چندر 46 برس کے ہیں۔ دیکھنے والے خود ہی سمجھتے ہیں کہ جب ہمیں اس وقت ان پر اتنا پیار آتا ہے، تو اس وقت — جب آتش جواں تھا — ان پر سبھی کو کتنا پیار آتا ہوگا۔ دیکھنے میں مجھے کرشن چندر کی دوہری شخصیت نظر آتی ہے خاص طور پر ان آنکھوں سے یوں لگتا ہے، جیسے ان کے پیچھے اور آنکھیں ہوں۔

پچھلے دو چار دنوں میں جب کبھی ہم دونوں اکیلے ہوئے تو مجھے ان کی باتوں سے محسوس ہوا کہ کرشن چندر کا دل اب بھی جوان ہے۔ ان کے دل میں اب بھی کالج کے لڑکوں کا سا حوصلہ اور ان ہی کی سی امنگیں اور ترنگیں موجود ہیں۔ ہنسی مذاق اور طنز کرنے کی قدرت ان میں اب بھی کافی ہے۔

دو تین دن پہلے کی بات ہے، جب ایک ٹی پارٹی میں جس میں الٰہ آباد کے پچیس تیس ادب دوست موجود تھے، باتوں باتوں میں اشک (اوپندر ناتھ اشک) نے شکایت کی کہ

میری ایک کہانی کسی نے پریم چند کے نام سے چھاپ دی ہے— اس پر کرشن چندر بڑے بھولے پن سے بولے۔

''اشک جی، اس کی شکایت تو پریم چند جی کو ہونی چاہئے تھی، آپ کو کیوں شکایت ہے؟''

اس پر ساری محفل مارے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

جب کرشن چندر بلونت سنگھ کے کمرے میں آئے، تو بائیں کچھ عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کرشن چندر نے برجستہ بارودت کی رنگین تصویر دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر کہا:

''یار تو بڑی سونڑی سونڑی کڑیاں (لڑکیاں) دیاں تصویراں لائیاں دیں۔''

اس کے بعد ناشتے کے لیے پوچھا گیا تو کرشن چندر بولے۔

''میں صرف ایک کپ چائے پیوں گا، ناشتہ تو میں کر آیا ہوں۔''

بلونت سنگھ نے یاد دلایا کہ: صبح 8/ بجے سے تو میں آپ کے پاس بیٹھا تھا، آپ نے ناشتہ کب کیا؟ (کرشن چندر اشک صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں سے بلونت سنگھ انھیں جا کر لائے تھے۔)

اس پر کرشن چندر چونک کر بولے: ''ارے ہاں، میں نے ناشتہ تو کیا ہی نہیں۔''

ان کے لیے چائے، ٹوس اور آملیٹ منگایا گیا۔ وہ ناشتہ بھی کرتے جارہے تھے اور سوالوں کے جوابات بھی دیتے جارہے تھے۔

یہ انٹرویو 107 منٹ تک جاری رہا۔ انٹرویو کے دوران کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بات سے بات نکل آتی ہے۔ لیکن زیادہ تر دونوں ایک حد سے باہر نہیں گئے۔ بلونت سنگھ نے سوال کچھ اس ڈھنگ سے چنے تھے کہ ان سے کرشن چندر کی شخصیت اجاگر ہو اور ان کے خیالات مختلف موضوعات پر معلوم ہوسکیں۔ کرشن چندر بھی تقریر کرنے کی بجائے سوالوں کے جواب دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی کبیدگی اور شوق سے جواب دیے۔ وہ جھنجھلائے اور نہ کسی سوال سے انھیں الجھن ہوئی۔ (ترجمہ ونوٹ: قیصر شمیم)

بلونت سنگھ: آپ کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی؟ آپ نے کس عمر میں افسانہ نگاری شروع کی؟

کرشن چندر: میری پیدائش سنہ 1914 میں لاہور میں ہوئی۔ میں نے افسانہ نگاری 23 سال کی عمر سے شروع کی۔

بلونت سنگھ: آپ کے شروع کے افسانوں میں کشمیر کا ذکر اکثر آتا ہے وہاں آپ کتنے دنوں تک رہے؟

کرشن چندر: میں تین سال کی عمر میں ہی کشمیر چلا گیا تھا۔ میرا بچپن اور میری جوانی کا ایک حصہ وہیں پر گذرا ہے۔ پھر میں نے دسویں کا امتحان لاہور میں پاس کیا۔ اس لیے میری زندگی پر کشمیر کا نہ مٹنے والا اثر ہے۔

بلونت سنگھ: کشمیر کے بعد آپ کی لاہور کی زندگی کیسی رہی؟

کرشن چندر: لاہور میں میری کالج کی زندگی بڑی مصروفیت کی زندگی تھی۔ مجھے ہر طرح کے مسئلوں سے دلچسپی رہی۔ میں لاہور اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا بڑا جوشیلا ممبر تھا۔ ملک کی فضا کے باعث کالجوں، خصوصاً کالج میں جو ہڑتالیں ہوئیں ان میں بھی آگے آگے رہا۔

بلونت سنگھ: جب ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں آپ دہلی گئے، تو وہاں رہنے کا آپ کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہاں آپ کے خیالات میں کوئی تبدیلی ہوئی؟

کرشن چندر: جی ہاں۔ یہ میرا پہلا موقع تھا جب تک میں پنجاب میں رہا۔ میرا یہ خیال تھا کہ پنجاب کے باہر اچھے ادیب نہیں ہیں۔ مگر جب میں دلّی پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ پنجاب کے باہر بھی نہ صرف اچھے ادیب ہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں!"

بلونت سنگھ: جب آپ کے افسانوں کی دھوم مچی، وہ دھوم اب تک جاری ہے، اس کا راز کیا ہے؟ یعنی آپ اپنی کامیابی کا راز کس بات میں سمجھتے ہیں؟

کرشن چندر: میرے کامیابی کا راز غالباً اس بات میں ہے کہ میں اپنی تخلیقات میں آج کے مسئلے لیتا ہوں۔ وہ کیوں اور کیسے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیا ہے؟ یہ

میری ایک کہانی کسی نے پریم چند کے نام سے چھاپ دی ہے— اس پر کرشن چندر بڑے بھولے پن سے بولے۔

''اشک جی، اس کی شکایت تو پریم چند جی کو ہونی چاہئے تھی، آپ کو کیوں شکایت ہے؟''

اس پر ساری محفل مارے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

جب کرشن چندر بلونت سنگھ کے کمرے میں آئے، تو بائیں کچھ عورتوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کرشن چندر نے برجستہ بارودت کی رنگین تصویر دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر کہا:

''یار تو بڑی سوہنڑی کڑیاں (لڑکیاں) دیاں تصویراں لائیاں دیں۔''

اس کے بعد ناشتے کے لیے پوچھا گیا تو کرشن چندر بولے۔

''میں صرف ایک کپ چائے پیوں گا، ناشتہ تو میں کر آیا ہوں۔''

بلونت سنگھ نے یاد دلایا کہ: صبح 8/ بجے سے تو میں آپ کے پاس بیٹھا تھا، آپ نے ناشتہ کب کیا؟ (کرشن چندر اشک صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں سے بلونت سنگھ انھیں جا کر لائے تھے۔)

اس پر کرشن چندر چونک کر بولے: ''ارے ہاں، میں نے ناشتہ تو کیا ہی نہیں۔''

ان کے لیے چائے، ٹوس اور آملیٹ منگایا گیا۔ وہ ناشتہ بھی کرتے جا رہے تھے اور سوالوں کے جوابات بھی دیتے جا رہے تھے۔

یہ انٹرویو 107 منٹ تک جاری رہا۔ انٹرویو کے دوران کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بات سے بات نکل آتی ہے۔ لیکن زیادہ تر دونوں ایک حد سے باہر نہیں گئے۔ بلونت سنگھ نے سوال کچھ اس ڈھنگ سے چنے تھے کہ ان سے کرشن چندر کی شخصیت اجاگر ہو اور ان کے خیالات مختلف موضوعات پر معلوم ہو سکیں۔ کرشن چندر بھی تقریر کرنے کی بجائے سوالوں کے جواب دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی کبیدگی اور شوق سے جواب دیے۔ وہ جھنجھلائے اور نہ کسی سوال سے انھیں الجھن ہوئی۔ (ترجمہ و نوٹ: قیصر شمیم)

بلونت سنگھ: آپ کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی؟ آپ نے کس عمر میں افسانہ نگاری شروع کی؟

کرشن چندر: میری پیدائش سنہ 1914 میں لاہور میں ہوئی۔ میں نے افسانہ نگاری 23 سال کی عمر سے شروع کی۔

بلونت سنگھ: آپ کے شروع کے افسانوں میں کشمیر کا ذکر اکثر آتا ہے وہاں آپ کتنے دنوں تک رہے؟

کرشن چندر: میں تین سال کی عمر میں ہی کشمیر چلا گیا تھا۔ میرا بچپن اور میری جوانی کا ایک حصہ وہیں پر گذرا ہے۔ پھر میں نے دسویں کا امتحان لاہور میں پاس کیا۔ اس لیے میری زندگی پر کشمیر کا نہ مٹنے والا اثر ہے۔

بلونت سنگھ: کشمیر کے بعد آپ کی لاہور کی زندگی کیسی رہی؟

کرشن چندر: لاہور میں میری کالج کی زندگی بڑی مصروفیت کی زندگی تھی۔ مجھے ہر طرح کے مسئلوں سے دلچسپی رہی۔ میں لاہور اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا بڑا جوشیلا ممبر تھا۔ ملک کی فضا کے باعث کالجوں، خصوصاً کالج میں جو ہڑتالیں ہوئیں ان میں بھی آگے آگے رہا۔

بلونت سنگھ: جب ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں آپ دہلی گئے، تو وہاں رہنے کا آپ کا یہ پہلا موقع تھا۔ وہاں آپ کے خیالات میں کوئی تبدیلی ہوئی؟

کرشن چندر: جی ہاں۔ یہ میرا پہلا موقع تھا جب تک میں پنجاب میں رہا۔ میرا یہ خیال تھا کہ پنجاب کے باہر اچھے ادیب نہیں ہیں۔ مگر جب میں دلّی پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ پنجاب کے باہر بھی نہ صرف اچھے ادیب ہیں بلکہ اچھے انسان بھی ہیں!"

بلونت سنگھ: جب آپ کے افسانوں کی دھوم مچی، وہ دھوم اب تک جاری ہے، اس کا راز کیا ہے؟ یعنی آپ اپنی کامیابی کا راز کس بات میں سمجھتے ہیں؟

کرشن چندر: میرے کامیابی کا راز غالباً اس بات میں ہے کہ میں اپنی تخلیقات میں آج کے مسئلے لیتا ہوں۔ وہ کیوں اور کیسے پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج کیا ہے؟ یہ

میں ایسے ڈھنگ سے لکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ عام آدمی کی سمجھ میں آسانی سے آجائیں۔

بلونت سنگھ: تین چار دن پہلے دونوں کی پرائیوٹ گفتگو میں آپ نے اشارہ کیا تھا کہ دوسرے ملکوں میں ادیبوں کو بڑی عزت ملتی ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ اور روشنی ڈالیں گے؟

کرشن چندر: ہمارے ملک میں غلامی سے پہلے ادیبوں کی عزت کی بڑی اہمیت رہی۔ درباروں میں بھی انھیں اچھے اچھے رتبے حاصل تھے۔ مگر جب انگریز آئے تو ادیبوں کی عزت پس پشت ڈال دی گئی۔ ان کے زمانے میں ایک آئی، سی، ایس کو ایک ادیب سے کہیں زیادہ عزت حاصل ہوئی۔ جب سے ہم آزاد ہوئے ہیں' تب سے ادیبوں کی عزت کچھ بڑھنے لگی ہے۔ لیکن ابھی اس سلسلہ میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

بلونت سنگھ: لکھتے وقت آپ کیسا ماحول پسند کرتے ہیں؟

کرشن چندر: اول تو میری ضرورتیں ہیں وہ پوری ہونی چاہئیں لکھنے کا کمرہ الگ چاہتا ہوں، جہاں کوئی آنہ سکے۔ میں بہت عمدہ کاغذ پر لکھنا پسند کرتا ہوں، جس کا رنگ ہلکا نیلا یا نیلا ہونا چاہیے۔ عمدہ کاغذ کی تلاش میں میں سارا شہر چھان مارتا ہوں — اچھے کاغذ پر میرا قلم بھی اچھی طرح چلتا ہے۔ عام طور پر میں صبح کے وقت لکھتا ہوں۔ رات کو بھی لکھا کرتا ہوں۔ لیکن پیٹ بھرنے کے ایک دم بعد لکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو سوتے سے جوں ہی آنکھ کھلتی ہے میں اٹھ کر لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر میں ناشتہ داشتہ کرنا بھی بھول جاتا ہوں۔

بلونت سنگھ: کیا آپ ترقی پسند ادب کو کچھ خاص حدوں تک محدود کریں گے؟

کرشن چندر: ترقی پسند ادب اتنا ہی غیر محدود ہے جتنی کہ زندگی۔

بلونت سنگھ: منٹو، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، اوپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی سے

پہلے پہل کب اور کہاں ملے تھے؟

کرشن چندر: منٹو سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ لاہور میں ایک بار منی آرڈر کرانے گیا، تو کھڑکی کے اندر راجندر سنگھ بیدی بیٹھے نظر آئے۔ یہ بڑی دلچسپی ملاقات تھی۔ اسی طرح اشک سے بھی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ رہی۔ لاہور میں میں نے ایک افسانہ کمرہ نمبر 44، لکھا تو ہوسٹل میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے کمرہ نمبر 44 کے سامنے ہی آ نکلے۔ ان کا خیال تھا کہ افسانے کے مطابق میرا اپنے رہنے کا کمرہ بھی نمبر 44 کا ہی ہوگا۔ ان کا خیال درست نکلا۔ دیوندر ستیارتھی سے لاہور میں سنہ 1937 کے لگ بھگ ہی ملا۔ عصمت سے دہلی میں ملاقات ہوئی، جب کہ میں ریڈیو میں ملازم تھا۔

بلونت سنگھ: اردو کے نئے ادیبوں میں کون سے ادیب ہیں جنھوں نے خاص طور پر اردو ادب میں زندگی کا نیا زاویۂ نگاہ پیش کیا؟ یا جنھوں نے کسی خاص قوم کی زندگی کو پہلی بار اردو ادب میں پیش کیا؟

کرشن چندر: (کچھ وجوہ کی بنا پر سوال کا جواب نہیں دیا)

بلونت سنگھ: آپ پر اپنی جوانی کے دنوں میں کن کن مصنفوں کا گہرا اثر پڑا ہے؟ اس میں ملکی یا غیر ملکی کی قید نہیں۔

کرشن چندر: مجھ پر ٹیگور، پریم چند اور غالب کا گہرا اثر پڑا ہے، اور غیر ملکی ادیب جن کا مجھ پر اثر پڑا ہے یہ ہیں۔ چیخوف بالزاک، ٹالسٹائی، گورکی، دستوئسکی، راولا، وکٹر ہیوگو، روے رولاں، شیکسپیئر

بلونت سنگھ: اب اس عمر میں آپ اردو کے کن ادیبوں کو اہمیت دیتے ہیں؟

کرشن چندر: اس سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔

بلونت سنگھ: بھارت کے بٹوارے کے بعد آپ کے گٹ کے علاوہ اردو میں کچھ اچھے ادیب آئے ہیں؟

کرشن چندر: جی ہاں، شوکت صدیقی، رام لعل، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، واجدہ تبسم،

غیاث احمد گدی۔

بلونت سنگھ: بٹوارے کے بعد پاکستان نے افسانے اور ناول کے میدان میں کسی بڑے ادیب کو جنم دیا ہے؟

کرشن چندر: کچھ اچھے ادیب آئے ہیں جیسے اشفاق احمد۔

بلونت سنگھ: آپ کے خیال میں کیا بٹوارے سے اردو ادب متاثر ہوا ہے؟

کرشن چندر: جی ہاں...... بٹوارے سے پہلے اردو ادب نے اپنی ایک خاص جگہ بنالی تھی۔ لیکن بٹوارے سے ادیبوں کے ساتھ ہی پڑھنے والوں کا بھی بٹوارہ ہوگیا، اور اردو کی ترقی رک گئی۔ پورے بھارت میں اردو کا دوسری زبانوں پر بھی خاصا اثر پڑ رہا تھا۔ لیکن بٹوارے کے بعد اردو ہی سب سے زیادہ گھاٹے میں رہی اور اس کو بھارت کی تمام زبانوں سے نیچا درجہ ملا۔

بلونت سنگھ: کیا آج پاکستان میں بھارت کے اردو ادیبوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے؟

کرشن چندر: جی ہاں، مثال کے طور پر کراچی یونیورسٹی نے طالب علمانہ زندگی کا ایک آفیشل سروے کیا۔ جب طالب علموں سے ادیبوں کے بارے میں سوال ہوا تو انھوں نے فکشن میں مجھے اور نان فکشن، میں ابوالکلام آزاد کو پسند کیا۔

بلونت سنگھ: بھارت میں اردو کے ادیبوں کے مستقبل کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

کرشن چندر: ادیب کا مستقبل اس کی زبان کے مستقبل پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر اردو ترقی کرے گی تو اردو ادیب بھی۔ اور اگر اردو خطرے میں پڑ جائے گی تو اس کا ادیب بھی۔

بلونت سنگھ: کیا بھارتی حکومت کا رویہ ادب کے بارے میں اطمینان بخش ہے؟

کرشن چندر: یہ سچ ہے کہ بھارتی حکومت انگریزوں کے مقابلے میں ادیبوں کو زیادہ عزت دے رہی ہے۔ ہر سال ادیبوں کو خطاب بھی دیے جاتے ہیں۔ حکومت نے

ادیبوں کے لیے ساہتیہ اکادمی بھی بنائی ہے اور ایک بک ٹرسٹ بھی کھولا ہے۔ اب اس بات کا احساس تو ہو چلا ہے کہ ادیب سماج کا ایک مفید عضو ہے۔ مگر ادیبوں کی مالی حالت کو سدھارنے کے لیے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا گیا، اس کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

بلونت سنگھ: کیا ساہتیہ اکادمی نے کوئی ٹھوس کام کیا ہے؟ کیا آپ اکادمی کو کوئی مشورہ دینا پسند کریں گے؟

کرشن چندر: ہاں، کچھ تو کر ہی رہی ہے۔ لیکن میں اس کے فیصلوں سے اور اس کے کام کی رفتار سے مطمئن نہیں ہوں۔ میری شکایت یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی ایک خاص قسم کے خیالات کے ادیبوں ہی کو زیادہ ابھارتی ہے، اور ترقی پسند رجحان کے ادیبوں سے چاہے وہ کسی بھی صوبے کے ہوں سوتیلے بیٹوں کا سا سلوک کرتی ہے۔

بلونت سنگھ: راجندر سنگھ بیدی فلمی زندگی کو اپنی ادبی زندگی کی موت سمجھتے ہیں اور اس حالت سے غیر مطمئن ہیں لیکن آپ فلمی زندگی گذارتے ہوئے بھی خاص لکھ رہے ہیں۔ آپ کو اس سے متعلق کچھ کہنا ہے؟

کرشن چندر: اس سلسلے میں میں صرف یہی کہنا چاہوں گا کہ فلمی ماحول ہی نہیں، بلکہ پورے سماج کا ماحول بگڑا ہوا ہے اور ہمیں اس ماحول میں روزی کے لیے لڑتے ہوئے اچھے ادب کی تخلیق کرنی ہے۔ بیدی کے خیال کو میں بالکل ٹھیک نہیں مان سکتا۔ کیوں کہ انہوں نے بھی تو ابھی ابھی ایک نیا ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' لکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ ان کی بہت اہم تخلیق ہے۔

بلونت سنگھ: آپ کے خیال میں اگر ایک ادیب فلمی دنیا سے الگ رہ کر اپنی روزی کما سکے تو وہ حالت زیادہ اچھی رہے گی؟

کرشن چندر: کوئی ضروری نہیں۔ یہ تو ادیب کے حالات پر منحصر ہے۔ اگر دوسری جگہ فلموں سے بھی بری حالت ہو تو وہ کیا کرے گا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ ادیب فلمی ماحول

سے دور ہٹ کر بہتر ادب کی تخلیق کر سکیں۔

بلونت سنگھ: کیا ایک ادیب فلمی دنیا کو کچھ ٹھوس فائدہ پہنچا سکتا ہے؟

کرشن چندر: ٹھوس تو نہیں، لیکن تھوڑا بہت فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ ہندستانی فلم انڈسٹری میں اربوں روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اتنی بڑی انڈسٹری میں کچھ گنے چنے ادیب کیا تبدیلی لا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ملک میں ایک بڑی سماجی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

بلونت سنگھ: کیا ہماری فلمی دنیا ادیبوں سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہے؟

کرشن چندر: نہیں!

بلونت سنگھ: فلمی ڈائرکٹر شری چوپڑا نے ایک بار لکھا تھا کہ ادیبوں کی کوئی تخلیق ایسی نہیں ہوتی جسے کامیاب فلم کی شکل میں پیش کیا جا سکے۔ کیا زیادہ تر ڈائرکٹروں کی یہی رائے ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

کرشن چندر: جی ہاں، اکثر ڈائرکٹروں کی یہی رائے ہے۔ لیکن ان میں سے پورے طور پر متفق نہیں ہوں۔ یہ سچ ہے کہ آج کل جیسی فلمی کہانیاں وہ بناتے ہیں، ہماری ادبی کہانیاں ویسی نہیں ہیں، نہ ہو سکتی ہیں، ہم لوگ اپنے ادب میں زندگی کا جو روپ دیتے ہیں اور جیسا تبصرہ کرتے ہیں، اسے یہاں کا فلم کار قبول نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ایک بہت بڑی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

بلونت سنگھ: بھارتی سنسر بورڈ کا دوسرے ملکوں کے سنسر بورڈ سے موازنہ کرتے ہوئے آپ کی بھارتی سنسر کے بارے میں کیا رائے؟

کرشن چندر: ہمارے یہاں کے سنسر بورڈ میں اکثر ایسے ممبر لیے جاتے ہیں جو اس زبان سے ہی ناواقف ہوتے ہیں جس زبان کی فلمیں وہ سنسر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اکثر ایسی بچکانہ غلطیاں کر ڈالتے ہیں جن پر بچوں کو بھی ہنسی آئے۔ بھارت کی زیادہ تر فلمیں اردو میں تیار ہوتی ہیں اور سنسر بورڈ کے ممبران اس زبان سے کورے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی فلمیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے سنسر

بورڈ کے لوگ زیادہ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، اور انسانی کلچر کے بارے میں زیادہ بیدار ہوتے ہیں۔

بلونت سنگھ: ادبی تخلیق کا ایک پہلو ادیب کے دل کی مسرت بھی ہوتی ہے۔ آپ اس پہلو کو کوئی خاص اہمیت دیتے ہیں؟

کرشن چندر: میں اس پہلو کو بہت بڑی اہمیت دیتا ہوں۔

بلونت سنگھ: آپ کی تخلیقات میں ایک خاص قسم کی تازگی پائی جاتی ہے۔ یہ چیز بغیر دماغی تازگی کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کی دماغی تازگی کا کیا راز ہے؟

کرشن چندر: مجھے اپنے زیادہ تر افسانوں کا نہ پلاٹ یاد ہے اور نہ نام۔ اکثر میں یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میں نے کیا لکھا تھا' جہاں تک ذہنی شگفتگی یا تازگی کا تعلق ہے وہ میرے ذہن میں اس خیال سے آتی ہے کہ میں انسان کا مستقبل بہت روشن دیکھتا ہوں۔ ممکن ہے یہی روشنی میری ذہنی شگفتگی کا سبب ہو۔ میرے ذہن میں دکھ اور درد کے بڑے لمبے لمبے سائے آتے ہیں۔ لیکن میں فوراً ہی اس روشنی کی طاقت حاصل کر کے انھیں دور کر دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ادیب کا زندگی کے سلسلے میں نقطہ نظر ہی یاسیت پسند ہو تو اس میں ذہنی شگفتگی کہاں سے آئے گی؟

بلونت سنگھ: ادیبوں کی زندگی میں حسن اور عورت کیا خاص پارٹ ادا کرتے ہیں؟

کرشن چندر: ادیب دوسروں کی نسبت جنس اور عورت کے معاملے میں گہری نظر اور بہتر جمالیاتی احساس رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔

بلونت سنگھ: اکثر ادیبوں کی زندگی میں عورت کی محبت کی کمی سے یا عورت کی بے وفائی سے ایک گہرا فرسٹریشن پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟ ایک ناکام عاشق کی رائے میں عورتوں کو محبت کرنے کا شعور کبھی نہیں آئے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

کرشن چندر: محبت کی محرومی سے کسی انسان کے دل میں فرسٹریشن کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ آج ادیب ہی نہیں، بلکہ کروڑوں لوگ محبت سے محروم ہیں۔ ان کی دنیا جگمگاتی نہیں۔ میرا ذاتی تجربہ ہے، اگر غم جاناں کو غم دوراں میں بدل دیا جائے غم کی لذت بڑھ جاتی ہے اور اس کی گھٹن کم ہو جاتی ہے، اور اپنا دکھ دوسرے کا دکھ معلوم ہونے لگتا ہے اور اس طرح سے اس فرسٹریشن کا تدارک کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں مردوں سے زیادہ عورت کے دل میں محبت کا شعور ہوتا ہے۔ عورت تو ہے ہی سراپا محبت۔ اس کی زندگی محبت سے شروع ہوتی ہے اور محبت پر ہی ختم ہو جاتی ہے' لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں مرد کی دنیا بہت بڑی ہے، وہ محبت سے محروم بھی ہو تو دس اور طریقوں سے اپنی زندگی بنا سکتا ہے لیکن عورت کیا کرے؟

بلونت سنگھ: ادیب کی مالی حالت کو دیکھتے ہوئے کیا ایک ادیب کو شادی کرنا ضروری ہے؟

کرشن چندر: اگر ایک ادیب صرف ایک ادیب ہی رہنا چاہتا ہے، اسی سے اپنی روزی کمانا چاہتا ہے اور اسی میں ڈوب جانا چاہتا ہے تو بھارت میں آج جو حالات ہیں ان کے پیش نظر اسے شادی نہیں کرنی چاہیے۔

بلونت سنگھ: کیا شادی تخلیقی کام میں مددگار ثابت ہوتی ہے؟

کرشن چندر: یہ تو شادی شادی پر منحصر ہے۔

بلونت سنگھ: لکھنے والوں کو اپنے افسانوں، نظموں، ناولوں وغیرہ سے ایک چیز کو تخلیق کرنے کی مسرت اور سکون ملتا ہے کیا ان کے لیے اتنا کافی نہیں ہے؟ بچے اور دوسرے قسم کے گھریلو مسئلے پیدا کرنا ان کے لیے ضروری ہے؟

کرشن: اس کے بارے میں جو کچھ میں اوپر کہہ چکا ہوں وہی کافی ہوگا۔

بلونت سنگھ: اپنی تخلیقی قوت کے بارے میں اب آپ مایوس تو نہیں ہیں؟

کرشن: ابھی تو نہیں ہوں۔

بلونت سنگھ: جس رفتار سے آپ لکھتے ہیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنا آپ کے لیے

کچھ زیادہ زحمت کا کام نہیں ہے۔

کرشن چندر: سب سے زیادہ خوشی مجھے ادب کی تخلیق میں ہی ہوتی ہے۔

بلونت سنگھ: آپ ایک افسانہ کتنی دیر میں لکھ لیتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی نشست میں افسانہ ختم کر دیتے ہیں۔

کرشن چندر: ہاں میں ایک ہی نشست میں تین سے پانچ گھنٹے تک کے اندر افسانہ ختم کر لیتا ہوں۔

بلونت سنگھ: اپنے ناولوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

کرشن چندر: سچ پوچھا جائے تو میں ابھی تک اپنی کسی تخلیق سے پورے طور پر مطمئن نہیں ہوں، گو ناولوں کے مقابلے میں اپنے کچھ افسانوں سے زیادہ مطمئن ہوں۔ لیکن سوچتا ہوں کہ میرے قلم سے ایک ایسا ناول بھی ضرور نکلے گا جسے میں اپنے دل کی خوشی سے دس بار پڑھ سکوں گا۔

بلونت سنگھ: لکھنے کے علاوہ فن کے کسی اور میدان میں آپ کو دلچسپی ہے؟

کرشن چندر: مجھے مصوری اور موسیقی دونوں سے بے حد دلچسپی ہے، بلکہ میری فنی زندگی پہلے مصوری سے ہی شروع ہوئی تھی اور مصوری سے پہلے موسیقی سے۔ کسی زمانے میں بچپن میں اسکول اور کالج میں گایا بھی کرتا تھا۔ لیکن بعد میں دونوں چھوڑ کر ادب کی طرف چلا آیا۔ کیوں کہ محسوس ہوا کہ ادب کے میدان میں زیادہ بہتر کام کر سکتا ہوں۔ لیکن میرا ارادہ ہے کہ فرصت میں کبھی کبھی پھر سے پینٹنگ کیا کروں۔

بلونت سنگھ: آپ نے میرے ساتھ ایک گفتگو میں بالزاک کو ٹالسٹائی اور دوستوئسکی سے بھی اونچا بتایا تھا، کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

کرشن چندر: ہاں یہ میری ذاتی رائے ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بالزاک نے War and peace اور Karanzor نے Brother جیسا کوئی بڑا ناول نہیں لکھا۔ لیکن اس نے بیس پچیس مضمون اتنے اونچے معیار کے لکھے ہیں کہ انھیں پڑھ

کر بالزاک کو دنیا کے ناول نگاروں میں سرفہرست سمجھنا ہی پڑتا ہے۔

بلونت سنگھ: جیمس جوائس، کافکا، ورجینیا وولف، کیتھرین مینسفیلڈ، زاوا کوف، سارترے، پروست اسٹک بیڈر مین اور پاسترناک کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

کرشن چندر: یولیسیس میں جیمس جوائس نے سمفنی کی تکنیک کا تجربہ کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ بالکل ناکامیاب رہا ہے اس تکنیک کو رومے رولاں نے بہت بڑی کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ کافکا کی کچھ کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں جن میں اس نے سماج پر طنز کیا ہے۔ یوں مجھے کافکا زیادہ پسند نہیں ہے۔ ورجینیا وولف بہت ہی Sensitive فن کارہ تھی۔ ادب کے فن میں اس نے Stream of Consciousness کو بڑی کامیابی سے برتا اور یہ اس کے ادب کا سب سے روشن پہلو ہے۔ لیکن موضوع کے انتخاب سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ اور ان کا یاسیت پسند نقطۂ نظر بھی مجھے پسند نہیں۔

کیتھرین میلسفیلڈ کو میں ایک اعلیٰ پائے کی افسانہ نگار سمجھتا ہوں۔ زاواکوف مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں اسے ایک ناکام اور غلیظ ادب کا مبلغ سمجھتا ہوں۔ سارترے ہمارے عہد کا بہت بڑا فن کار ہے۔ میں اس کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اس کا اسلوب بھی مجھے پسند ہے۔ اس کی نظر بھی بہت وسیع ہے۔ لیکن اس کی متلون مزاجی کبھی کبھی بہت کھلتی ہے۔ میں اسے آج کے فرانسیسی ادب کے بہترین نمائندوں میں رکھتا ہوں۔ پروست نے جس طرح سے انسانی لاشعور کی جھلکیاں اپنے ادب میں دکھائیں اس کا میں بے حد مداح ہوں، اور اسے انسانی ادب کا ایک کارنامہ سمجھتا ہوں۔ لیکن اس نے جیسے باہر کی دنیا سے آنکھیں بند کر کے صرف دل کی دنیا دکھائی ہے۔ اس سے مجھے شدید اختلاف ہے۔ بہر حال اپنے محدود دائرے میں رہتے ہوئے پروست نے اعلیٰ ادب پیدا کیا۔ اور اس کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اسٹک بیڈر مین کی کوئی تخلیق میری نظر سے نہیں گذری۔ بحیثیت ایک شاعر

پاسترناک کا درجہ میں بہت اونچا مانتا ہوں۔ لیکن ناول ڈاکٹر ژواگو (جس پر اسے نوبل پرائز ملا ہے) سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ میں اس کی سیاست کو بھی پسند نہیں کرتا۔

بلونت سنگھ: کچھ عرصے پہلے Lawrance Durrel نے کہا تھا کہ:

"It is only with great vulgarity that you can assure real refinement, only out of bawdry that you can get tender ness"

آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

کرشن چندر: مجھے لفظ Only پر اعتراض ہے۔ ادب میں Refinement اور Tenderness کو لانے کے لیے ایک ہزار ایک طریقے ہیں۔ ایک گھڑا گھڑایا فارمولا نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی Vulgarity کے فنی استعمال سے بھی Refinement پیدا ہوتا ہے اور Bawdry کے قبول کرنے سے Tendernees بھی نکلتی ہے اور کبھی کبھی یہ بہت موثر ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی۔

Great Vulgarity..... Great obscenity.

بن کر رہ جاتی ہے۔ فن کے اظہار کا کوئی ایک ڈھنگ نہیں ہے۔

بلونت سنگھ: بعض ماہرین نفسیات Creative Urge کو ایک قسم کا Neurasis سمجھتے ہیں۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

کرشن چندر: نہیں!

اس کے بعد بہت دیر تک سوچتے رہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ سوال دلچسپ ہے۔ ہوسکا تو اس کے بارے میں بعد کو کچھ بھیجوں گا۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے کچھ لکھ کر بھیجا نہیں۔

بلونت سنگھ: آپ نے افسانے کے فارم پر کافی توجہ دی ہے۔ کیا آپ یہ تجربے کے طور پر

کرتے ہیں، یا آپ سمجھتے ہیں کہ بعض موضوع ایک خاص فارم میں ہی اجاگر ہو سکتے ہیں؟

کرشن چندر: اس پر کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ یہ سوال ایک Mentral Process سے تعلق رکھتا ہے۔ عام طور پر میں یہی سمجھتا ہوں کہ موضوع ہی غیر شعوری طور پر اپنا فارم ساتھ لے کر آتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی میں نے کسی افسانے کو محض ایک فنی شعور کی بنا پر شروع کیا۔ لیکن جب وہ افسانہ پورا ہوا تو یوں لگا کہ اس موضوع کے لیے بہترین فنی اظہار یہی ہو سکتا تھا۔ در اصل موضوع اور فن ایک دوسرے سے یوں گتھے ہیں کہ فن کار کا نئے سے نیا تجربہ بھی ان دونوں میں مل کر اس طرح ان کا ایک حصہ ہو جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کی بھی ابتدا اور انتہا کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ کم سے کم میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

بلونت سنگھ: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر چہ منٹو بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی شہرت میں اس شور وغل کا کافی اثر ہے جو وہ خود ہی مچایا کرتے تھے۔

کرشن چندر: میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ ہمارے ملک میں اکثر ادیب اپنے فن کے بارے میں شور وغل مچاتے ہیں۔ لیکن ان کو منٹو جتنا بڑا کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

بلونت سنگھ: کیا آپ ہندی سیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایک روز آپ خود ہی ہندی میں ہی لکھنے لگیں گے؟

کرشن چندر: میں نے تین سال تک سنسکرت پڑھی تھی، مگر اب وہ سب بھول گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کی سرکاری نوکری کے دوران مجھے ہندی سیکھنی پڑی۔ میں نے امتحان بھی دیا اور اس میں میرا دوسرا نمبر رہا۔ میں ہندی پڑھ بھی لیتا ہوں اور ٹوٹی پھوٹی لکھ بھی لیتا ہوں یعنی جتنی ایک افسانہ نویس کو آنی چاہیے۔ لیکن پھر بھی میرا اس پر پورا Command نہیں ہے۔ ہندی کو ملک کی قومی زبان سمجھتے ہوئے بھی میں اس کو پورے طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے لیے وقت

چاہیے۔

بلونت سنگھ: کیا آپ کے خیال میں کسی قسم کا نشہ شراب، سگریٹ یا پان ایک ادیب کے لیے ضروری ہے؟

کرشن چندر: یہ ادیب کی اپنی ضرورت پر منحصر ہے۔ کچھ کو ضرورت ہوتی ہے اور کچھ کو نہیں۔

بلونت سنگھ: آپ کی ہابی (Hobby) کیا ہے؟

کرشن چندر: لکھنا!

بلونت سنگھ: آپ کو کون کون سی ترکاری، کون سا پھل، اور کس قسم کا کھانا پسند ہے؟ کیا آپ کھانے کے معاملے میں بے پروا ہیں؟

کرشن چندر: مجھے سادہ کھانا پسند ہے۔ لیکن عمدہ پکا ہوا۔ سبزی میں مجھے مٹر پسند ہے اور پھلوں میں مجھے سیب پسند ہے اور یہی میری ایک کہانی کا عنوان بھی ہے۔

بلونت سنگھ: کپڑوں کے بارے میں آپ کا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟

کرشن چندر: مغربی لباس کا شائق ہوں، اور بہترین سلائی کا قائل ہوں۔

یہ انٹرویو 'افکار' شمارہ 116، مارچ 1961 میں شائع ہوا۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندی دو ماہی اردو ساہتیہ الہ آباد اور آثار کلکتہ میں پہلے شائع ہوا۔ ترجمہ قیصر شمیم نے کیا ہے۔

فراق گورکھپوری

بلونت سنگھ: اس میں کچھ شک نہیں کہ آپ نے شاعرانہ صلاحیت کے ساتھ جنم لیا لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ بچپن اور لڑکپن میں کن حالات میں کن چیزوں نے آپ کی اس صلاحیت کو ابھارا اور سنوارا؟

فراق: میں ہوش سنبھالنے کے پہلے ہی نیم شعوری طور پر یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جو لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں اور مادی کائنات کو پاک نہیں سمجھتے وہ ہندستانی تہذیب کے دشمن ہیں۔ پہلے چولھا، چکی، آنگن، آگ، گھریلو سامان اور گھریلو زندگی کے سامنے سر جھک جانا چاہیے۔ پہلے گھاس پات کا احترام شعور میں پیدا ہونا چاہیے۔ پھر کسی غیبی شخصی وجود کو ثانی حیثیت دے کر اس کے متعلق گفتگو ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک قادر مطلق کا تصور ایک گندہ تصور رہا ہے۔ طاقت کی پرستش، مالک کی پرستش کے تصور سے میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، ہندوؤں میں شکتی پوجا کا تصور کسی ایسے موجود کا تصور نہیں ہے جو آفاق کا کمانڈر ان چیف ہے۔ ہم جسے شکتی کہتے ہیں وہ ذرے ذرے کی ماہیت ہے نہ کہ کائنات کی ماہیت۔ کسی غیر مجسم اور حکمراں خدا کے وجود کو ماننا اور ایسے مفروضی خدا کا محبوب جو تہذیب اور انسانیت سے مبرا ہو وہ

کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ چونکہ جن تصورات کو میں نے مندرجہ بالا بیان میں رگڑ کے رکھ دیا ہے' ان تصورات کے ماننے والوں کو ہندستان اور ہندوستانی تہذیب کی توہین کرتے ہوئے میں نے کم سنی سے ہندوستان میں دیکھا ہے' اس لیے شاعر ہونے سے پہلے ان عقائد اور تصورات سے اپنے آپ کو ایک جھلایا ہوا اور نفرت کرنے والا انسان پایا۔

بنیادی طور پر جن محرکات نے مجھے شاعر بنایا وہ چند پرستارانہ جذبات تھے۔ دھرتی کی پرستش، گھریلو زندگی اور اس کے جزئیات کی پرستش۔ اس انسانی زندگی کی پرستش جسے وحدانیت اور خدا پرستی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ صرف اس امر سے تعلق ہے کہ وہ انسانیت ہے اور جسے ملت کے تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ مناظر فطرت کی پرستش۔ انسان کے باہمی تعلقات کے تصور کی پرستش۔ اس خیال کی پرستش کہ ہم جن جن چیزوں کی پرستش کرتے ہیں' ان کے نام کو پیغمبر گنوا نہیں سکتا۔ یہ تھے چند محرکات یا کفریات جنھوں نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا۔

بلونت سنگھ: اردو شاعری میں غزل ہی کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے' یہاں تک کہ اردو کا تقریباً ہر شاعر غزل پر طبع آزمائی ضرور کرتا ہے۔

فراق: حقیقی شاعر خواہ غزل کی شکل اختیار کرے یا دیگر اصناف سخن کی مثالیں پیش کرے اس میں غزلیت کا ہونا لازمی ہے۔ غزل ایک مخصوص صنف سخن ضرور ہے' لیکن غزلیت حقیقی معنوں میں جو ہر شاعری ہے۔ مخصوص موضوعات پر اشعار اور نظمیں کہی جاسکتی ہیں اور کہی گئی ہیں۔ لیکن شاعری کا اہم ترین اور دائمی موضوع حیات و کائنات کے مرکزی حقائق میں غزل کا سب سے اہم موضوع جنسی یا رومانی تعلقات کے رموز و کنایات اور اس کے مختلف پہلو ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ اگر ہم جنسی تعلقات کو محض ایک اتفاقی میکانیکی افادی حیثیت دیں اور ساری اہمیت سیاسی، اخلاقی، اقتصادی اور علمی امور کو دیں تو ہمارا تصور زندگی ایک کھوکھلی اور بے معنی چیز ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی تمام کوششیں تمام فکریات اور تمام تگ و دو عمل

برائے عمل کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ عمل برائے عشق کے لیے ہے۔ سیاسی زندگی' عشقیہ زندگی اور گھریلو زندگی کی لونڈی ہے۔ غزل کی شاعری اسی عشقیہ زندگی اور نجی زندگی کے جمالیات پیش کرتی ہے اور اس کی معنویت سے ہمیں روشناس کرتی ہے۔

بلونت سنگھ: ....

فراق: سب سے پہلے میں ایک دوسرے انگریزی مصنف Frank Swvinnerton کا یہ قول پیش کروں گا کہ ''جو لوگ فحاشی اور عریانی برداشت نہیں کر سکتے ان کے ذہن میں گندگی کارفرما ہے'' حقیقی معنوں میں تہذیب و لطافت جسمانی مطالبات کو کھلے دل سے قبول کر کے اور ان مطالبات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جسمانی تلذذ کی معنویت' خلاقیت اور انسان سازی کی طرف اشارہ کرنا روح کو جسم سے معرا سمجھنا ایک گندہ تصور ہے۔ مادی اشکال زوال پذیر ضرور ہیں لیکن کوئی حقیقت ان سے پاکیزہ تر نہیں۔ مجھے اس موقع پر آسی غازی پوری (حضرت شاہ عبد العلیم آسی) کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

تمھیں سچ سچ بتاؤ کون تھا شیریں کے پیکر میں
کہ مشت خاک کی حسرت میں کوئی کوہکن کیوں ہو

جنسیت سے وہی شخص ڈرتا ہے جس کے دل میں چور ہے۔ جنسی تعلقات کا داخلی تصور اور ان کی داخلی حقیقت پاکیزگی کی انتہا ہے۔ چونکہ بہت سے لوگ جنسی تعلقات کا گہرا تصور نہیں رکھ سکتے' انھیں یہ ثواب عظیم گناہ عظیم معلوم ہوتا ہے۔ جسے مندرجہ بالا سوال میں Vulgarity کہا گیا ہے وہ کن بلندیوں کو چھو سکتی ہے اور کن بلندیوں تک ہمیں لے جا سکتی ہے' اس کا اندازہ ہندوستان میں کھجوراہا کے مندر اور اس کی بت تراشی اور نقاشی سے ہو سکتا ہے۔ اگر جنسی محرکات کارفرما نہ ہوں تو نہ ہم تاج محل کا تصور کر سکتے ہیں' نہ دنیا بھر کے فنون لطیفہ کے شاہکاروں کا۔ جن لوگوں میں جنسی محرکات سے خوف زدگی کا جذبہ پیدا کر دیا جاتا ہے' وہ شاید لنگوٹ کے سچے ہوتے ہوئے بھی دنیا کے سب سے کمینے انسان بن جاتے ہیں۔

جنسیت کو کچل کر ہم انسان دوستی کی سعادت حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر نمک حلال انسان جتلائے جنسیت رہتا ہوا بھی ماوراے جنسیت ہوتا ہے۔

بلونت سنگھ: Allen Taler کے الفاظ ہیں:

In a manner of speaking the poem is its own knower, neither poet not reader knowing any thing that the poem says apart from the words of the poem.

آپ کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے؟

بلونت سنگھ: ہر حقیقی شعر یا نظم کو ہم ایک عالم راز کہہ سکتے ہیں، جو اپنی صوتیات و مفہوم سے ماورا ہوتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کسی قدر زیادتی ہے کہ وجدان سلیم رکھنے والا شخص شعر کے صوتیات و مفہوم کے پس پردہ حقائق کو محسوس نہیں کرسکتا۔ انسانی شعور اور تحت الشعور اور لاشعور حقائق کی آخری منزلوں تک ہمیں پہنچا سکتے ہیں لیکن یہ رسائی یا دور رسی یا رسا کاری کسی منطقی مفہوم یا معنی تک پہنچ کر ٹھہر نہیں جاتی۔ حقیقی شعر کا مقصد علم دینا نہیں ہے بلکہ ایسے محسوسات اور نیم محسوسات دینا جہاں وضاحت و تشریح کام نہیں آسکتی۔ اگر ہم مفہوم و الفاظ کی منزلوں سے آگے نہیں گزر سکے تو ہم کہیں پہنچے ہی نہیں بلکہ یوں کہیں کہ شعر کی نغمگی اور اس کا لہجہ اس کے لغوی مفہوم سے ہمیں بہت دور لے جاتا ہے۔

بلونت سنگھ: کیا آپ وجدان......کو بھی اکتساب علم کا ایک ذریعہ تسلیم کرتے ہیں:

Today we lack very much a whole view of poetry, and have instead many one-sided views of poetry which have been advertised as the only aims which poets slound atteupt (Stephen Spinder)

کیا یہ بات اردو شاعری پر لاگو ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

فراق: سرمایہ دارانہ نظام آج بے مقصدیت کے مسئلے سے دوچار ہے اور اشتراکی نظام کی مقصدیت میں کوئی صحت مندانہ اور داخلی طور پر ہمہ گیر یا محض وجدانی مقصدیت نہیں ہے۔ بڑی مصیبت یہ رہی ہے کہ ہم دنیا میں اب تک جتنے بڑے شاعر گزرے ہیں انھیں کسی خاص سیاسی و اقتصادی فکریات و نظام کا محض علم بردار سمجھتے رہے ہیں۔ ہم ان کی اس ہمہ گیر آفاقیت کو نظر انداز کردیتے ہیں جو عقائد، تصورات اور فکریات سے بالاتر ہے۔ ٹھنڈے دل سے یا مشتعل ہوکر کوئی بڑا شاعر اگر کچھ عقائد کو مانتا ہے تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کا بلند ترین شاعرانہ کارنامہ خود اس کے عقائد اور فکریات سے زیادہ قیمتی اور زیادہ بڑی چیز ہے۔ ایک شاعر کا وجدان اس کے عقائد وفکریات سے زیادہ اہم ہے۔ آج کے شعرا کے پاس سب کچھ ہے لیکن وہ وجدان نہیں ہے جو شاعری کو ہمہ گیر اور بھرپور بناتا ہے۔ ہم شاید اشتراکیت کو قبول کرلیں لیکن اشتراکی ادیبوں کے محسوسات اور وجدان کے مقابلے میں ایسے محسوسات اور وجدان کو اپنائیں گے جو قدیم ادوار کے بلند ترین شاعروں کا وجدان رہا ہے۔ روس اور چین کے بلند ترین ادیب بھی وجدان کے معاملے میں ان ادیبوں سے کم تر ہیں جن کو دنیا نے بالاتفاق چوٹی کے ادیب مانا ہے خواہ ان کے عقائد اور فکریات میں کتنا ہی نقص ہو خود مارکس اور لینن ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے میں بیتھوون اور شیکسپیئر سے کہیں زیادہ متاثر تھے۔ اسپنڈر نے دور حاضر کے نام نہاد ادیبوں کی دکھتی رگ پکڑلی ہے۔

بلونت سنگھ: پھر Allen Taler کے الفاظ میں:

> Serious poetry deals with the fundamental conflicts that cannot be logically resolved:
> We can state the conflicts rationally but reason does not relieve us of them. Their only final

coherance is the formal recreation of art which "Freezes" the experience as permanently as a logical formula, but without, like the formula, leaving all but the losic out.

فراق: کسی زمانے میں ایک مشہور ادبی رسالہ London Mercury کے نام سے کئی برس تک جاری رہا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً J.C.Squire (جو اپنے دور کے بہت بڑے ادیب تھے اور رسالے کے مدیر اعلیٰ بھی تھے) نے لکھا تھا کہ شاعری کے دو ہی موضوع ہیں یعنی انسان بنام انسان یا انسان بنام کائنات۔ انگریزی کی ایک دوسری کتاب کا نام ہے The English poetic mind جس میں اس حقیقت کی وضاحت کی گئی کہ ہر بڑے شاعر کی دنیاوی اور وجدانی زندگی میں ایک بحرانی وقفہ آتا ہے۔ انگریزی کے ایک شاعر کے کلام سے ایک نقاد نے اپنی نا آسودگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ اس شخص کی زندگی میں وہ انتشار نہیں ہے جو حقیقی شاعری کو جنم دیتی ہے۔ نطشے نے کہا تھا کہ "Out of chaos a dancing star is Born" میں اسے یوں کہنا چاہتا ہوں کہ all literature is a problem literature ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادب کا آغاز کہیں نہ کہیں تناقض اور تصادم کے احساس سے ہوتا ہے اور اسی تناقض اور تصادم کے کچے مال سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہی حقیقی ادب کا مقصد ہے۔ بیدار سے بیدار شعور زندگی میں کسی کمی، کسی خرابی، کسی تضاد و تصادم کا احساس کرتا ہے۔ لیکن فنون لطیفہ کا منصب اعلیٰ یہ کہ منطقی طور پر اگر چہ ہم ان خرابیوں، تناقصوں اور تضادوں کو ماننے پر مجبور ہیں لیکن وجدانی اور جمالیاتی طور پر ہم انھیں ہم آہنگ بنا سکتے ہیں۔ یہ ہے کہ فنون لطیفہ کی جمالیاتی حقیقت۔ جون اسٹورٹ مل نے اپنی خودنوشتہ سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک بار میری زندگی میں ایک ایسا دور آیا جب میں نے اپنے آپ سے یہ پوچھا کہ وہ تمام بلند مقاصد جن کا میں دلدادہ ہوں اگر

پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں تو کیا مجھ کو بڑی خوشی ہوگی میری روح سے آواز آئی کہ ہرگز نہیں۔اس بھیانک جواب کا اثر مجھ پر یہ ہوا کہ میں خودکشی کی سوچنے لگا۔عین اسی بحرانی عالم میں Wordsworth کی نظموں کا مجموعہ میرے ہاتھ آ گیا۔یہ نظمیں پڑھ کر زندگی پر میرا ایمان پھر سے قائم ہوگیا اور میں خودکشی کرنے سے بچ گیا۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ایک کھلنڈرے لڑکے سے اس کے چچا کہنے لگے کہ تم کھیل کود میں اپنا تمام وقت ضائع کرتے ہو بھلا پتنگ لڑانے سے کیا فائدہ' تاش کھیلنے سے کیا فائدہ' مٹرگشتی کرنے سے کیا فائدہ' لڑکے نے جواب دیا کہ چچا فائدے سے کیا فائدہ؟ میرے پروفیسر S.G.Dunn نے ورڈز ورتھ کی نظموں پر مقدمہ لکھتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اگر دنیا میں شاعری نہ ہوتی تو صرف ایک ہی جوگ یا روحانی عمل انسان کے لیے ممکن تھا' اور وہ جوگ یا عمل خودکشی ہوتا۔ہاں تو شاعری کا مقصد اعلیٰ صرف یہ ہے کہ اس پر تضاد، پر نقائص، پر تصادم کائنات کا ایسا جمالیاتی شعور ہمیں حاصل ہو جو نا آسودگی کو آسودگی میں بدل دے اور ناہم آہنگی کو ہم آہنگی میں بدل دے بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ غم' ناکامی' بربادی اور دکھ کے اظہار کا المیہ ادب میں ایک غیر متوقع لیکن مسلم سکون عطا کرتا ہے۔نا قابل قبول کی قبولیت کا ماورائے منطق احساس پیدا کرنا بلکہ غم کو تہذیب غم میں تبدیل کر دینا ادب کا سب سے بڑا منصب ہے۔

بلونت سنگھ: ادب ایک قسم کے Neorosis کی پیداوار ہے اور کیا یہ محض یہی کچھ ہے۔

فراق: دنیا میں جتنی بری چیزیں ہیں ان کی کچھ بلند شکلیں بھی ہیں۔ چھوٹے آدمی کا Neorosis ایک چھوٹی چیز ہے لیکن گوتم بدھ کو قریب قریب جس اعصابی بحران کا سامنا کرنا پڑا ہے' اسے ہم چٹکیوں میں نہیں اڑا سکتے۔حضرت محمد کو اہل عرب کی گری ہوئی زندگی کے احساس نے جس قدر بے چین بنا دیا تھا اس میں کم از کم مجھے الوہیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جتنا دکھ ہندوستان کی حالت سے مہاتما گاندھی کو ہوا تھا وہ Neorosis سے بہت مختلف نہیں ہے اور یہی بات ہم مارکس لینن کے

بارے میں کہہ سکتے ہیں۔ ہر بڑی شخصیت ایک قابل احترام معنوں میں بیمار شخصیت ہوتی ہے۔ میرے پروفیسر S.D.Dunn نے اب سے تقریباً پینتیس برس پہلے ایک مقالہ پڑھا تھا جس کا عنوان تھا Genius and the clinical thermometer جو بیمار نہیں ہے وہ صحت مند نہیں ہے۔ چنانچہ ہمیں Neorosis کے لفظ سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کچھ حالات اگر ہمیں بے اختیار نہ کر دیں تو ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ اس اعصابی اذیت اور خرابی میں بہت سی خلاقانہ صلاحیتیں اور امکانات مضمر ہیں۔ سب سے بڑا سکون وہ سکون ہے جس میں کرب و درد کی تھرتھراہٹیں توازن حاصل کر لیتی ہیں اور شو کے تانڈو رقص میں ضدین کی اسی ہم آہنگی کو مجسم کر دیا گیا ہے۔

جب منطق ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے کہ وجود بجائے خود ایک متصادم حقیقت ہے' تو وجود کی ہم آہنگی کا احساس کیا ایک دھوکا اور بھرم نہیں ہے۔ کیا ایسا احساس ایک Wishful thinking نہیں ہے۔ اسی نازک موقع پر عشق کا لفظ آڑے آتا ہے۔ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ وہ جس محبوب سے محبت کرتا ہے وہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی ہے یا اس کے ماں باپ' بھائی بہن اور اس کی اولاد دنیا کے عظیم ترین یا بہترین انسان ہیں۔ یا اس کا ملک اور اس کے مناظر، اس کا گھر، پڑوس اور ماحول اور اس کے دوست اور ساتھی دنیا کی سب سے بڑی حقیقتیں ہیں۔ پھر بھی وہ ان سب پر اپنی جان چھڑکتا ہے۔ ان حقائق سے یہ ثابت ہوا کہ جہاں منطق بہت کچھ ہے' عقلیت بھی بہت کچھ ہے وہاں ایک جذبات منطق ہوتا ہے اور ماورائے عقلیت ایک عقلیت ہوئی جس کو ہم مجموعی طور پر وحدانیت کہتے ہیں یا چاہیں تو انسانیت کہہ سکتے ہیں۔ انسان کو حیوان ناطق کہا گیا ہے لیکن اس فقرے میں ہم لفظ ناطق کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے دیتے ہیں۔ انسان (ذی حیات) پہلے ہے ناطق بعد کو ہے' بلکہ بہت بعد کو۔ جب ہم ایک بچے کو پیار کرتے ہیں تو اس کی زندگی کی افادیت کو جو فی الحال ایک صفر سے زیادہ نہیں ہے خاطر میں

نہیں لاتے۔ قوس قزح سے دنیا کا کوئی فائدہ نہیں لیکن اسے دیکھ کر ہمارا دل اچھلنے لگتا ہے۔ مناظر قدرت اگر روس اور امریکہ کی فیکٹریوں کی طرح نظر آئیں تو منطقی لحاظ سے دنیا کا کوئی نقصان نہیں، لیکن خدا نہ کرے ایسا ہو۔ اسی لیے ایک مفکر نے کہا تھا: All art is useless فن برائے فن بہت بلند آدرش ہے۔ لیکن اس کا مطلب امانت لکھنوی یا نوح ناروی والی شاعری نہیں ہے۔ اس پر عظمت فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہم مثال کے طور پر کوہ ہمالیہ کی ایسی مصوری کریں کہ اس سے کوئی افادی پہلو نہ نکلے لیکن روح میں بالیدگی پیدا ہو۔ برناڈشا نے ایک جگہ لکھا ہے کہ عشق میں چاہنے کے تصور کو کوئی جگہ نہیں ہے۔

بلونت سنگھ: اردو شاعری میں امرد پرستی کیوں آگئی۔ امرد پرستی دیگر زبانوں کے ادب میں بھی موجود ہے، کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی زحمت کریں گے۔

فراق: مذکر کا صیغہ مؤنث کا محض الٹا نہیں ہے یا محض اس کی ضد نہیں ہے۔ بلکہ مؤنث میں تخصیصیت ہے اور مذکر میں ہمہ گیری۔ غزل میں عشق کا ذکر ہوتا ہے۔ فلاں نام والے مرد کا فلاں نام والی عورت سے عشق کا ذکر نہیں ہوتا۔ لکھنؤ کی عورتیں اس بات سے بہت بچتی ہیں کہ اپنے متعلق مؤنث کا صیغہ لائیں۔ وہ ایسے فقرے نہیں بولتیں کہ 'میں آئی' بلکہ کہتی ہیں کہ ہم آئے۔ کسی دوسرے شاعر کا نہیں بلکہ حالی پانی پتی کا یہ شعر لیجیے جسے اردو غزل سے بہت سی شکایتیں تھیں۔ کہتے ہیں:

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ
ہم وہ نہیں کہ جس کو منایا نہ جائے گا

'جانتے ہیں' کے ٹکڑے کو 'جانتی ہیں' کر دیجیے تو شعر کتنا پھوہڑ ہو جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم مذکر کے صیغے کو تو مونث کے لیے پردہ بنا سکتے ہیں لیکن مؤنث کے صیغے کو مونث کے لیے پردہ نہیں بنا سکتے۔ فانی کا شعر لیجیے:

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جو وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

پہلے مصرعہ میں اٹھا کو اٹھی یا انھیں کر دیجیے اور دیکھیے شعر کی کیا گت بنتی ہے۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے کہ اردو شاعروں کی اکثریت امرد پرست تھی لیکن غزل اتنی پاکیزہ صنف سخن ہے کہ یہاں محبوب کے جنس کی تخصیص کرنا بدتمیزی سمجھی جائے گی۔ مثنویوں میں یا دیگر اصناف سخن میں مشکل ہی سے کبھی امرد معشوق کا ذکر آتا ہے۔ کھلم کھلا عورتوں سے عشق کا اظہار کیا گیا ہے۔ رہی بات دوسری زبانوں کے ادب میں اظہار امرد پرستی کی۔ اس کی مثالیں افلاطون کے وقت سے آج تک کے ادب میں ملتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ عاشق مزاج شخصیتوں میں وہ ایک فیصد ہی ایسی ہستیاں گزری ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی طور پر وقف امرد پرستی کر رکھا ہے۔ اس لیے دنیا کا عشقیہ ادب بہت کم امرد پرست جذبات کا حامل رہا ہے۔ ہمیں امرد پرستی کو قابل لعنت بتانے کے بدلے اس جذبے اور عمل کے ساتھ ایک سمجھوتہ کر لینا چاہیے کہ امرد پرستی ایک وبا کی طرح سماج میں نہ پھیلے۔ لیکن جو لوگ خلوص قلب سے اور اپنی تقاضائے فطرت سے اس کی طرف مائل ہوں ہم انھیں بھی اپنے سماج کا فرد قبول کر لیں۔ اب وہ وقت آ چکا ہے بلکہ اس سے بہت پہلے آ چکا تھا کہ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ ہم جنسیت کا بھی ہمارے تمدن میں ایک مقام ہے۔ امرد سے محبت ہو یا عورت سے محبت ہو دونوں قسم کی محبتیں ہمیں بہت نیچے بھی گرا سکتی ہیں اور بہت اونچا بھی اٹھا سکتی ہیں۔ بقول داغ:

عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط
یہ گنہ بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

امرد پرستی نے لاکھوں زندگیوں کو سنوار کر رکھ دیا ہے۔ اس موضوع پر غالباً سب سے زیادہ بصیرت افروز تحریریں Edward Carpenter کی ہیں۔ لیکن میں یہ پھر بھی کہوں گا کہ اردو غزل میں اگر چار پانچ ہزار ایسے اچھے اشعار آئے ہوں جن میں محبوب کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے تو ایسے اچھے اشعار چالیس ہزار آئے ہیں جن میں مذکر کا صیغہ نہیں لایا گیا۔ مثلاً

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں
ایک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے
کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
نکلیں اگر وہاں سے تو ہم تک بھی پہونچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے
(میر)

ایسے پچاسوں ہزار اشعار میں کون کہہ سکتا ہے کہ محبوب عورت نہیں ہے۔ لیکن:

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہا جاؤں

یہاں وہ نہیں بھولتی کہنا سخت بدتمیزی ہے۔

بلونت سنگھ: بھارت کے بٹوارے سے اجتماعی شعور..................

فراق: موجودہ زمانے میں محض گھریلو یا سماجی یا ذاتی زندگی کا دار و مدار نہیں ہوسکتا بلکہ اسکولوں اور کالجوں میں زبان و ادب کی جیسی تعلیم دی جائے گی اسی پر ادب کی تعمیر ہوسکے گی۔ میں محض شاعر نہیں رہا ہوں بلکہ ایک معلم بھی رہا ہوں اور جس طرح تعلیم کو روز بروز پستی کی طرف ہم لے جا رہے ہیں اسی پستی کے طرف ہمارا ادب بھی جائے گا۔ میں اسے مدتوں سے محسوس کرتا رہا ہوں کہ اردو کے کامیاب ادیب بھی وجدان اور شعور کی وہ سنجیدگی حاصل کرنے سے محروم رکھے گئے ہیں جسے صرف گہرا مطالعہ اور بلند تعلیم ہی ہمارے نوجوانوں کو دے سکتی ہیں۔ مرزا غالب کی فلم کو

لے لیجیے جسے دو مشہور ادیبوں نے بنایا ہے۔ دونوں نے موضوع کو اور اسے پیش کرنے کے طریقے کو کافی نیچے گرا دیا ہے۔ جس ہندی کو بظاہر اتنا اچھالا جا رہا ہے آج اس کی تعلیم بھی مٹی میں ملا دی گئی ہے۔ ہندوستان کو آج ایک تعلیمی انقلاب کی ضرورت ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ انقلاب کب آئے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ انقلاب کبھی آئے گا یا نہیں۔ اس لیے اردو یا ہندوستان کی کوئی اور زبان ہو اس کے ادب کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہے۔ آج جاہل سے جاہل آدمی جو ایک پوسٹ کارڈ صحیح نہیں لکھ سکتے پارلیمنٹ کے ممبر ہو رہے ہیں۔ منتری ہو رہے ہیں، گورنر ہو رہے ہیں، اور ہزارہا کی تعداد میں بڑے بڑے افسر ہو رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے جاہل لوگ یونین اور صوبہ جاتی پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہو رہے ہیں، پروفیسر ہو رہے ہیں، ہائی کورٹ کے جج ہو رہے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ادب کا خدا حافظ۔

بلونت سنگھ: اردو ادب میں ہندو، مسلمان، سکھ اور ہندوستان کے دوسرے لوگ جس مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کریں گے اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فراق: اس امر میں میری گزارش یہ ہے کہ تعصب سے پاک رہتے ہوئے بھی مسلمان مسئلے کی تہ تک نہیں پہنچے۔ اردو کے مسلمان ادیبوں کے فرائض ان فرائض سے کچھ مختلف ہیں جنھیں میر و غالب، آتش و ناسخ، انیس و دبیر، حالی و اقبال نے پورا کیا۔ ہندوستان ہمیشہ بدلتا رہا ہے لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہماری تہذیب اور ثقافت و ادب کی جڑیں اگر سنسکرت ادب میں اور ادب سے نہیں پھوٹتیں تو یہ جڑیں ہندوستان کی زندگی میں اوپر سے نہیں پھوٹتیں۔ ادب کا سب سے بڑا کام قومی مزاج کی تخلیق کرنا ہے۔ یہ مزاج موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا ہوا وہی مزاج ہو گا جو ویدوں، اپنشدوں، پرانوں، مہابھارت، رامائن، کالیداس اور دیگر ان شاہکاروں اور شاعروں کا مزاج ہے جو ہندو تہذیب کے معمار ہیں۔ ثقافتی وجدانی اور تہذیبی طور پر ہر غیر ہندو کو ہندو بننا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ

نہیں ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں میں ہندوستان سے ایک نیم مغائرہ کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ لیکن ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کے تمام اہم عناصر کو وہ اپنا نہیں سکتے۔ اس تہذیبی ورثے کو اپنانا اور اس ورثے سے اپنے آپ کو مالا مال کرنا تمام ہندو اور غیر ہندو ادبائے اردو کا اہم ترین فرض ہے۔

بلونت: شعر کہنے کے لیے آپ کیسا ماحول پسند کرتے ہیں۔

فراق: ماحول کا لفظ بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے۔ ماحول کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس کا تعلق ماضی سے ہے۔ ہندوستان میں اردو ادب کے ادیب کی شخصیت میں ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ سے لے کر آج تک کی تہذیبی قدریں کارفرما ہیں۔ محض سطحی اور انفرادی نیکی، شرافت، طباعی اور فنی صلاحیت سے بڑا ادب پیدا نہیں ہوتا۔ ہم دور نہ جائیں پریم چند کو لے لیں۔ پریم چند بہت بڑے ادیب تھے۔ لیکن ان کی شخصیت میں وہ قدریں کارفرما نہیں آئیں جو شکنتلا ایسے شاہکار کو جنم دے سکیں۔ ہم جب شکنتلا پڑھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شرت چندر یا پریم چندر یا کرشن چندر کے کارنامے پڑھتے ہیں تو شکنتلا کے مقابلے میں ان دیگر بڑے ادیبوں کے کارناموں میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ تہذیب کے سمندر سے بڑے اقدار کا نکالنا سمندر منتھن کی قسم کا کام ہے۔ ٹالسٹائی کوئی معمولی ادیب نہیں لیکن محض ادبی اور فنی لحاظ سے نہیں بلکہ اخلاقی وجدان کے لحاظ سے وہ شیکسپیئر کے مقابلے میں ایک گرا ہوا آدمی ہے۔ حالانکہ اپنی ہر تحریر میں گھگی باندھ باندھ کر اس نے صرف اخلاق کی دہائی دی ہے۔ ٹالسٹائی کی کوئی کتاب اس عظمت کو چھو نہیں سکتی جو ہم Vicar of Wakefield اور Silas Marniar میں پاتے ہیں۔ ٹالسٹائی کے فرشتے بھی ڈیوڈ کو پر فیلڈ نہیں لکھ سکتے۔

بلونت سنگھ: ادب کے متعلق ہم آپ کے کچھ اور اہم خیالات جاننا چاہتے ہیں۔

فراق: ادب زندگی کے واقعات کی مصوری نہیں ہے۔ ان بلند مقاصد کی مصوری ہے جن کا

تعلق دنیا سے غلط نظام، بے انصافی، ظلم اور جہالت کو دور کرنا ہے۔ یہ کام بہت اہم ہے اور بڑے بڑے لیڈر انھیں انجام دیتے ہیں۔ عظیم ادیب، سیاسی لیڈروں کا خاکہ یا بردار نہیں ہوتا۔ وہ ادب کے ذریعے سے وہی نتائج پیدا نہیں کرنا چاہتا جو سیاسی جدوجہد سے گاندھی یا لینن پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ادیب تحریک سیاست کا رضاکار نہیں ہے۔ ادیب کا صرف ایک کام ہے۔ جب اور لوگ اور ان کی کوششیں دنیا کو سب کچھ دے چکیں تو ان کے بعد یا ان سے علاحدہ رہ کر ادیب دنیا کو جمالیاتی شعور دے۔ سوچنے کی بات ہے کہ مارکس، لینن، خرشچوف، میکسی، گیری بالڈی، گاندھی اور پیغمبرانہ عالم دنیا کو وہ چیزیں کیوں نہیں دے سکتے جو رامائن، مہا بھارت، الیٹ اور اوڈیسی Aenied کے شعرا یا دیگر مشاہیر شعر و ادب دنیا کو دے سکے۔ میں کسی بڑے فنکار کے مقابلے میں کسی دوسرے بڑے سے بڑے آدمی کو جگہ دینے کو تیار نہیں ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ بڑے لوگ اگر اپنا کام سر انجام نہ دیتے تو ادب یا شاعر کیسے کام کر سکتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مہتر ہڑتال کر دیں تو وہ لوگ کوئی کام نہیں کر سکتے جو مہتر نہیں ہیں۔ عمل کے سورما تاریخ کے مہتر ہیں اور فنون لطیفہ کے سورما تاریخ کے عطار ہیں۔ کیا اس لیے مہتر کا پیشہ دنیا کا بلند ترین پیشہ مانا جائے گا۔ کسی کام کا لازمی یا ناگزیر ہونا اس کام کی داخلی اہمیت کی دلیل نہیں ہے۔ زندگی کے مقاصد وہ چیزیں نہیں جنھیں ہم مقاصد سمجھتے ہیں بلکہ وجدانی احساسات اور تجربات حاصل کرنا یا غیر مقصدی اور غیر افادی تجربات سے اپنے کو شرابور کرنا بلکہ یوں کہیے کہ غیر مقصدیت سے زندگی کو مالا مال کرنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ زندگی کا مقصد وہ مشقت نہیں ہے جس سے تاج محل کی تعمیر ہوتی ہے بلکہ اس جمالیاتی شعور کا حاصل کرنا ہے جس نے تاج محل کے خواب کو جنم دیا اور جو تاج محل کو دیکھ کر ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے۔ افادی عمل ایک نہایت ضروری اور نہایت گری ہوئی چیز ہے۔ 'ہونا' 'کرنے' سے بہت بڑی بات ہے۔

بلونت سنگھ: آزادی ملنے کے بعد ہم تہذیبی ترقی کے کچھ منازل طے کر سکے ہیں یا نہیں؟

فراق: حصول آزادی ہم کو ایک ایسے آدمی کی رہبری سے نصیب ہوئی جو کئی لحاظ سے بہت بڑا آدمی تھا اور کئی لحاظ سے بہت چھوٹا آدمی تھا یعنی مہاتما گاندھی۔ اس شخص کا شعور اور اس کا پورا وجود اس قابل تھے ہی نہیں کہ فن تعمیر، فن مصوری، فن رقص، فن موسیقی، فن بت گری، فن ادب، علوم اور بلند تعلیم و تربیت یافتہ دماغ کے مفہوم کو کچھ بھی سمجھ سکے۔ مہاتما گاندھی کی عظمت ایک المیہ تھی جس نے ہندوستان کو آزاد بھی کیا اور مستقل طور پر ان عظمتوں کی قدر شناسی سے ہمیں محروم کر دیا جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ مارکس اور لینن ایسے سورماؤں اور دلدادگان عمل کے متعلق ایسی خبریں ہم تک پہنچی ہیں کہ صدہا ادیبوں اور فن کاروں کے ناموں پر یہ جھومے ہیں۔ لیکن ہائے ہائے ایک تھے مہاتما گاندھی جو کئی لاکھ الفاظ زندگی میں بولے لیکن اجنتا، شکنتلا، خسرو، تان سین، جے سی بوس اور آفاقی تہذیب کے دیگر پائندہ ہستیوں اور کارناموں کے لیے اٹھتر برس کی لمبی چوڑی زندگی میں پانچ سات لفظ بھی نہیں بول سکے بلکہ سر جے سی بوس کی شان میں انھوں نے یہ گستاخی کی کہ ایک پبلک جلسے میں کہہ دیا کہ جے سی بوس کی دریافتوں سے عوام کو کیا فائدہ ہوا؟ واہ رے عوام، واہ رے فائدہ۔ بوجھیں تو لال بجھکو اور نہ بوجھیں کوئے۔ اس شخص کی روح محض انگریزی حکومت ہی سے نہیں لڑتی بلکہ علم و ادب سے بھی لڑتی تھی اور تہذیب کی بلند قدروں کو سمجھنے سے بالکل معذور تھی۔ مہاتما گاندھی عمر بھر میں اگر کبھی اس موضوع پر کوئی مضمون لکھنا چاہتے کہ ہندوستان کا روشن ترین دماغ کن کن صلاحیتوں کا حامل ہو تو وہ مضمون نہایت سڑا ہوتا۔ اس شخص نے ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے ہمیں بھک منگا بنا دیا ہے۔ یہ سب حلفیہ طور پر کہہ چکنے کے بعد ہم بھی کہیں گے کہ مہاتما گاندھی کی جے!

جاہل ہوتے ہوئے بھی یہ شخص ہمیں بہت کچھ دے گیا ہے۔ زندگی کی بہت سی قدریں جو علم ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ سے بے نیاز ہیں۔ عدم تشدد کا سبق، جرأت

اور ہمت کا سبق، مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکانے کا سبق، نہتوں کو مسلح قوتوں سے لڑنے کا سبق، زندگی میں ایک شاندار تیور پیدا کرنے کا سبق، دنیا کی سب سے چالاک اور تجربہ کار قوم کے تمام ہتھکنڈوں کو بے کار کر دینے کا سبق جو ہمیں مہاتما گاندھی نے دیا' وہ کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ مہاتما گاندھی اور ان کے اثرات ہماری غلامی کے لیے بہت کارآمد تھے۔ لیکن ہماری آزادی کے لیے گاندھیت یا تو بالکل بے کار چیز ہے یا بہت کم کارآمد ہے۔ جنگ آزادی میں ہم بدیشی حکومت کو مٹا دینا ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد ہم کیا کریں اس سوال کا جواب دینا مہاتما گاندھی کے بس کا کام نہیں تھا اسی لیے یہ خطرناک اور کارآمد آدمی، یہ بڑے کام کا اور نہایت نکما آدمی ہمیشہ سوراج کے لیے لڑتا رہا اور سوراج کے لوازمات بتانے سے ہمیشہ دامن بھی کتراتا رہا۔ ایک بار یہ حضرت یعنی مہاتما گاندھی میور سنٹرل کالج الٰہ آباد میں تشریف لائے۔ ان دنوں میں پنڈت امرناتھ جھا' کپل دیو مالویہ اور پرکاش نارائن سپرو سب میور کالج کے طالب علم تھے۔ پرکاش نرائن نے مہاتما گاندھی سے سوال کیا کہ کم سے کم کتنی (رقم) مالی حیثیت رکھنے کی اجازت آپ کسی کو دیں گے جس کا جواب مہاتما گاندھی نے یہ دیا کہ کچھ نہیں ایسے ہی موقع کے لیے شیخ سعدی نے لکھا تھا:

بریں عقل و دانش بہ باید گریست

ہائے ہائے

☆☆☆

اس انٹرویو کا مسودہ مجھے بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ نے دیا تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ اس کے قبل یہ انٹرویو 'شب خون' میں شائع ہوا تھا لیکن مکمل صورت میں نہیں۔ یہاں اسے مکمل صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ساحر لدھیانوی

بلونت سنگھ: آپ کا جنم کب ہوا تھا؟

ساحر: میرا جنم 8 مارچ 1921 میں ہوا تھا۔

بلونت: آپ نے شروع کی زندگی کہاں گزاری؟

ساحر: میرا بچپن لدھیانہ میں گزرا۔ دسویں تک میں خالصہ اسکول میں پڑھا۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں داخلہ لیا اور فورتھ ایئر میں لاہور چلا گیا۔

بلونت: آپ کی طالب علمی کی زندگی کیسی رہی؟

ساحر: میں ایک سال تک طالب علم فیڈریشن کا سکریٹری رہا اور ایک سال پریسیڈنٹ بھی۔ سیاست سے مجھے لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے ایک بار پٹا بھی۔ مجھے والد کا پیار نہیں ملا۔ میں اپنے ماموں کے پاس رہا۔ انھوں نے ہی مجھے پڑھایا لکھایا۔ میرے والد بہت بڑے جاگیردار تھے۔ لیکن مجھے شروع سے ہی جاگیرداری سے نفرت تھی۔ میرے دل پر اسی وقت سے یہ بات نقش ہوگئی کہ کسانوں کے ساتھ جاگیرداروں کا برتاؤ بہت برا ہے۔

بلونت: آپ اپنی زندگی کے کسی واقعہ سے دوچار ہوئے تھے یا جوں جوں الگ الگ

واقعات کا اثر پڑا۔ ویسے ویسے آپ نے شعر لکھے؟

ساحر: شروع میں تو کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا کہ میں شاعر بنوں گا۔ بلکہ شروع میں میں نے جو کچھ لکھا اسے کسی رسالے نے شائع نہیں کیا۔ اسی لیے میں نے کچھ عرصہ کے لیے شاعری بالکل ترک کردی۔ لیکن پھر اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر لکھنا شروع کردیا۔ یوں تو بہت کچھ دیکھا بھی اور پڑھا بھی۔ لیکن اسکے اثر سے میں نے لکھنا نہیں شروع کیا۔ اکثر ایسا ہی ہوا کہ جب کبھی بڑا واقعہ پیش آیا تو اس سے متاثر ہو کر میں نے نظمیں لکھیں۔ بعض دفعہ دوسروں پر گزرے واقعات بھی مجھ پر لاگو ہو جاتے تھے۔ جیسے 'فنکار'، 'تاج محل' وغیرہ۔ میرے پہلے مجموعے میں بہت سی ایسی نظمیں تھیں جو کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئیں۔

بلونت: لکھتے وقت آپ کو کیسا ماحول پسند ہے؟

ساحر: عام طور پر مجھے تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی میں چلتے پھرتے بھی شعر کہہ لیتا ہوں۔ لیکن بمبئی کی سڑکوں پر ایسا کرنا مناسب نہیں۔ میں اپنے شہر لدھیانہ یا لاہور کی سڑکوں پر ایسا کیا کرتا تھا۔

بلونت: اردو کے کن کن شاعروں کا آپ پر خاص اثر پڑا؟

ساحر: مجھ پر فیض، مجاز، جوش اور اقبال کا کافی اثر پڑا۔ میرا طریقہ بھی فیض سے ملتا جلتا ہے۔ فیض کے یہاں شعر کی خوبصورتی بڑھانے کا آرٹ ہے۔ مجھ پر گوپال متل کی شخصیت کا بھی اثر پڑا۔ انھوں نے پہلے پہل مجھے سوشلزم پر پڑھنے کو کتاب دی۔

بلونت: جہاں تک شاعری کا تعلق ہے آپ کمیونسٹ اور نان کمیونسٹ میں کیا فرق سمجھتے ہیں؟

ساحر: میں نہیں سمجھتا کہ کمیونسٹ ہوئے بنا ترقی پسند ادب نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ کوئی بھی ایماندار شاعر آج کی حالتوں کا ایمانداری سے بیان کرے تو اس کا کلام آگے بڑھنے سے رک نہیں سکتا۔ میرے خیال میں فیصلہ اسی بات پر ہوتا ہے کہ بلا جھجک شاعر آج کے حالات کو پوری ایمانداری سے بیان کرے۔

بلونت: ہماری ساہتیہ اکیڈمی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ساحر: شاید یہ بات سننے میں اچھی نہ لگے، اس اکیڈمی میں ایک طرح سے بندر بانٹ ہورہی ہے۔

بلونت: آپ کے خیال میں فلمی دنیا کی ہوا ایک شاعر کو راس آسکتی ہے یا نہیں؟

ساحر: یوں تو شاعر فلمی دنیا سے دور رہ کر اچھے اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ مگر میرے خیال میں فلمی دنیا ایک شاعر کو ختم نہیں کرسکتی۔ ایک اچھا شاعر فلمی گیتوں کو زیادہ شاعرانہ اور معنی دار بنا سکتا ہے۔

بلونت: ایک اچھا شاعر جو ادب میں اپنا مقام بنا لیتا ہے۔ وہ اکثر فلمی دنیا میں ناکام کیوں رہتا ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ فلم پروڈیوسر سمجھتے ہیں کہ شاعر ان کے لیے بالکل بیکار ہے۔

ساحر: فلم کا ایک الگ ہی میڈیم ہے اور فلم پروڈیوسر کی الگ خواہش ہے۔ ان کو سمجھے بغیر کوئی اچھے سے اچھا شاعر فلمی دنیا میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ایک طرح سے غزل لکھنا آسان ہے۔ اردو شاعری میں غزل کا رواج خاصا پرانا ہے۔ جس سے ہر نئے شاعر کو مدد ملتی ہے۔ شاید اسی لیے اکثر شاعر صرف غزل ہی کہتے ہیں یا کم سے کم اپنی شاعری غزل ہی سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اچھی غزل کہنا آسان کام ہے۔

بلونت: ادبی مضمون میں رائٹر کے دل کو جو خوشی نصیب ہوتی ہے۔ آپ اس کو اہمیت دیتے ہیں یا آپ کے خیال میں رائٹر کا کام سماج کی خدمت کرنا ہی ہے؟

ساحر: میں ادیب کی خوشی کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ کوئی حقیقی ادیب خود کو سماج کے مسئلوں سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ ان سے غافل نہیں رہ سکتا۔ ادیب یا شعر پر کوئی ایسی پابندی لگانا غلط ہوگا کہ وہ سماج کے کسی مسئلے کا حل اپنی تحقیقات میں پیش کرے۔

بلونت: آپ کے خیال میں بٹوارے کے بعد اردو کی ترقی پاکستان اور بھارت میں کیسی

رہی۔

ساحر: بٹوارے سے ایک بار تو اردو ادب اور اردو ادیب دونوں کو خاص جھٹکا لگا۔ ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر حالت درست ہو۔

بلونت: آپ کو ادب کے علاوہ کسی اور چیز سے بھی دلچسپی ہے؟

ساحر: جی ہاں۔ میوزک سے کچھ دلچسپی رہی۔ میں اسکول کے دنوں میں گاتا بھی تھا۔ لیکن کالج میں پہنچ کر میں نے گانا چھوڑ دیا ہے۔

بلونت: کیا آپ ایک غزل ایک ہی بیٹھک میں لکھ لیتے ہیں؟

ساحر: جی نہیں۔ میں ایک غزل ایک ہی بیٹھک میں نہیں لکھتا۔ اکثر کئی بیٹھکوں میں غزل پوری ہوتی ہے۔ ہاں کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی بیٹھک میں غزل پوری ہوجاتی ہے۔

بلونت: آپ کے خیال میں کسی قسم کا نشہ ایک رائٹر کے لیے ضروری ہے۔ بعض لوگ اس کے بغیر تخلیق کر ہی نہیں پاتے ہیں۔

ساحر: میرے خیال میں کسی بھی تخلیق کے لیے نشے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ کسی تخلیق کے بعد ہلکے پھلکے نشے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ ضروری نہیں ہے۔

بلونت: آپ کی عمر کافی ہوگئی ہے۔ لیکن آپ نے شادی نہیں کی۔ کیا آپ اس کے خلاف ہیں؟

ساحر: جی نہیں۔ میں شادی کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے۔ مجھے شادی کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں کسی بھی مرد کا عورت سے تعلق بیوی شوہر کا ہی ضروری نہیں ہے۔ ماں کا پیار اور بہن کا پیار بھی تو ہوسکتا ہے۔

بلونت: ایک مرد میں باپ کا پیار بھی ہوتا ہے۔ شادی کے بنا اس کی اس خواہش کی تسلی کیسے ہوسکتی ہے؟

ساحر: مجھے کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ میری دو چھوٹی بہنیں ہیں، جنھیں میں بہت پیار کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، میرے اندر باپ کے پیار کی خواہش اسی طرح سے پوری

ہو جاتی ہو۔

بلونت: لباس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ساحر: مجھے سردیوں میں مغربی لباس اچھا لگتا ہے اور گرمیوں میں جو مل جائے اسی سے گزارا ہو جاتا ہے۔

بلونت: شاعری کے علاوہ آج کل آپ کو اور کن کن چیزوں سے دلچسپی ہے؟

ساحر: کالج کے زمانے میں کرکٹ کھیلا کرتا تھا۔ بعد میں تصویریں اور ریکارڈ جمع کرنے کا شوق رہا۔ آج کل رائٹروں کی آواز ریکارڈ کیا کرتا ہوں۔

بلونت: کھانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ساحر: جو بھی چیز آسانی سے مل جائے وہ میں کھا لیتا ہوں۔ کسی خاص چیز کا شوق نہیں ہے۔ پہلے گوشت کھایا کرتا تھا۔ لیکن اب گوشت کھانے سے الجھن ہوتی ہے۔ اپنے پیٹ کی خاطر کسی بے زبان کی جان لینا اچھا نہیں لگتا۔

☆☆☆

ادب ساز ساحر لدھیانوی نمبر شمارہ...... 2010 سے ماخوذ

بچوں کی کہانیاں

ایک رات

ریل گاڑی رات کے گیارہ بجے چلنے والی تھی۔ میں نے ساڑھے دس بجے ہی فرسٹ کلاس کے ڈبّے میں ایک سرے والی نچلی سیٹ پر بستر لگا دیا۔ میں ہمالیہ کی ترائی میں شکار کے لیے جا رہا تھا۔ اس لیے میری دونالی بندوق اور رائفل میرے پاس تھیں، جنھیں میں نے اپنے پہلو میں بستر کے نیچے چھپا دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ناحق دوسروں کی ان پر نظر پڑے۔

اس ڈبّے میں کل پانچ برتھ تھیں۔ ایک میرے اوپر والی، دوسری میری داہنی طرف ڈبّے کے بیچوں بیچ، تیسری دوسرے سرے پر، چوتھی، تیسری کے اوپر، ایک دروازہ میرے پاؤں کی طرف کھلتا تھا، اور دوسرا دروازہ تیسری برتھ کے قریب کھلتا تھا۔ باتھ روم میرے پاؤں کی طرف تھا— پانچویں برتھ میری اپنی تھی۔

ان سیٹوں کی یوں تفصیل بیان کرنے کا بھی ایک سبب ہے—

میں بستر پر آرام سے دراز ہوگیا۔ باقی مسافر، جنھوں نے اس ڈبّے میں اپنی برتھ ریزرو کروا رکھی تھی، رفتہ رفتہ آنے لگے۔ میرے اوپر والی سیٹ پر پھولے پیٹ اور گچھے دار مونچھوں والے کوئی صاحب تھے۔ بیچ والی سیٹ پر کوئی کاروباری قسم کے انسان تھے۔ تیسری سیٹ کے مالک گورے چٹے رنگ کے کھاتے پیتے رئیس نظر آئے تھے۔ چوتھی سیٹ پر کس کر

بندھی ہوئی داڑھی والے لمبے تڑنگے سردار جی تھے۔

گاڑی کے چلنے کا وقت ہوگیا تو گارڈ نے سیٹی دے دی۔ گاڑی کے بھاری بھرکم پہیوں کو حرکت ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی مزے میں ہچکورے لینے لگی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں پنگوڑے میں لیٹا ہوا ننھا سا بچہ ہوں۔ تھوڑی ہی دیر بعد نیند آ گئی۔

عجیب بات ہے کہ گھر میں معمولی شور بھی ہو تو نیند کوسوں دور بھاگ جاتی ہے لیکن ریل گاڑی میں ٹانگیں پسارنے کو جگہ مل جائے تو انسان گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے بے نیاز مزے کی نیند سو جاتا ہے۔

اچانک میری نیند ٹوٹ گئی۔

میں نے اَدھ کھلی آنکھیں اِدھر اُدھر دوڑائیں، لیکن کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ گاڑی مقررہ رفتار پر چلی جا رہی تھی۔ سب مسافر سو رہے تھے۔ غسل خانے کی بتی جان بوجھ کر روشن چھوڑ دی گئی تھی۔ وہاں کے دروازے کے اوپر سے روشنی نکل کر پھیلی ہوئی تھی۔ ڈبّے کی فضا خواب ناک ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں چند گھنٹہ گہری نیند سو چکا ہوں۔

اتنے میں تیسری برتھ کا گورا چٹا مسافر اٹھا۔ وہ میرے پاؤں کی طرف غسل خانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر گھس کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ باقی سب مسافر پڑے سوتے رہے، کچھ دیر کے بعد مسافر نمبر 3 غسل خانہ میں سے باہر نکلا۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے سونے ہی کو تھا کہ وہ مسافر اپنی سیٹ کی جانب بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گیا۔

مجھے تعجب ہوا۔ میں چپ چاپ لیٹے لیٹے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ میری برتھ کی پائنتی کی جانب گاڑی کے دروازے کو ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔ پھر وہ ایک دم بول اٹھا، ''تم کون ہو؟''

یہ سوال وہ کس سے کر رہا تھا؟ کمرے میں اور کوئی تو جاگ نہیں رہا تھا۔ لیکن اس مسافر کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ چہرے پر ہیجان کے آثار تھے۔

میں نے سوچا کہ کہیں یہ پاگل تو نہیں ہے۔

پھر وہ جھپٹ کر اپنے تکیے کے نیچے سے ایک پستول نکال لایا، اور اس کی نالی کا رخ

دروازے کی طرف کر کے پہلے سے بھی زیادہ اونچی آواز میں بولا۔ ''کون ہو تم؟''

اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں کہنیاں بستر پر ٹیک کر اوپر کو اٹھا اور پوچھا، ''کیا بات ہے؟''

اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''دروازے کے باہر کوئی ڈاکو کھڑا ہے، اس کے ہاتھ میں پستول ہے۔ گلے میں چمڑے کی پٹی ہے۔''

میں نے بٹن دبا کر بڑا بلب روشن کر دیا۔ اس شور سے دوسرے مسافر بھی ایک ایک کر کے جاگ اٹھے۔ ہم نے دیکھا کہ دروازے کے باہر سچ مچ کوئی آدمی کھڑا تھا۔ اس نے بنیان پہن رکھا تھا۔ اس کے اوپر اس کے سینے پر سے ہو کر نیچے کو آتی ہوئی چمڑے کی پٹی چمک رہی تھی۔

وہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

مسافر نمبر 3 نے کہا ''اس کے ہمراہ ضرور اس کے ساتھی بھی گاڑی سے لٹکے ہوں گے۔''

ہم پانچوں مسافر صلاح مشورہ کرنے لگے کہ اب اس سلسلہ میں کیا قدم اٹھایا جائے۔ گاڑی کی زنجیر کھینچ دیں، یا دروازہ کھول دیں — آخر ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہم تعداد میں پانچ ہیں، ہمارے پاس دو پستول، ایک بندوق اور ایک رائفل موجود ہے۔ کیوں نہ دروازہ کھول دیا جائے۔ اگر ہم دروازہ تھوڑا سا کھولیں گے تو ایک دم سب ڈاکو دندناتے ہوئے اندر نہیں چلے آئیں گے۔ اگر وہ ہم پر حملہ بولیں گے تو ہم بھی گولیاں چلا دیں گے۔

چنانچہ مسافر نمبر 4 یعنی سردار جی اپنا پستول تان کر دروازہ کی اوپر والی سیٹ پر ڈٹ گئے۔ میں نے اپنی بندوق مسافر نمبر 2 کو دے دی اور رائفل خود سنبھالی۔ مسافر نمبر 3 پہلے ہی کی طرح پستول لیے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ مسافر نمبر 5 زنجیر کے پاس کھڑا ہو گیا، تاکہ ضرورت پڑنے پر فوراً زنجیر کھینچ دے۔

اس طرح تیار ہو کر پروگرام کے مطابق مسافر نمبر 3 نے دروازہ کھول دیا۔ ہم سب کارروائی کرنے کو بالکل تیار تھے۔

دروازے کے آگے ایک سہا ہوا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے گلے میں تھرمس کی بوتل کی پٹی تھی۔ ہم نے باہر جھانکا اس کا کوئی ساتھی نظر نہیں آیا۔

نووارد نے بتایا کہ پچھلے اسٹیشن پر وہ تھرمس میں چائے بھروانے کے لیے اترا تھا۔ چائے لیتے تک گاڑی چل دی۔ ہمارا ڈبا اس کے سامنے سے گزرا۔ وہ اسی پر لٹک گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگلا اسٹیشن جلد ہی آجائے گا، لیکن جب اس کے بازو تھک گئے تو اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا......

ہمارے پستول، رائفل، بندوق دیکھ کر اس کی گھگھی بندھ گئی۔ الٹے ہم ہی اسے تسلیاں دینے لگے۔

وہ اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔

آج بھی اس رات کا خیال آتا ہے تو رونگٹے بھی کھڑے ہوجاتے ہیں اور ہنسی بھی آتی ہے۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ کھلونا، نئی دہلی، سنہ نامعلوم...... میں شائع ہوئی تھی۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

بات ایک رات کی

بچو، تم نے فرضی کہانیاں تو بہت سی پڑھی ہوں گی لیکن میں آج ایک سچا واقعہ پیش کرتا ہوں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے فرضی کہانی لکھنی ہی نہیں آتی، لیکن میں نے سوچا کہ ہر وقت گپ ہانکنا بھی اچھا نہیں، کبھی کبھی سچ بھی بولنا چاہیے۔

یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب میں بھی تمھاری طرح بچہ تھا — بچہ کیا، اچھا خاصہ لڑکا تھا۔ ان دنوں میں دہرہ دون میں رہتا تھا۔ یہ واقعہ وہیں پیش آیا تھا۔

آج کا دہرہ دون میرے دہرہ دون سے بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بندال ندی کے اس پار جو چائے کا باغ تھا، وہ اب نہیں رہا۔ شہر سے نکل کر بندال ندی کا پل پار کرنے پر ایک سڑک داہنی طرف اور دوسری بائیں طرف جاتی نظر آتی تھی۔ یہ دو سڑکیں اب بھی موجود ہیں، لیکن اب یہ آباد ہوگئی ہیں۔ ان کے دونوں طرف مکانات بن گئے ہیں۔ ان دنوں بائیں ہاتھ والی سڑک بہت سنسان رہا کرتی تھی۔ وہ چائے کے باغ میں سے گزرتی تھی۔ رات کے وقت اس کے دونوں طرف جنگلی جانوروں کی بھیانک آوازیں سنائی دیا کرتی تھیں۔

ایک شام کو میں اپنے شہر کے مکان میں بیٹھا ایک دوست ہربنس سنگھ کے ساتھ گپ ہانک رہا تھا۔ میری والدہ صاحبہ پرنس آف ویمنز کالج اپنی ایک سہیلی کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ مجھ

سے کہہ گئی تھیں کہ شام تک میں بھی وہیں پہنچ جاؤں کیوں کہ رات وہیں گزارنے کا ارادہ تھا۔

ان دنوں یہ کالج چائے کے باغ کے اس پار تھا۔ اب یہ سینک اسکول کہلاتا ہے۔
گپوں میں اتنا مزا آ رہا تھا کہ میرے دوست نے کہا۔ ''ابھی رکے رہو۔ پھر میں سائیکل پر تمھیں وہاں تک چھوڑ آؤں گا۔''

اس طرح باتوں ہی باتوں میں نو بج گئے۔ سردیوں کا موسم تھا، رات کا وقت۔ میں نے سوچا کہ والدہ صاحبہ بہت پریشان ہو رہی ہوں گی۔ خیر ہم دونوں کی سواری روانہ ہوئی ہربنس سائیکل چلا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے کیریر پر بیٹھا تھا۔ ہربنس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی اور میرے ہاتھ میں چار فٹ لمبا ڈنڈا تھا۔ ہم نے ضرورت سے زیادہ بہادری سے کام لیتے ہوئے مختصر راستے سے جانے کی ٹھانی جو چائے کے باغ میں سے ہو کر گزرتا تھا۔

ان سڑکوں پر بھیڑیے، بھالو، گیدڑ اکثر دکھائی دے جاتے تھے۔ قریب کی چھاؤنی میں ایک بار ایک شیر آ گھسا تھا۔ ان سب باتوں کا علم ہوتے ہوئے بھی ہم اس جنگل میں گھس پڑے۔ ہم پتلی سی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔ ہمارے داہنے ہاتھ پر ایک برساتی نالہ تھا جو ان دنوں سوکھا پڑا تھا۔

ایک موڑ سے گھومتے وقت اچانک ہمیں ڈراؤنی چنگھاڑ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ ہم سمجھ پاتے کہ حقیقت کیا ہے۔ ہمارے بائیں پہلو والے پیڑ پر زوردار سرسراہٹ ہوئی اور پھر کسی جانور نے شاید پیڑ ہی کے اوپر سے ہم پر چھلانگ لگا دی۔

سائیکل لڑکھڑا کر تین فٹ نیچے نالے میں جا گری اور اس کے ساتھ ہم بھی لڑھک گئے۔ نہ ڈنڈے کی خبر رہی، نا ٹارچ کی۔ دھندلکے میں ہمیں تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ایک پرچھائیں سی دکھائی دی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا تھا کہ اس جانور نے مجھ پر حملہ بول دیا۔ میں گھبرا کر جلدی سے پیچھے ہٹا، پھر بھی اس کے ناخن میرے کوٹ کے کالر میں پھنس گئے۔ نہ جانے لمحہ بھر بعد کیا ہوتا اگر میرا ساتھی اس کی دم نہ پکڑ لیتا۔

یوں تو مجھے بھی کسرت کا بہت شوق تھا، لیکن ہربنس مجھ سے زیادہ طاقت ور اور دلیر

تھا۔ وہ جانور کی دم کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اپنے پاؤں پر گھومتا اور اسے گھماتا ہوا پرے لے گیا۔ پھر دم اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ جانور اس کی طرف لپکا۔ ہربنس نے مدد کے لیے مجھے پکارا۔ اسی اثنا میں ڈنڈا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے پوری طاقت سے ڈنڈا جانور کو پھینک کر مارا نشانہ سر کا باندھا تھا، لیکن لگا اس کی پچھلی ٹانگوں پر۔ اس چوٹ سے وہ کچھ کم زور پڑ گیا۔ اس نے غرا کر میرا رخ کیا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ہم میں جس پر حملہ ہوتا وہ کچھ نہ کر پاتا۔

اب ہربنس نے ڈنڈا سنبھالا اور اس سے پہلے کہ جانور جست لگاتا، اس نے ڈنڈے کی ضرب اس کے سر پر لگائی۔ جانور حواس باختہ ہو گیا۔ اب کیا تھا، ہربنس نے پے در پے ڈنڈے کے وار کیے — یہاں تک کہ جانور مر گیا۔

جانور کے مر جانے کے بعد ہی ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ ہماری جانیں بچ گئی ہیں۔ تلاش کے بعد ٹارچ ملی تو اس کی روشنی میں پتہ چلا کہ وہ جانور دراصل چیتا تھا۔ وہ یا تو چھوٹی قسم کا چیتا تھا، یا کم عمر تھا، ورنہ اگر بڑا چیتا ہوتا تو ہم دونوں کا کام یقیناً تمام کر دیتا۔

ہم چیتے کو سائیکل پر لاد کر منزل تک پہنچے جہاں چیتا بھنگیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میرا دوست واپس شہر چلا آیا۔

اب بھی جب اس بھیانک رات کا خیال آتا ہے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ 'کھلونا' فروری 1967 میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

ٹارزن

ٹارزن میرے کتے کا نام تھا۔

یہ کوئی جھوٹی بات نہیں ہے۔ وہ سچ مچ میرا کتا تھا اور میں واقعی اس کا مالک تھا۔ آج بیس برس گزر جانے پر بھی مجھے وہ صبح یاد ہے جب مسوری کی ایک چکردار پہاڑی سڑک پر میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میرے برابر میں دو مہینے کا پلا چل رہا تھا۔ یعنی یہی ٹارزن۔

اُن دنوں میں ابھی طالب علم ہی تھا۔ ہندوستان کے دو حصوں میں بٹ جانے کے بعد چاروں طرف لڑائی اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ میں مسوری میں اپنے ایک ہم عمر دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ وہیں مجھے ایک دن پتہ چلا کہ ایک صاحب کتے بیچنے کا کام کرتے ہیں۔ مجھے السیشین کتوں سے دل چسپی تھی اور ان کا ''کتا گھر'' صرف اسی نسل کے لیے وقف تھا۔

چند دن اس سلسلے میں ان سے بات کرنے میں گزر گئے۔ اُن کا نام شاید زیڈ اے خان تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ میدانی علاقے میں سرکاری ملازمت کرتے تھے اور یہ کتوں کا بیوپار فالتو وقت میں کیا کرتے تھے۔ وہ بے حد ملنسار اور چرب زبان شخص تھے۔ کتوں کے بارے میں اُن کی معلومات کا ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ اس موضوع پر باتیں کرتے تو سننے

والوں کو ایسا لگتا جیسے مشاعرے میں بیٹھے کسی نامور اُستاد کا کلام سن رہے ہوں۔

بات چیت مسٹر خان کی چھوٹی سی بیٹھک میں چلا کرتی تھی۔ ان کے بنگلے میں کتے ہنگامہ مچاتے رہتے تھے۔ عمر رنگ روپ کے لحاظ سے وہ مختلف ہوتے تھے لیکن نسل ایک ہی ہوتی تھی۔۔۔ یعنی السیشین۔

اُس زمانے میں مسوری کا اہل اشٹیش راجاؤں مہاراجاؤں اور رئیسوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کتے بھی لاتے تھے بلکہ کتے صاحب لوگوں سے پہلے آجاتے تھے کیونکہ اُنھیں میدانوں کی گرمی راس نہیں آتی تھی۔ یوں تو کئی نسلوں کے کتے مسوری کی سڑکوں پر دکھائی دیتے تھے لیکن ان میں زیادہ تر میری پسندیدہ نسل کے ہی ہوتے تھے۔ اُن کے رنگ بھورے یا گہرے سرمئی، یا دونوں ملے جلے ہوتے تھے لیکن مسٹر خان کے یہاں مجھے ایسے السیشین دکھائی دیے جو سر سے پاؤں تک اور تھوتھنی سے دم کی نوک تک یا تو برف کی طرح سفید ہوتے تھے یا بالکل سیاہ۔ یہ رنگ شوقینوں میں مقبول نہیں تھے۔ البتہ خان صاحب نے بتایا کہ سفید رنگ کے کتے بے حد غصیلے ہوتے ہیں۔

ایک دن چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے خان صاحب نے ٹارزن کے باپ سے میری جان پہچان کرانے کے لیے اونچی آواز میں اُسے پکارا ''پرنس! پرنس!''

اُن کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوتی تھی کہ ایک بھر پور جسم والا جوں سال اور، جواں مرد کتا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کو دیکھ کر ایک بار تو میرا دل دہل سا گیا۔ دیکھنے میں وہ زیادہ ڈراؤنا کتا نہیں تھا، لیکن یہ ضرور لگتا تھا کہ ایک بار وہ کسی کا ٹینٹوا اپنے مضبوط جبڑوں میں تھام لے تو اُسے جہنم کے دروازے تک پہنچائے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

خان صاحب نے فوراً پرنس کے گن گانے شروع کر دیے۔ کتا ہر لحاظ سے مجھے اتنا پسند آیا کہ اُس کے بارے میں خان صاحب کی ہر بات کو صحیح ماننا ہی پڑا۔ اُنھوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ فلاں ریاست کی مہارانی صاحب نے پرنس کے لیے سات ہزار روپے کی آفر کی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا ہے۔

اس طرح مجھے گرمانے اور برمانے کے بعد خان صاحب نے پرنس کے بیٹے

ٹارزن کو میرے حوالے کر دیا، اور میرے شوق اور مالی حالت کے پیشِ نظر انھوں نے صرف تین سو روپے وصول کیے۔

مجھے ٹارزن نام پہلے ہی سے پسند تھا۔ بچپن میں ایک فلم دیکھی تھی جو ایک ایسے جنگلی ہیرو کے کارناموں سے لبریز تھی جسے افریقہ کے جنگلوں میں بندروں نے پالا تھا۔ اس سیریز کی پہلی فلم کا نام شاید ''ٹارزن دی ایپ مین'' تھا اس فلم میں ٹارزن کا رول ادا کرنے والے ایکٹر کا نام جونی ویسمُلر تھا۔ وہ قد آور، جوان، طاقت ور اور تیراکی کا چیمپئن تھا۔ اس نام نے جب ہی سے میرے دل پر جادو چلا رکھا تھا۔ شاید خان صاحب نے یہ سمجھ کر کہ یہ لڑکا اس نام کو پسند کرے گا جان بوجھ کر میرے کتے کا نام ٹارزن تجویز کیا تھا۔

چھوٹی سی عمر میں بھی ٹارزن خوب موٹا تازہ اور ٹھوس تھا۔ میں اسے بغل میں دبا کر رہائش گاہ کو روانہ ہوا۔ کبھی کبھی تھک کر مجھے بازو بھی بدلنا پڑتا تھا۔

مسوری والے گھر میں پہنچا تو میرا ساتھی ٹارزن کو دیکھ کر کچھ خوش نہیں ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ٹارزن نے اس کا من موہ لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس نسل کے کتے نہایت ذہین اور حساس ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست فوج میں میجر ہیں۔ انھیں بھی کتوں سے گہری دلچسپی ہے۔ انھوں نے اعلیٰ نسل کی ایک کتیا پالی، ایک روز غلط طور پر کتیا کو ڈانٹ دیا۔ بس جناب! کتیا کا موڈ خراب ہو گیا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس جانور نے اشرف المخلوقات کو معاف نہیں کیا۔ آخر جب نئے مالک کے پاس پہنچی تو کتیا کا موڈ ٹھکانے پر آیا اور اس نے باقاعدگی سے کھانا پینا شروع کر دیا۔

اسی طرح نیو فاؤنڈ لینڈ کے کتے کی ذہانت کی مثال میرے سامنے ہے۔ لڑکپن میں میرے والدین دہرہ دون کے ایک انجینئر صاحب کے یہاں جایا کرتے تھے۔ شاید اُن سے ہماری دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ ہم جب جاتے تو وہاں دو چار دن تک ٹکے رہتے۔ ان کے یہاں جیک نامی کتا تھا جو نیو فاؤنڈ لینڈ کی نسل سے تھا۔ انجینئر صاحب خود اپنے ساتھ اُسے کھلا کر دفتر کو جایا کرتے تھے۔ کسی روز جب کبھی باورچی کھانا دینا بھول جاتا تو 'جیک' خفا

ہو جاتا، لیکن خاموش رہتا۔ شام کو صاحب دفتر سے واپس آتے تو جیک اپنے بھوجن کا تام چینی کا خالی برتن دانتوں سے پکڑ کر صاحب کے سامنے جا کر رکھ دیتا۔ انجینئر صاحب مطلب سمجھ جاتے اور باورچی کو آواز دے کر کہتے "تم نے آج جیک کو کھانا نہیں کھلایا نا! دیکھو تمھاری شکایت کر رہا ہے۔" — جیسے جیک کو معلوم تھا کہ باورچی تو صرف نوکر ہے اور اگر وہ کوئی غلطی کرے تو اس کی شکایت بڑے صاحب سے ہی ہونا چاہیے۔

ٹارزن بلا کا ذہین تھا۔ کتا غصے میں ہے یا خوش اس کا پتہ تو خیر چل ہی جاتا ہے۔ لیکن ٹارزن شرمندگی، تعجب، پچھتاوے اور ذہنی کشمکش کا اظہار بھی بخوبی کر سکتا تھا۔ چند دن میں میرے ساتھی کو بھی ٹارزن سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی اور وہ ہم دونوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔

ٹارزن کو سکھایا گیا تھا کہ وہ خود اپنا کھانا بھی بغیر اجازت کے نہ کھائے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ ٹارزن کے سامنے اس کا کھانا رکھ دیا جاتا تو بھی وہ اس بات کا انتظار کرتا کہ اُس سے کھانا شروع کرنے کے لیے کہا جائے' ورنہ وہ دم سادھے بیٹھا رہتا۔ اُسے ہاتھ ملانا بھی سکھایا گیا۔ جس کسی سے کہا جاتا وہ اس سے اپنا پنجہ ملا لیتا تھا۔ جب گھر کا کوئی آدمی کہتا، "ٹارزن! ہاتھ ملاؤ" تو وہ بڑی شان سے بڑھ کر آگے کو آتا اور اپنا پنجہ بڑھا دیتا۔

کھیل کھیل میں ہم ہر وقت اس سے ہاتھ ملانے پر تلے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ اس مشغلے سے بے زار بھی ہو جاتا۔ ایسی حالت میں اسے ہاتھ ملانے کے لیے کہا جاتا تو وہ دور کونے میں سے ہی پنجہ اٹھا دیتا۔ اُس کی شکل سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہاتھ ملانے کو وہ سنجیدہ اور شریفانہ کام سمجھتا تھا۔ اور اس کام کو مذاق بنا کر رکھ دینا اُسے ہرگز گوارا نہیں تھا۔

السیشین نسل کے کتوں کے کان ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں۔ لیکن بچپن میں کان نیچے گرے رہتے ہیں۔

مجھے بڑا ارمان تھا کہ ٹارزن کے کان جلد کھڑے ہو جائیں۔ خان صاحب تسلیاں دیتے کہ بڑا ہونے پر اس کے کان خود کھڑے ہو جائیں گے۔ خدا خدا کر کے ٹارزن نے ایک کان کھڑا کیا۔ ہم نے بڑی خوشی منائی۔ اُس روز اسے اور بھی بہتر کھانا دیا۔ ٹارزن کی سمجھ میں

نہیں آیا کہ اس کی اتنی خاطر کیوں ہو رہی تھی اور ہم اس قدر خوش کیوں تھے؟

جب میں مسوری سے الہ آباد آیا تو اس وقت تک ٹارزن کے دونوں کان کھڑے ہو چکے تھے۔ مجھے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں دہلی جانا پڑا۔ میں نے ٹارزن کو والد صاحب کے حوالے کر دیا، کیوں کہ وہ بھی کتوں کے بڑے شوقین تھے۔ اب ٹارزن اُن ہی کا ہو کر رہ گیا۔

اُن دنوں شہر الہ آباد میں شاید ہی کسی کے پاس اس نسل کا کتا رہا ہوگا۔ چنانچہ جب میں ٹارزن کے پٹے سے زنجیر باندھ کر باہر نکلتا تو بازار میں لوگ کائی کی طرح پھٹ کر اِدھر اُدھر ہو جاتے۔ عام لوگوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کتا ہے کوئی اسے سیار سمجھتا، کوئی لکڑ بگڑ کہتا تھا۔ ایک بزرگ خاتون نے پہلے تو اسے ہرن بتایا اور پھر اسے بکرا سمجھ بیٹھیں۔ عام طور پر اُسے سدھایا ہوا بھیڑیا سمجھا جاتا تھا۔

السیشین کافی بڑا کتا ہوتا ہے لیکن بہت بڑی نسل کا نہیں مانا جاتا۔ گریٹ ڈین Great Dane، سنٹ برنارڈ St. Bernard، مسٹیف Mastiff اور نیو فاؤنڈ لینڈ بڑے بھاری بھرکم کتوں میں شمار ہوتے ہیں۔ کندھے سے زمین تک بڑے کتے چالیس انچ تک کے بھی ہوتے ہیں، لیکن اکثر کم اونچائی کے ہوتے ہیں۔ السیشین نر کی اونچائی پچیس انچ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اُس کتے کی پچھلی ٹانگیں اس قدر لچک دار ہوتی ہیں کہ وہ ایک دم پیچھے کی طرف مڑ سکتا ہے۔ ایک بار ٹارزن میرے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک آدمی بچھڑے کو ڈنڈے سے ہانکتا ہوا آیا۔ جب وہ آدمی میرے برابر میں پہنچا تو اُس کے اوپر کو اٹھے ہاتھ کی وجہ سے ٹارزن سمجھا کہ وہ مجھے ڈنڈا مارنے والا ہے' چنانچہ ٹارزن پلک جھپکتے میں مڑ کر اُچھلا اور اس نے اُس شخص کی کلائی ہوا میں تھام لی۔ غنیمت یہ ہوا ٹارزن نے بس اس کے ہاتھ کو روک دیا، اسے کاٹا نہیں۔

یہ کتا کئی خوبیوں کا مالک ہوتا ہے۔ اسے بے حد شریف مزاج کا مانا جاتا ہے۔ وہ صرف اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ کسی غیر سے کبھی مانوس نہیں ہوتا۔ صحیح ذات والے السیشین کی چال مخصوص انداز کی ہوتی ہے۔ اُس کی گپھے دار دُم کبھی کمر کی سطح سے اوپر نہیں

اٹھتی۔ ہاں کبھی کبھی انتہائی غصے کی حالت میں ایسا ہو بھی جاتا ہے۔

دہلی میں ملازمت کے باعث ٹارزن کا اور میرا ساتھ قائم نہیں رہ سکا۔ والد مرحوم نے اس کی عادتوں کو بے حد بگاڑ دیا تھا۔ مگر اُن دونوں کا آپس میں بہت پیار تھا۔ ٹارزن سے پہلے والد صاحب نے وفات پائی۔ اس رات اُن کی موت سے پہلے ٹارزن نے کئی بار تھوتھنی اوپر کو اٹھا کر رونے کے انداز میں مہیب آواز نکالی — کیا اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ والد صاحب کی موت قریب آ چکی تھی؟

ٹارزن طبعی عمر پا کر مر گیا۔ اس کی موت پر مجھے اتنا دکھ ہوا کہ دل سے کتے پالنے کا شوق ہی جاتا رہا۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ کھلونا دہلی سنہ نامعلوم میں پہلی بار شائع ہوئی۔ کسی مجموعے میں نہیں ہے کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

شکار کا شکار

یہ کہاوت تو اکثر بچوں نے سن رکھی ہوگی کہ نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملاّ، خطرۂ ایمان۔ لیکن آج میں بچوں کو اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنا کر یہ بتاؤں گا کہ شکاری کے اناڑی ہونے پر کیا کیا خطرہ پیش آسکتا ہے۔

وہ اناڑی شکاری میں خود ہی تھا۔

انسان کو اپنی زندگی کے ہر دور میں الگ الگ شوق پیدا ہوتے ہیں جن کی تسکین کے لیے وہ کوشش کرتا رہتا ہے۔ ننھے بچے رنگ برنگ کھلونوں سے کھیلتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں تو رنگین گولیوں سے کھیلتے ہیں، پتنگ اڑاتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والے لڑکے لڑکیاں 'کھلونا' جیسے رسالے پڑھتے ہیں۔ جوان ہوکر بیسیوں مشغلوں میں سے کچھ خاص جواں مردی کے شوق بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک شکار کھیلنا بھی ہے۔

کسی زمانے میں مجھے بھی شکار کا بہت شوق تھا۔ پہلے تو میں نے دو نالی بندوق خریدی اور اس سے پرندوں کا شکار کرتا رہا۔ نشانہ بہتر ہوگیا تو اڑتے ہوئے پرندے بھی زد میں آجاتے۔ میرا دل بہت حساس تھا۔ اس لیے کچھ دن کے بعد معصوم اور بے ضرر پرندوں کے شکار سے جی اوب گیا۔

ان ہی دنوں کچھ بڑے بڑے شکاریوں کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں سے میں جم کاربٹ سے بہت متاثر ہوا جو ہندوستان کے جنگلوں میں زیادہ تر آدم خور شیر کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک یورپین شکاری کی کتاب بھی بہت دلچسپ لگی۔ اس کا نام شاید جان ہنٹر تھا۔ وہ پیشہ ور شکاری تھا— یعنی وہ خود بھی شکار کھیلتا تھا اور افریقہ میں اس مقصد سے آنے والے رئیسوں کو بھی شکار کھلایا کرتا تھا۔

ان مشہور اور ماہر شکاریوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو میں بہت ہیچ محسوس کرنے لگا۔ اس لیے سوچا کہ اب شکار کسی خطرناک جانور کا ہونا چاہیے۔ اسی دھن میں ایک رائفل خرید ڈالی۔ اس رائفل میں چھ گولیاں ایک وقت میں بھری جاتی تھیں اور انھیں ایک ایک کر کے چلایا جاتا تھا۔

دہرہ دون میں میرے کچھ دوست رہتے تھے۔ ان کے ساتھ آس پاس کے علاقے میں شکار کھیلنے کے پروگرام بنا کرتے تھے۔ مگر جب میں رائفل سے لیس ہو کر وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ ان دنوں بڑے شکار کا انتظام ٹھیک نہ ہو سکے گا۔ مایوسی تو ہوئی، پھر بھی دو نالی بندوق لے کر اِدھر اُدھر کے دیہات میں نکل جاتا۔ ایک آدھ جنگلی مرغی، تیتر یا مرغابی کو نشانہ بنا کر شکار کی ہوس پوری کر لیتا۔

ایک دفعہ دیہات میں گھومتے گھومتے ایک کسان سے ملاقات ہوگئی۔ میرے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے اپنے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر کہا ''سلام صاحب!''

میں نے سلام کا جواب دیا اور پھر بات چیت شروع ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے کسان ان دنوں ایک جنگلی درندے کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ وہ درندہ ان کی بھیڑ بکریاں اٹھا کر لے جاتا تھا، گایوں، بیلوں پر حملہ کر دیتا تھا، یہاں تک کہ کتوں کو بھی مار کر کھا جاتا تھا۔

ہمیں باتیں کرتے دیکھ کر بہت سے دیہاتی ہمارے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے پوچھا ''کون سا جانور ہے یہ؟''

''باگھ۔''

یوں تو باگھ شیر کو کہتے ہیں، لیکن دیہاتی چیتے کو بھی اسی نام سے پکارتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ کسی کتاب میں لکھا تھا کہ چیتا کتوں کو بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ اس لیے میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ شیر نہیں، کسی قسم کا چھوٹا یا بڑا چیتا ہوگا۔

اصلیت جو کچھ ہو، مجھے یہ خبر سن کر بڑا اطمینان ہوا۔ میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا ''کوئی بات نہیں میں آپ لوگوں کی خاطر اس جانور کا شکار کروں گا۔''

مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر وہ بے چارے اپنے ہاتھ جوڑنے لگے اور میرے پاؤں چھونے لگے۔ میں نے انھیں بتایا کہ اتنے بڑے جانور کا شکار دونالی بارہ بور کی بندوق سے نہیں کھیلا جا سکتا، اس کے لیے میں رائفل لاؤں گا۔

چنانچہ اگلی رات کے لیے پروگرام بن گیا۔

میں نے اپنے شکاری دوستوں کے صلاح مشورے کو غیر ضروری سمجھ کر ان سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا اور دوسری شام کو اس گاؤں میں پہنچ گیا۔

دیہاتی میری راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے تھے۔ بڑے ادب سے انھوں نے میرا استقبال کیا۔ میں پہلے ہی سے کھانا کھا کر چلا تھا لیکن انھوں نے بہت اصرار سے مجھے گرما گرم دودھ پلایا۔ میلے کچیلے کپڑوں والی دیہاتی عورتیں گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس اس شدت سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دل کی گہرائی میں مجھے عجیب قسم کی خوشی اور فخر کا احساس ہونے لگا۔

مجھے گاؤں سے دور ایک ویران علاقہ میں پہنچا دیا گیا، ایک ادھیڑ عمر کے دیہاتی نے بتایا کہ شکار کا پورا انتظام ہو چکا ہے۔

زمین میں ایک جگہ چار، ساڑھے چار فٹ گہرا گڑھا کھود دیا گیا تھا کچھ لکڑیوں کو آپس میں باندھ کر ایک ڈھکن سا تیار کیا گیا جو گڑھے کے منہ پر رکھ دیا گیا تھا۔ مجھے رات بھر اس گڑھے میں رہنا تھا۔ گڑھے سے تقریباً ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر ایک بکری زمین میں گڑے ہوئے کھونٹے سے باندھ دی گئی تھی۔ دیہاتیوں کے بیان کے مطابق باگھ آس پاس کے علاقہ میں موجود تھا۔ رات کے وقت بکری کی بو پا کر وہ وہاں آئے گا اور میں گڑھے میں

بیٹھا بیٹھا رائفل سے اس پر گولی چلا دوں گا۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ میرے لیے کسی پیڑ پر مچان بنایا جائے گا۔ مگر مجھے بتایا گیا ایک بے حد تجربہ کار دیہاتی نے یہ ترکیب نکالی تھی۔ میں نے سوچا چلو یہ تو پھر گڑھا ہے، جم کاربٹ تو آمنے سامنے شیر پر گولی چلا دیا کرتا تھا۔

مجھے گڑھے میں اتار کر اور اس کا منہ لکڑیوں کے ڈھانچے سے ڈھک کر سب دیہاتی رخصت ہو گئے۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ کچھ دیر بعد کھلے علاقہ کی ٹھنڈی ہوا کے باعث میں سکڑ نے کانپنے لگا اور رفتہ رفتہ میرے دانت بجنے لگے۔

دور جھاڑیوں کے بے چاری بکری بھی میری طرح سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ عجب صورت حال ہے!

سردی کے باوجود مجھے نیند سی آنے لگی۔ نہ جانے کب میں سو گیا— پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی گھڑی پر ڈالی تو ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ لمحہ بھر کو میں سمجھ نہیں سکا کہ میری نیند اس طرح اچاٹ ہو جانے کا سبب کیا تھا۔ پھر یکایک مجھے احساس ہوا کہ بکری زور زور سے مَیں مَیں! کر رہی ہے۔ میں نے اپنے سر سے گڑھے کے اوپر رکھے ہوئے ڈھانچے کو ذرا اٹھا کر دیکھا تو بکری کو بے قراری سے اِدھر اُدھر اچھلتے پایا۔ کھونٹے کی وجہ سے وہ مجبور تھی۔ ورنہ بھاگ گئی ہوتی۔

میں معاملے کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بکری کے قریب مجھے کسی درندے کا سایہ دکھائی دیا۔ میں نے سوچا یہی وہ باگھ ہے۔

میں چاہتا تھا کہ بکری کی جان بھی بچ جائے اور باگھ بھی مر جائے۔ مشکل یہ تھی کہ نشانہ کیسے باندھوں، کیوں کہ وہ سایہ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ غالبًا وہ بکری کو مارنے ہی والا تھا۔ زیادہ انتظار نا مناسب سمجھ کر میں نے اس حرکت کرتے ہوئے سائے پر ہی گولی چلا دی۔

رائفل کے نشانے کی میری کوئی خاص مشق نہیں تھی اور پھر حرکت کرتے ہوئے

سائے پر مدھم روشنی میں ٹھیک طرح نشانہ لگانا بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا— بہر حال گولی چلتے ہی غراہٹ کی آواز سنائی دی، اور پھر دوسرے ہی پل وہ درندہ گڑھے کے اوپر والے ڈھانچے پر موجود تھا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ تیزی سے فرار ہوتے وقت اس کا پنجہ ڈھانچے پر پڑ گیا یا اس نے جان بوجھ کر اس مقام پر جست کی تھی جہاں سے گولی چلی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کا ایک پنجہ اندر کو دھنس آیا۔ میں اور نیچے دبک گیا۔ سردی کی کپکپی کی جگہ اب خوف کی کپکپی نے لے لی، اور اس ٹھنڈک میں بھی میں پسینہ سے تر ہو گیا۔

بڑی مشکل سے میں نے حواس کو یک جا کیا مجھے یاد آیا کہ ابھی میری رائفل میں پانچ گولیاں ہیں۔ چنانچہ میں نے لکڑی کے ڈھانچہ میں رائفہ کی نالی داخل کر دی اور اندھا دھند لگاتار پانچ گولیاں تڑاتڑ چلا دیں...... نشانہ باندھنا تو الگ رہا، میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بھی موند لی تھیں......

ایک دم چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اب نہ بکری کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ درندے کی تجسس کے باوجود میں وہیں دبکا رہا۔ سوچنے کی طاقت گم ہو چکی تھی...... پھر دور سے انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں قریب آتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ گڑھے سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ انہوں نے پہلے دو چار ڈھیلے پھینکے، پھر آگے بڑھے وہ درندہ دراصل چھوٹے قد کا چیتا تھا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ چیتا لکڑی کے ڈھانچے پر مرا پڑا تھا۔ دیہاتیوں نے قریب آنے سے پہلے ڈھیلے پھینک کر اطمینان کر لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اسے ڈھانچے سے ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا۔

صبح ہونے پر دیہاتیوں نے بڑے ادب اور شکر گزاری کے احساس کے ساتھ مجھے رخصت کیا...... لیکن یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کیسے اپنے شکار کا شکار بننے سے بال بال بچا تھا۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ کھلونا دہلی سنہ نامعلوم میں پہلی بار شائع ہوئی۔ کسی مجموعے میں نہیں ہے کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

تین چور

آج سے پینتالیس برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں پنجاب کا صوبہ بہت بڑا تھا۔ اس میں پانچ دریا بہتے تھے۔ اسی لحاظ سے (پنج آب) پنجاب کہلاتا تھا۔

ان دنوں بیساکھی کا موسمی میلہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس قسم کے میلے پنجاب کے کونے کونے میں لگتے تھے۔ ایسے ہی ایک میلے میں تین دوست بھی شامل ہوئے۔ ان کے نام تھے، رتن سنگھ، کرتار سنگھ اور دھیان سنگھ ان میں سے کسی کی عمر بائیس برس سے اوپر نہیں تھی۔ وہ خوب لمبے تڑنگے بانکے ترچھے جوان تھے۔

سارا دن میلے کی رنگ رلیوں میں گزر گیا۔ دن ڈھلنے پر انھیں اس بات کا احساس ہوا کہ وہ اپنے ساتھ جتنے روپے لائے تھے، سب خرچ ہو چکے ہیں۔ اب وہ کوئی چیز گھر والوں کے لیے نہیں خرید سکتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ گھر والے پوچھیں گے کہ ہمارے لیے میلہ سے کیا لائے، تو کیا جواب دیں گے— چنانچہ انھوں نے چوری کرنے کی ٹھانی۔

وہ اپنے علاقے میں نہیں تھے، اس لیے پہچانے جانے کا بھی خوف نہیں تھا۔ میلے سے چار کوس آگے انھیں ایک گاؤں دکھائی دیا۔ پھیکی چاندنی میں مٹی اور گارے کے مکان ایک دوسرے سے یوں چپکے ہوئے تھے جیسے چوروں سے ڈر کر دبک گئے ہوں۔

گاؤں کے باہر ہی انھیں ایک مکان نظر آیا جس کی دیوار کے ساتھ کوڑے کباڑ کا اونچا سا ڈھیر لگا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے چھت پر چڑھ گئے اور پھر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے منڈیر تک پہنچ گئے جہاں سے انھوں نے نیچے صحن میں نظر ڈالی۔

صحن کے بیچ میں پاس پاس دو چار چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ایک پر جو عورت سوئی پڑی تھی وہ سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ خوش ہو گئے لیکن ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا تو دل بیٹھ گیا۔ اس پر ایک لمبا چوڑا ہٹا کٹا، کڑیل جوان لیٹا تھا جو غالباً اس عورت کا شوہر تھا۔

تینوں دوستوں کو ڈر لگا کہ کہیں عورت کا شوہر جاگ پڑا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ آخر رتن سنگھ ہمت کر کے صحن میں اتر گیا۔ دو دوست چھت پر لیٹے رہے تا کہ اگر وہ پہلوان جاگ اٹھے تو اچانک حملہ کر کے اسے زیر کر دیں۔

رتن سنگھ نے چارپائی کے نزدیک پہنچ کر بڑی پھرتی سے عورت کے زیورات اتارنے شروع کر دیے، سب زیورات تو اتر گئے، صرف ایک بالی رہ گئی جسے اتارنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ اچانک عورت نے آنکھیں موندے موندے وہ بالی اتاری اور رتن سنگھ کی طرف بڑھا دی۔ وہ حیران رہ گیا۔ عورت مسکرا کر بولی۔ ''اگر خیریت چاہتے ہو تو میرے سارے زیور لوٹا دو۔ ورنہ میں اپنے مرد کو جگا دوں گی۔

اس پر رتن سنگھ اکڑ کر بولا ''تمہارا مرد جاگ کر بھی ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔''

''تم نہیں مانتے تو جاؤ — جب تم چار کھیت پرے ببول کے پیڑ کے نزدیک پہنچ جاؤ گے تو میں اپنے مرد کو جگا دوں گی۔ اگر اس میں دم ہوگا تو وہ تم لوگوں سے زیور چھین لے گا۔''

رتن سنگھ نے عورت کی یہ شرط منظور کر لی۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے بھاگ نکلا۔ جب وہ تینوں ببول کے پیڑ کے پاس پہنچے تو انھوں نے گردن گھما کر گاؤں پر نظر ڈالی —

چھت پر انھیں وہی پہلوان سردار دکھائی دیا۔

ان کا خیال تھا کہ وہ بھاری بھرکم جوان دوڑ میں انھیں نہیں پا سکے گا۔ لیکن یہ ان کی

بیٹھا بیٹھا رائفل سے اس پر گولی چلا دوں گا۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ میرے لیے کسی پیڑ پر مچان بنایا جائے گا۔ مگر مجھے بتایا گیا ایک بے حد تجربہ کار دیہاتی نے یہ ترکیب نکالی تھی۔ میں نے سوچا چلو یہ تو پھر گڑھا ہے، جم کاربٹ تو آمنے سامنے شیر پر گولی چلا دیا کرتا تھا۔

مجھے گڑھے میں اتار کر اور اس کا منہ لکڑیوں کے ڈھانچے سے ڈھک کر سب دیہاتی رخصت ہو گئے۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ کچھ دیر بعد کھلے علاقہ کی ٹھنڈی ہوا کے باعث میں سکڑنے کانپنے لگا اور رفتہ رفتہ میرے دانت بجنے لگے۔

دور جھاڑیوں کے بے چاری بکری بھی میری طرح سکڑی ہوئی بیٹھی تھی۔ عجب صورت حال ہے!

سردی کے باوجود مجھے نیند سی آنے لگی۔ نہ جانے کب میں سو گیا— پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی گھڑی پر ڈالی تو ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ لمحہ بھر کو میں سمجھ نہیں سکا کہ میری نیند اس طرح اچاٹ ہو جانے کا سبب کیا تھا۔ پھر یکا یک مجھے احساس ہوا کہ بکری زور زور سے مَیں مَیں! کر رہی ہے۔ میں نے اپنے سر سے گڑھے کے اوپر رکھے ہوئے ڈھانچے کو ذرا اٹھا کر دیکھا تو بکری کو بے قراری سے اِدھر اُدھر اچھلتے پایا۔ کھونٹے کی وجہ سے وہ مجبور تھی۔ ورنہ بھاگ گئی ہوتی۔

میں معاملے کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بکری کے قریب مجھے کسی درندے کا سایہ دکھائی دیا۔ میں نے سوچا یہی وہ باگھ ہے۔

میں چاہتا تھا کہ بکری کی جان بھی بچ جائے اور باگھ بھی مر جائے۔ مشکل یہ تھی کہ نشانہ کیسے باندھوں، کیوں کہ وہ سایہ مسلسل حرکت کر رہا تھا۔ غالبًا وہ بکری کو مارنے ہی والا تھا۔ زیادہ انتظار نا مناسب سمجھ کر میں نے اس حرکت کرتے ہوئے سائے پر ہی گولی چلا دی۔

رائفل کے نشانے کی میری کوئی خاص مشق نہیں تھی اور پھر حرکت کرتے ہوئے

سائے پر مدھم روشنی میں ٹھیک طرح نشانہ لگانا بھی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا— بہر حال گولی چلتے ہی غراہٹ کی آواز سنائی دی، اور پھر دوسرے ہی پل وہ درندہ گڑھے کے اوپر والے ڈھانچے پر موجود تھا۔

سمجھ میں نہیں آیا کہ تیزی سے فرار ہوتے وقت اس کا پنجہ ڈھانچے پر پڑ گیا یا اس نے جان بوجھ کر اس مقام پر جست کی تھی جہاں سے گولی چلی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کا ایک پنجہ اندر کو دھنس آیا۔ میں اور نیچے دبک گیا۔ سردی کی کپکپی کی جگہ اب خوف کی کپکپی نے لے لی، اور اس ٹھنڈک میں بھی میں پسینہ سے تر ہو گیا۔

بڑی مشکل سے میں نے حواس کو یک جا کیا مجھے یاد آیا کہ ابھی میری رائفل میں پانچ گولیاں ہیں۔ چنانچہ میں نے لکڑی کے ڈھانچہ میں رائفہ کی نالی داخل کر دی اور اندھا دھند لگاتار پانچ گولیاں تڑاتڑ چلا دیں...... نشانہ باندھنا تو الگ رہا، میں نے ڈر کے مارے آنکھیں بھی موند لی تھیں......

ایک دم چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ اب نہ بکری کی آواز سنائی دے رہی تھی، نہ درندے کی تجسس کے باوجود میں وہیں دبکا رہا۔ سوچنے کی طاقت گم ہو چکی تھی...... پھر دور سے انسانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں قریب آتی گئیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ گڑھے سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ انہوں نے پہلے دو چار ڈھیلے پھینکے، پھر آگے بڑھے وہ درندہ دراصل چھوٹے قد کا چیتا تھا۔

اب مجھے پتہ چلا کہ چیتا لکڑی کے ڈھانچے پر مرا پڑا تھا۔ دیہاتیوں نے قریب آنے سے پہلے ڈھیلے پھینک کر اطمینان کر لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ اسے ڈھانچے سے ہٹا کر مجھے باہر نکالا گیا۔

صبح ہونے پر دیہاتیوں نے بڑے ادب اور شکر گزاری کے احساس کے ساتھ مجھے رخصت کیا...... لیکن یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کیسے اپنے شکار کا شکار بننے سے بال بال بچا تھا۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ کھلونا دہلی سنہ نامعلوم میں پہلی بار شائع ہوئی۔ کسی مجموعے میں نہیں ہے کلیات میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

خام خیالی تھی۔ کیوں کہ بہت جلد ہی وہ شخص ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر اب بھی انہوں نے بچنے کی ترکیب نہ سوچی تو وہ ان کے سر پر آ دھمکے گا۔

آگے پیچھے دوڑتے دوڑتے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ آگے کے دونوں نوجوان سامنے والی دو جھاڑیوں میں چھپ جائیں گے۔ سب سے پیچھے والا جوان رتن سنگھ بھاگتا چلا جائے گا۔ ان کا پیچھا کرنے والا یہی سمجھے گا کہ وہ تینوں آگے پیچھے دوڑے چلے جارہے ہیں۔ اس طرح جب وہ دو جھاڑیوں کے بیچ میں ہوکر نکلے گا تو کرتار سنگھ اور دھیان سنگھ حملہ کر کے اسے مار گرائیں گے۔

انھوں نے اسی ترکیب پر عمل کیا۔ ان کا پیچھا کرنے والا جوان دھوکے میں آ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان تینوں چوروں کی لاٹھیوں کی مار کی تاب نہ لاسکا۔ اور بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔

تینوں دوست اپنے منصوبے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن دل میں وہ خوش نہیں تھے۔ انہوں نے سوچا کہ انھوں نے اتنے اچھے جوان کو دھوکے سے مار گرایا تھا۔ انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ کہیں اس کی موت ہی نہ ہوگئی ہو۔ چنانچہ دوسرے دن ایک ایک کر کے وہ گاؤں میں جا گھسے — اس مرد کا نام درشن سنگھ تھا اور وہ اپنے مکان کے باہر دارے (چوپال) میں پڑا تھا۔ اس کی جان خطرے میں بالکل نہیں تھی۔

رتن سنگھ اور اس کے دوستوں کو بڑی شرم محسوس ہوئی۔ دن کی روشنی میں انھوں نے درشن سنگھ کو دیکھا تو ان کے دل میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ رہا کہ اگر وہ مردوں کی طرح دھوکہ دیے بغیر اپنے دشمن پر حملہ کرتے تو مار کھا جاتے۔

یہ سب باتیں سوچ کر انھوں نے سارے زیور لوٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ درشن سنگھ کے مکان کے قریب سے ہوکر گزرے اور زیوروں کی پوٹلی مکان کے صحن میں پھینک کر اپنے گاؤں کو لوٹ آئے۔

☆☆☆

یہ کہانی سالنامہ کھلونا دہلی سنہ نامعلوم میں پہلی بار شائع ہوئی۔ کسی مجموعے میں نہیں ہے کلیات میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

فہرست کتب مکمل

اردو

افسانوی مجموعے

-1	جگا	مکتبہ اردو لاہور	1944
-2	تارو پود	مکتبہ جدید لاہور	1946 (غالباً)
-3	ہندوستان ہمارا	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	1947
-4	سنہرا دیش	مکتبہ جدید لاہور	نامعلوم
-5	پہلا پتھر	مکتبہ جدید لاہور	1953
-6	بلونت سنگھ کے افسانے	مکتبہ اردو ادب	نامعلوم

ناول

-1	رات چور اور چاند	ادارہ فروغ اردو لاہور (اول)	1961
-2	کالے کوس	نیا ادارہ، لاہور	
-3	چک پیراں کا جسّا	مکتبہ شعر و ادب، لاہور	

ناولٹ

-1	ایک معمولی لڑکی	ادارہ انیس اردو، الہ آباد	مئی 1959
-2	عورت اور آبشار	اردو پاکٹ بکس، کراچی	

-3 عہد نو میں ملازمت کے تیس مہینے/ اردو پاکٹ بکس، کراچی

(سب سے پہلے ناولٹ سویرا لاہور، شمارہ 18-17 میں شائع ہوا۔ پھر اس کی تلخیص ''کتاب نما'' نے مئی 1988 میں شائع کی۔ ''آج کل'' نے بھی بلونت سنگھ نمبر میں ''کتاب

نما' کی نقل شائع کی۔ اصل کلیات میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

ہندی

افسانوی مجموعے

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے)	اونکار شرد بر پرکاش، الہ آباد	1954
2- چلمن	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1970
3- پہلا پتھر	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	1971
4- میری پریہ کہانیاں	راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی	1971
5- دیوتا کا جنم	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	1977
6- پرتی ندھی کہانیاں (نمائندہ افسانے)	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1977
7- بن باس تتھا اینہ کہانیاں	پرتیبھا پرکاشن، الہ آباد	1978
8- ایلی ایلی	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1982
9- میری تینتس کہانیاں	آتما رام اینڈ سنز، کشمیری گیٹ، دہلی	1988
10- میں ضرور روؤں گی	راجیو پرکاشن، الہ آباد،	سال اشاعت درج نہیں

ناول

1- سنجوگی نواس	ہمالہ پاکٹ بکس، الہ آباد	1961
2- عورت اور آبشار	پرگتی پرکاشن، الہ آباد	1962
3- آگ کی کلیاں	پرگتی پرکاشن، الہ آباد	1962
4- باسی پھول	راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی	1965
5- راوی پار	پرگتی پرکاشن، الہ آباد (اول)	1964
6- راوی پار	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی (دوسرا)	1966
7- راوی پار	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی (تیسرا)	1980
8- سونا آسمان	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	1967

9- دواکال گڑھ	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	1969
10- دواکال گڑھ	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی	1969
11- راکا کی منزل	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1971
12- سنہرے بالوں والی	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی	1973
13- پھر صبح ہوگی	پانڈولپی پرکاشن، نئی دہلی	1974
14- چک پیراں کا جستا	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1977
15- صاحب عالم	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1979
16- رات چور اور چاند	لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد	1974
17- کالے کوس	سرسوتی پریس، الہ آباد	1957
18- کالے کوس	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی	1967
19- کالے کوس	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1982
20- ایک معمولی لڑکی	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی	نامعلوم
21- نشی	ہند پاکٹ بکس، نئی دہلی	نامعلوم
22- ہونی انہونی	ساہتیہ بھون، الہ آباد	1979
23- موتا	آتمارام اینڈ سنز، نئی دہلی	1983
24- سیندور کی تلاش	راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی	1983
25- گلیا کے توتے	آتمارام اینڈ سنز، نئی دہلی	1988
26- قصہ چہار درویش	راج کمل پرکاشن، نئی دہلی	1986

بچوں کے لیے

1- پھول کھل اُٹھے	آتمارام اینڈ سنز، نئی دہلی	1973
2- شہر کے شکاری	شکن پال پاکٹ بکس، نئی دہلی	نامعلوم

تنقید

امریتا پرتیم کی کویتاؤں کی آلوچنا	راشٹریہ بھاشا پرچار سمیتی، واردھا	1962

اردو افسانے کی الفبائی ترتیب

آ

آبشار	آج کل مارچ 55
آبگینہ	روبی اپریل 1974
آزادقاتہ	ہندوستان ہمارا
آشیانہ	آج کل افسانہ نمبر مارچ 1954 پہلا پتھر
آنند کارج	شمع کہانی نمبر جنوری 1973

ا

اجنبی	ہندوستان ہمارا، شب خون، ستمبر 66
ارداس	شمع مارچ 1976
اس کی بیوی	تار و پود
اعتراف	پہلا پتھر
اللہ کا فضل	بیسویں صدی جنوری 1970
امانت	بیسویں صدی...........
ایڈیٹر لوگ	آج کل جنوری 1957
ایک بھیگی شام	بالو سالنامہ جنوری 1960
ایک رات	کھلونا

ایک ہی ناؤ میں	آج کل جون 1954
ایلی ایلی	شمع، دہلی، اپریل 1947

ب

بابا مہنگا سنگھ	پہلا پتھر
بابو مانک لال جی	سنہرا دیش
بات ایک رات کی	کھلونا
بادلوں کی چھاؤں تلے	شمع مارچ 1966
بازگشت	پہلا پتھر
باندھ	آج کل جون 1964
بن باس	روبی، دہلی، مئی 1972
بھول بھلیاں	ساقی اپریل 1954
بھیک	ہندوستان ہمارا
بھک منگے	ہندوستان ہمارا
بھیگی آنکھیں	بانو اکتوبر 1972
بیمار	تار و پود

پ

پاسبان	ساقی جنوری، فروری 1947
پاسٹ	ہمایوں جنوری 1946
پتھر کے دیوتا	ہندوستان ہمارا
پردیسن	جگا
پردیسی چاند	بانو سالنامہ
پنجاب کا البیلا	تار و پود ادبی دنیا جولائی 1945

پورا جوان	شمع نومبر 1968
پھانس	آج کل 15 اگست 49
پھلکاری	شمع دسمبر 1972
پھمن کور	شمع دسمبر 1970
پہلا پتھر	پہلا پتھر
پیپر ویٹ	سنہرا دیس
پیلا پھاٹک	بیسویں صدی جولائی 1963

ت ۔ ٹ

تعبیر	پہلا پتھر
تعویذ	روح ادب، سنہ نامعلوم
تکون	بیسویں صدی 1968
تلچھٹ	سنہرا دیس
تیسرا سگریٹ	نقوش جولائی 1955
تین باتیں	تار و پود
تین چور	ادبی دنیا 48 / پہلا پتھر
تین خط	شمع اپریل 1970
تین دیویاں	بانو سالنامہ
تیاگ	بیسویں صدی جولائی 1969
ٹارزن	کھلونا

ج

جزیرے	آج کل جنوری 1958
جگا	جگا/ساقی جنوری 1941

جنگل میں منگل	تار و پود
جھرجھری	ہندوستان ہمارا

چ

چار استاد	روبی جنوری، سنہ نامعلوم
چار سو برس پہلے	ساقی اپریل 1948
چالان	پگڈنڈی سالنامہ 1959
چاند اور کمند	شمع جون 1971
چکوری	سنہرا دیس/ ساقی جنوری 1946۔ نقش کراچی، سالنامہ 59
چلمن	نقوش مئی 67
چیتا	بیسویں صدی اپریل 1978

ح۔خ

حضرت چھچھوندر چھچھوندری	آج کل دسمبر 1951
حد فاصل	نیا دور کراچی، شمارہ 9/10
حسن والے 1998 میں	بیسویں صدی جنوری 1969
حوا کی پوتی کا افسانۂ محبت	جگا
خدا کی وصیت	ادبی دنیا جون 45
خوددار	ساقی جولائی 1945 / تار و پود
خوشبو دار موڑ	بلونت سنگھ کے افسانے
خلا	تار و پود

د

دانت ایک بات ایک	شمع جنوری 1973
دستک	روبی اگست 69

دل بلبل	بیسویں صدی مئی 79
دودھ بھری کلیاں	نقوش دسمبر 50
دوسرا ہنی مون	بانو سالنامہ جنوری 71
دھڑ	پرتاپ 1940
دیدار	شمع جولائی 72
دیش بھگت	جگا، ساقی نومبر 40
دیمک	تار و پود

ڈ

ڈاکو	ہندوستان ہمارا
ڈاکو باگر سنگھ	شمع مئی 75

ر۔ز

راستہ چلتی عورت	بلونت سنگھ کے بہترین افسانے، مرتبہ نارنگ گوپی چند
رخصتی	شمع اکتوبر 65
رشتہ/کرنیل سنگھ	روبی اگست 69
رقیب	سنہرا دیس
رنگ	سنہرا دیس/ ادبی دنیا نومبر 45
روشنی	ہندوستان ہمارا
زلف کی داستان	شمع جنوری 69
زن گذراں	شمع اپریل 83

س

سپنوں کا راہی	ادب لطیف
سزا	جگا۔ساقی اگست 38

سکوت	ہندوستان ہمارا
سکہ زن	ادبی دنیا جلد 25 نمبر 1
سمجھوتہ	تار و پود
سنہرا دیس	سنہرا دیس
سورما سنگھ	سنہرا دیس

ش

شرط	بیسویں صدی 68
شکار کا شکار	کھلونا
شکریہ	بیسویں صدی مارچ 79 / بلونت سنگھ کے افسانے
شہناز	ادبی دنیا جولائی 44۔ تار و پود

ص

صابن کی ٹکیہ	آج کل نومبر 59
صبح و شام آرزو	بانو سالنامہ جنوری 67

ع۔ف۔ق

عذاب	سنہرا دیس
فلمی انٹرویو	آج کل اگست 50

ک

کاکو اور اس کے پریمی	آج کل جنوری 62
کالی تیتری	نقوش افسانہ نمبر جنوری 54
کالے کوس	پہلا پتھر
کٹھن ڈگریا	سنہرا دیس/ ادب لطیف سالنامہ 47
کرنیل سنگھ	بلونت سنگھ کے افسانے/ روبی اگست 69

کسبی	تارو پود
کسک	ہندوستان ہمارا
کلی کی فریاد	پہلا پتھر/آج کل جون 52
کمپوزیشن ٹیچر	تارو پود
کومل سنگھ کی محبوبہ	شمع اکتوبر 67

گ

گرنتھی	تارو پود/ساقی جنوری 45
گلیاں	آج کل اگست 64
گمراہ	روبی مارچ 71
گن ہل پر رم جھم	بلونت سنگھ کے افسانے/ بیسویں صدی جنوری 79
گوری چلی سسرال	شمع جون 67
گھر کا راستہ	بلونت سنگھ کے افسانے/ بیسویں صدی جنوری 78

ل

لنگتی شامیں	شب خون شمارہ 23
لمحے	پہلا پتھر
لمس	سنہرا دیش/ ادب لطیف سالنامہ 46

م

ماتا ہری	جگا
مداوا	سنہرا دیش
مکھن سنگھ کا اغوا	شمع نومبر 69

منی کی موت	سنہرا دیش
موت	ہندوستان ہمارا
مہمان	تار و پود/ ادبی دنیا جلد 24 نمبر 12

ن

ناگ پھنی	شمع جنوری 70
نہال چند	پہلا پتھر/ ادبی دنیا جلد 24 نمبر 12
نیتا	جگا/ ساقی جولائی 41

و

وبلے 38	پہلا پتھر

ہ

ہمارا مکان	سنہرا دیش
ہندوستان ہمارا	ہندوستان ہمارا
ھوالشافی	آج کل اگست 53

ہندی افسانے کی الفبائی ترتیب

آ

آگے کے دو دانت	33 کہانیاں
آنند کارج	

ا

اس کی پتنی	چلمن
ایک بات	ایلی ایلی
اُپر یچت	پہلا پتھر
اندھیرا اجالا	میری پریہ کہانیاں
ایک ہی ناؤ پر	33 کہانیاں
اڑان	33 کہانیاں
ارداس	33 کہانیاں
البیلے	پنجاب کی کہانیاں
اس رات کی بات	پراگ، مارچ 76

ب

بابو مانک لعل جی	چلمن

بابامہنگا سنگھ	پہلا پتھر
بادام رنگیں	
باندھ	دیوتا کا جنم
بہو	چلمن
بنواس	میری پریہ کہانیاں
بھیگی آنکھیں	33 کہانیاں
بھیگی پلکیں	(نئی کہانی)
بدائی	بنواس

پ

پرتی دھونی	چلمن
پھلکاری	33 کہانیاں
پہلا پتھر	پہلا پتھر
پورا جوان	دیوتا کا جنم
پیلا پھاٹک	دیوتا کا جنم
پیلاں	ایلی ایلی
پیپر ویٹ	پہلا پتھر
پٹھان	بنواس
پرتیچے	33 کہانیاں
پھمن کور	33 کہانیاں

ت۔ٹ

تاحیات	(نئی کہانی)
تری کون	دیوتا کا جنم

تین پتر	ایلی ایلی
ترچی	ایلی ایلی
تنتر	ایلی ایلی
تین باتیں	پہلا پتھر
تعویذ	پہلا پتھر
تین دیویاں	میری پریہ کہانیاں
تیسرا سگریٹ	میری پریہ کہانیاں
تیج	33 کہانیاں
تتلیاں	بنواس
تلچھٹ	(نئی کہانی)
ٹکسال والا	بنواس

ج

جنازہ	دیوتا کا جنم
جھرنا	بنواس
جیجا جی	
جگا	پرتی ندھی کہانیاں

چ۔ح

چار استاد	
چاند اور کمند	دیوتا کا جنم
چالیس سال بعد	33 کہانیاں
چکوری	پہلا پتھر
چلمن	چلمن

چندرلوک	ایلی ایلی
چور	پنجاب کی کہانیاں
چیتا	ایلی ایلی
حسن والے	ایلی ایلی

د۔ڈ

دیوتا کا جنم	دیوتا کا جنم
دوسرا ہنی مون	دیوتا کا جنم
دیمک	میری پریہ کہانیاں
دو بہنیں	بنواس
دنڈ	33 کہانیاں
دوسری بھول	33 کہانیاں
دیدار	33 کہانیاں
دل ناداں	33 کہانیاں
ڈاکٹر پاپڑ سنگھ	(نئی کہانی)
ڈاکو باگڑ سنگھ	بنواس

ر۔ز

رکھوالا	دیوتا کا جنم
رنگ	میری پریہ کہانیاں
رشتہ	بنواس
راہی	بنواس
رقیب	33 کہانیاں

زلف کی داستان	دیوتا کا جنم
زندگی کا خوبصورت موڑ	میری پریہ کہانیاں
زن گذراں	جاگرتی، جون 84

س۔ش

سوابھیمان	چلمن
ست رنگا کبوتر	ایلی ایلی
سورما سنگھ	پہلا پتھر
سزا	پرتی ندھی کہانیاں
سنہرا دیس	33 کہانیاں
سمجھوتہ	ہنس، مئی 88
شونیہ	چلمن
شرط	دیوتا کا جنم
شکریہ	ایلی ایلی
شہناز	پرتی ندھی کہانیاں
شام کے دھندلکے میں	33 کہانیاں

ق۔ک

قبرستان کی حسینہ	بنواس
کسک	چلمن
کنیہ دان	ایلی ایلی
کچھ چھن	پہلا پتھر
کلی کی فریاد	میری پریہ کہانیاں
کالی تیتری	میری پریہ کہانیاں

کیا کریں دونوں	بنواس
کومل سنگھ کی پریمکا	33 کہانیاں

گ

گمراہ	دیوتا کا جنم
گلیاں	دیوتا کا جنم
گلکاری	دیوتا کا جنم
گرینڈ ہوٹل	ایلی ایلی
گھر کا راستہ	ایلی ایلی
گن بل پر رم جھم	ایلی ایلی
گرنتھی	ایلی ایلی
گوری چلی سسرال	بنواس
گھات	دیوتا کا جنم

ل۔م

لاٹری زندہ باد	بنواس
مہمان	چلمن
منی کی موت	چلمن
میں ضرور روؤں گی	پہلا پتھر
مکھن سنگھ کا اپرہن	33 کہانیاں

ن۔و

نہال چند	پہلا پتھر
ننھا پھپھکو	منوہر کہانیاں
ویہلے 38	چلمن
ویشیا	پہلا پتھر

☆☆☆

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لئے خصوصی رعایت، تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

آزادی کے بعد
اردو اسٹیج ڈرامے (انتخاب)

مرتب : زبیر رضوی

صفحات : 757

قیمت : -/396 روپئے

یک بابی اردو ڈرامے (انتخاب)

مرتب : زبیر رضوی

صفحات : 494

قیمت : -/325 روپئے

اردو ڈراموں کا انتخاب

مرتب : محمد حسن

صفحات : 600

قیمت : -/156 روپئے

جتنے پاس اتنے دور

مصنف : دھیریندر سنگھ جفا

صفحات : 270

قیمت : -/145 روپئے

کلّیات سعادت حسن منٹو (جلد اوّل)

مرتب : شمس الحق عثمانی

صفحات : 560

قیمت : -/285 روپئے

کلّیات سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

مرتب : شمس الحق عثمانی

صفحات : 575

قیمت : -/274 روپئے

ISBN: 978-81-7587-280-6

कौमी काउंसिल बराए फ़रोग़े–उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066